

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے ایک سہولت مند کاغذی رسالہ

رضا ایجنسی

JULY
2017

ماڈل: فرینہ اعجاز
میک اپ: روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافی: موسیٰ رضا



چیف ایڈیٹر

مسالہ محمود

ایڈیٹرز

سعدی محمود جعفری، بلال جعفری

ناشنہ امریکہ، کراڑ جعفری

E-Mail: brazeahri@pol.com

ناشنہ UAE، مجیر علی جعفری

E-Mail: saqrabhi@omirates.net.ae

ناشنہ لندن، شہزاد آصف خان

آرٹسٹ: جنید انصار

رداء الجحش

خداوند ملت کا ہونہ

رداء الجحش

پریس ڈسٹریبیوٹر

پریس ڈسٹریبیوٹر

پریس ڈسٹریبیوٹر



مستقل سلسلے

۲۲۲	ثریا اقبال	۷	کچن	صالیہ محمود	روائے جنت
۲۲۵	شہلا مشائق	۲۰۲	سنگھار	صدف سعد	رواکی ڈائری
۲۰۴	نورین ملک	۲۱۳	اشعار	شہلا مشائق	ذرا پھر سے کہنا
۲۱۸	ادارہ	۲۰۹	دوستوں کے نام پیغام	نورین ملک	خوشبو
		۲۰۶		نورین ملک	اس ماہ میں

سلسلے وار ناول

۱۶۴	زندگی، پھول، محبت، خوشبو شازیہ مصطفیٰ
۱۰	عشق کی داستان جدا ریحانہ آفتاب
	ستارے ایقان علی

افسانے

مکمل ناول

۸۷	دو دلوں کی عید	جہانہ آفتاب
۱۰۰	برف ہے	مصباح مسکان
۱۱۰	۳۲ کرچیاں	شیریں تبسم
۱۱۸	۱۳۲ دل کے کھلے گلاب	آسیہ مظہر چوہدری
	صبح عید	سباس گل

ناولٹ

۷۰	میری مسکراہٹ ہو تم	سعدیہ عابد
۱۵۰	میرے بخت کا روشن	انیتا اختر

جولائی ۲۰۱۷ء

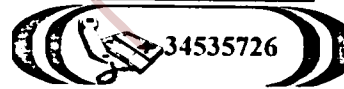
جلد نمبر ۲۰ شمارہ نمبر ۷

قیمت ۶۰ روپے

www.facebook.com/rida.digest

زیر نگرانی ہندوستان کی

720 روپے



پبلشر وائیٹر صالہ محمود نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔
مقام اشاعت: ۱۱۲۹ ڈی بلاک ۲۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی، کراچی

انتباہ:-

ماہنامہ "ردا" انجمن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی فی وی جیکل یا ڈراما کی تشکیل اور سلسلے وار کسی بھی ناول کی اشاعت پر ادارہ چوری کی ایف آئی آر درج کرلوے گا اس لئے پبلشر سے اجازت لینا ضروری ہے ادارہ "ردا" پبلیکیشن۔





خوشیوں اور محبتوں بھر امت مسلمہ کا تہوار عید الفطر خوشیوں و محبتوں اور چاہتوں کا پیغام پورے ماہ دین حق پر چلنے والوں کے لیے خوشی کا دن رخصائے الہی کی طرف سے رحمتوں کا ایک حسین تحفہ۔

زندگی یونہی رحمتوں اور برکتوں میں ہماری بسر ہوتی رہے۔ سب خوش اور آباد رہیں اور تمام راسخرو وقار مین خدا کرے پھولوں کی طرح سدا بہار رہیں۔ ماہ رمضان گزرتو گیا مگر ابھی ان پر لطف لمحوں کا تاثر باقی ہے۔ یوں تو موسم زرت بدل گئی ہے، جگہ جگہ بادلوں کی ٹولیاں رقص کرتی ہوئی ہوائیں کراچی میں نہ سکی دور دراز شہروں میں جمومتے ہوئے درخت حسین نظارے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کراچی کے اس صحرا میں بھی ابر رحمت برسے گا اللہ خبر کرے ہمارے ندی نالوں کی جو طغیانی بڑھی تو شہر کو لے ڈوبے گی۔ حکمران! بانسری بجا رہے ہوں گے۔ خواب غفلت سے جب چونکیں گے تو شہر ڈوب چکا ہوگا۔ کراچی اور صاحب اختیاران کے دروازے پر بحر کی کا ذحول پیٹ رہے ہوں گے اور حکمران خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوں گے۔ سو آپ جاگتے رہیے گا۔ اتنی بے خبری شہر کو لے نڈو بے۔

بکلی پانی گیس نہیں.....! خلق خدا چیخ رہی ہے مگر کان نہیں.....! غلامتوں کے ڈھیر لگ چکے ہیں مگر آنکھ بے بہرہ.....! بصیرت سے محروم حکومت جیسا کیوں پر چلنے والی حکومت ہمیشہ بے بسی کا شکار ہوتی ہے۔ خزانوں کے انبار تلے غربت سسک رہی ہے۔ گاؤں، گوشوں میں عید کا تصور کیسا دہاں تو ہر دن بھوک اور افلاس کے ڈھیرے ہیں۔ بستی بستی، قریہ قریہ ہر سوا انتشار کا عالم! کیا ایسے میں عید منائے کوئی۔ سادوں رت کی بہار دیکھتے آنکھ نہ ہاتھوں کی چوڑیاں، ہر دکھ پر آنکھ روئے چھم چھم، جب بادل برسیں کبھی منڈیروں پر اور بیتے دریالے جائیں انسانوں کو اپنی آغوش میں۔ ہم بہت روئے جب یہ منظر یاد آئے۔ کیسی عید، کیسا سکھ، ابر باران برساتو اتنا کہ دھل جائیں۔ سارے دکھ اور بہہ جائیں اقتدار کے بھوکے لوگ اور قریہ قریہ، بستی بستی، حق کا بول بالا ہو، یارب! بس ایک دن تو اتر کر آدیکھ زمین پر ان، بھیڑیا نما انسانوں کو جن لوگوں نے لوٹ لیا ہے میری بستی کو۔

عید نمبر آپ کو کیسا لگا، سند یہ ضرور لکھیے۔ نئے لکھنے والے ہم سے رابطہ رکھیں۔ ہم انہیں ردا گائیڈ کارڈز میں گائیڈ کرتے ہیں کہ افسانہ، ناولٹ کیسے لکھتے ہیں، جون کی چٹپٹائی ہوئی دھوپ میں عید نمبر 2 کی تیاری کس مشکل سے کی گئی ہوگی۔ اس کا تصور صرف وہی کر سکتے ہیں جنہوں نے اسے ترتیب دیا ہوگا۔

آپی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم کے ساتھ وابستگی رکھنے والے سے کہا جائے گا کہ تم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے جنت کے درجات پر چڑھتے جاؤ اور قرآن کریم کی تلاوت آہستہ آہستہ کرنا جیسا کہ تم دنیا میں آہستہ آہستہ کرتے تھے۔ تمہارا مقام وہ ہے جہاں تم اپنی آخری آیت کی تلاوت کرو گے۔“

(ترمذی، ابوداؤد، عن عبد اللہ بن عمرو)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی کے دل میں قرآن مجید سے کچھ حصہ نہیں ہے۔ وہ بے آباد گھر کی طرح ہے۔“

(ترمذی، عن ابن عباس)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابی بن کعب سے کہا: ”تم نماز میں کیا تلاوت کرتے ہو؟“ تو انہوں نے سورۃ فاتحہ کی تلاوت فرمائی (اس پر) رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میری جان سے تورات، انجیل، زبور اور قرآن مجید میں اس غیبی کوئی اور سورت نازل نہیں ہوئی ہے بلاشبہ اس سورت کی 7 آیت ہیں جس کی بار بار تلاوت ہوئی ہے اور یہ قرآن عظیم ہے جو مجھے عطا کیا گیا ہے۔“ (ترمذی، عن ابی ہریرہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرو (اس کے بعد) اس کی تلاوت کرتے رہو۔ یاد رکھو جب کوئی آدمی اس کی تعلیم حاصل کرتا ہے پھر تلاوت کرتا ہے اور اس کو نماز

(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، عن ابی ہریرہ)
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے سے دو ہزار سال پہلے ایک کتاب تحریر کی اس میں سے سورۃ بقرہ کی آخری دو آیتیں مجھ پر نازل فرمائیں جب کسی گھر میں یہ دو آیتیں رات کو تلاوت کی جائیں گی تو شیطان اس گھر کے قریب بھی نہیں آئے گا۔“

(ترمذی، عن نعمان بن بشیر)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے (روزانہ) سورۃ کہف (سورہ نمبر 18) کی شروع کی تین آیات کی تلاوت کی وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔“ (ترمذی، عن ابی الدرداء)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قرآن کریم میں ایک ایسی سورت ہے جس کی 30 آیات ہیں وہ اس آدمی کے حق میں سفارش کرے گی (جو اس کی تلاوت کرتا ہو) یہاں تک کہ اس کو معاف کر دیا جائے گا۔ وہ سورۃ ملک (سورہ نمبر 67) ہے۔“ (ابو داؤد، عن ابی ہریرہ)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص نے صبح کے وقت تین بار اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھ کر سورہ شحریٰ آخری تین آیات تلاوت کیں تو اللہ رب العزت اس کے لیے ستر ہزار فرشتے مقرر فرماتے ہیں جو شام تک اس کے لیے استغفار کرتے رہتے ہیں اگر وہ اسی دن فوت ہوا تو اسے شہداء کی صف میں شامل کیا جائے گا اور جس نے شام کے وقت یہ کلمات پڑھے تو اسے بھی یہی اجر ملے گا۔“

(ترمذی، دارمی، ابن معقل بن یسار)
ایک صحابی سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحْذِیْ تِلَاوَت کر رہے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا اور فرمایا: ”(تم پر) واجب ہوگئی۔“ میں نے پوچھا: ”کیا واجب ہوگئی؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جنت واجب ہوگئی۔“

(ترمذی، نسائی، ابن ہریرہ)
میں ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنفہ اور ابواء مقام کے درمیان جا رہا تھا ناگہاں ہمیں سخت آندھی نے گھیر لیا اور اندھیرا ہو گیا۔ اس وجہ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ الفلق اور سورہ الناس پڑھنا شروع کر دیا اور فرمایا: ”اے عقبہ تم بھی ان دونوں سورتوں کے ساتھ پناہ طلب کرو۔ کسی پناہ طلب کرنے والے کے ان دونوں سورتوں جیسی اور کوئی چیز نہیں۔“

(ابوداؤد، ابن عقبہ بن عامر)
ہم بارش اور سخت آندھی والی رات میں باہر نکل کر ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تلاش کر رہے تھے آخر کار ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے جا ملے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم پڑھو۔“ میں نے عرض کیا: ”کیا پڑھوں؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحْذِیْ تِلَاوَت (سورتیں) صبح و شام 3 بار پڑھو۔ تمہیں ہر چیز سے

کفایت کریں گی۔“

(ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن عبد اللہ بن حبیب)
رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جس آدمی نے کتاب اللہ سے ایک حرف کی تلاوت کی اس کو اس کے بدلے میں ایک نیکی ملے گی اور ایک نیکی کا ثواب 10 گنا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا الم ایک حرف سے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم بھی ایک حرف ہے۔“

(ترمذی، دارمی، ابن مسعود)
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی نے حاضر ہو کر عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے تعلیم دیجیے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جن سورتوں کے شروع میں الہم ہے ان میں سے 3 سورتیں تلاوت کرو۔“ اس نے عرض کیا: ”میری عمر زیادہ ہو چکی ہے اور میرے دل پر بھول کا غلبہ ہے اور میری زبان سخت ہو چکی ہے۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”پھر جن سورتوں کے شروع میں حم ہے ان میں سے 3 سورتوں کی تلاوت کرو۔“ اس پر اس آدمی نے پھر وہی بات کہی اور اس آدمی نے عرض کیا: ”اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی جامع سورت کی تعلیم دیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو سورہ اِذَا زُلْزِلَتْ کی تلاوت کا حکم دیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سورت کو ختم کیا (یہ سن کر) اس آدمی نے عرض کیا: ”اس ذات کی قسم جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق و صداقت کے ساتھ معبود فرمایا ہے۔ میں اس میں کچھ زیادہ نہیں کروں گا۔“ اس کے بعد وہ آدمی چلا گیا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ فرمایا: ”یہ آدمی کامیاب ہے۔“

(احمد، ابوداؤد، ابن عبد اللہ بن عمر)

☆.....

عشق کی دریاہ میں لاپتہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ: آنسو غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ چار بہنوں میں اس کا نمبر دوسرا تھا۔ وہ سب میں حسین تھی۔ خود سے پہلے اپنے والدین اور بہنوں کی خوشی کا سوچتی تھی۔ کم عمری میں ہی اس نے گھر کی جگہ سی دور کرنے کے لیے

محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ اپنے لیے خریدی چیزیں بہنوں کے پسند آ جانے پر انہیں دے دیتی تھی۔ وہ اپنی روتی بکتی زندگی سے عاجز تھی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ کی امیر کبیر بندے سے شادی کر کے اپنے گھر والوں کی زندگی سنوارے گی۔ دونوں چھوٹی بہنیں اس پر جان چھڑکتی تھیں۔ اس سے بڑی درخشاں کی آنسو سے محبت رہتی تھی۔ وہ طنز کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ قدوس صاحب جو آنسو کے والد ہیں اولاد دینے نہ ہونے پر اپنی بیوی باجرہ کو ساری زندگی باتیں سناتے رہے۔ انہیں آنسو کا کافی جانا بے بند نہیں تھا۔ باجرہ، آنسو کے بارے میں جو اس نے گھر میں ہی کھولا ہوا تھا اور محلے کی عورتیں بڑے پارلر میں پیسے بچانے کی خاطر اس کے پاس آتی تھیں کہ وہ کم پیسوں میں بہترین کام کرتی تھی اور کو چنگ سے ملنے والی آمدنی کے گن کا تھ تو قدوس صاحب کی انا بلبل جاتی تھی۔ آنسو بھی ان کی جلی کٹی کی زد میں رہتی تھی۔ عرشاں کی جدی طبیعتی نہیں ہے۔ Perfection اس کی پہچان ہے۔ ذرا بھی نقص اسے برداشت نہیں خواہ وہ چیز اسے کتنی عزیز ہو۔ وہ اپنے کمرے سے ملحق کمرے کی

فصل نمبر 6



زینت بنادیتا تھا مگر خود سے جدا کرنا گوارا نہیں تھا۔ عریشان ولی وجاہت کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ وہ بے حد ہمدرد دل رکھتا تھا۔ ماہ پارہ بے حد چمک چڑھی اور ماڈرن خاتون ہیں۔ عریشان ولی کی والدہ محترمہ، فرہاد صاحب، ماہ پارہ کے مزاج کے بالکل برعکس بہت اچھے انسان ہیں۔ ماہ پارہ اور فرہاد صاحب کی تین اولادیں ہیں۔ اسارا بڑی بیٹی ہے جو اپنے شوہر راحیل اور تین بچوں کے ساتھ شاہد میں رہتی ہے۔ راحیل لالچی انسان ہے۔ اسارا، ماہ پارہ کی طرح تنگ مزاج ہے۔ اسارا سے چھوٹا شاہد میر ہے۔ جتنی، شاہد میر کی بیوی ہے جسے کم صورتی کے باعث اکثر ماہ پارہ جلی کئی سنائی تھیں۔ جتنی کی شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے وہ ابھی تک بے اولاد کی شکار تھی۔ جتنی سمجھے مزاج کی لڑکی ہے۔ ماہ پارہ کی بیٹ فرینڈ واصفہ کی دو اولاد ہے۔ کاشان اور زویا۔ کاشان بھنورا واصفہ انسان ہے۔ فلرٹ اس کا سن پسند مشغلہ ہے۔ زویا تک چڑھی لڑکی ہے۔ وہ عریشان ولی کو پسند کرتی ہے۔ اس کی نظر کرم حاصل کرنے کے جن کرئی رہتی ہے۔ تینوں بچپن سے دوست ہیں۔ آنور نے زویا سے بڑے چٹن کر کے دوستی کی تھی۔ کاشان کی صورت میں محروم زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ زویا نے کاشان کو پیچھ کر لیا تھا کہ وہ آنور سے فلرٹ کر کے دکھائے تو وہ استاد مان لے گئی۔ کاشان نے پیچھ قبول کر لیا تھا جلد ہی اس نے آنور سے دوستی کر لی۔ اسے سوٹ اور سیل فون گفٹ کیا۔ جدید اسٹارٹ فون استعمال کرنا آنور کو مشکل لگ رہا تھا۔ عریشان ولی، کاشان کو اس کی حرکتوں پر بے نقط کی ستارہ ہوتا تھا۔ اسے ان لڑکیوں پر غصہ آتا تھا جو کاشان کا شکار بنتی تھیں۔ وہ اپنی محبت اور جذبے اس کے لیے سنبھالے بیٹھا تھا جو صرف اس کی ہوتی۔ ولید عریشان ولی کا بیٹ فرینڈ ہے۔ (اب آپ آگے پڑھیں)

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی۔ سونی چھت پر تار سے کپڑے اتار رہی تھی۔ آنور منڈیر سے لگی سیل فون چیک کر رہی تھی۔ کاشان کا دیا ہوا سیل فون وہ چھینک دینا چاہتی تھی مگر ابھی اسے اس کی بہت ضرورت تھی وہ جذبانی ہو کر اپنا مزید نقصان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہاں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ پیسے آتے ہی وہ کوئی سستا سیل فون لے کر اس سیل کو چھینک دے گی۔ سونی نے اس کے سنجیدہ انداز کو بغور دیکھا تھا۔

”آئی کی باتوں سے آپ سیٹ ہو گئی ہو؟“
”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔ کئی دنوں سے اس کا یہ ہی انداز تھا۔ وہ بہت کم بول رہی تھی۔
”کسی کو کال کرنی ہے؟“

”ہاں SMS ڈھونڈ رہی ہوں۔ جاب کی وینٹی کا ایڈ تھا، اسی میں کانیکٹ نمبر تھا۔ مل نہیں رہا۔ ڈیلیٹ نہ ہو گیا ہو۔“ اس نے پریشانی سے مصروف انداز میں کہا۔

”تم جاب کرو گی؟“ سونی کو حیرانی ہوئی۔
”ہاں!“ اس کا لہجہ ساٹ تھا۔ وہ خود فریبی کے دور سے نکل آئی تھی۔ کسی کو مہرہ بنانے کا خیال ترک کر چکی تھی۔ اب اسے خود اپنی فیتنی کے لیے کچھ کرنا تھا اور آج کل وہ اسی سلسلے میں جاب ڈھونڈ رہی تھی۔

”اور کالج کا کیا ہو گا؟“ سونی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔
”چھپو دے دوں گی۔ ویسے بھی چند ماہ ہیں ایگزام میں۔ شکر مل گیا۔“ اس نے ٹیکسٹ ملنے پر سکون کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

”السلام علیکم!“ عریشان انتر ہوا تو ماہ پارہ صوفے پر براجمان تھیں۔ ٹائی کی ٹاٹ ڈھیلی کرتے وہ ان کے مقابل بیٹھ گیا۔

”والسلام! دیر ہو گئی تمہیں؟“ ماہ پارہ نے معمول سے لیٹ ہونے پر دریافت کیا۔
”ولید کے ساتھ پارٹرشپ کی ہے آفس اسٹیلش ہو رہا ہے۔ میں نے اسے فری ہینڈ دیا ہے مگر وہ ہر معاملے میں گھسیٹ رہا ہے۔ وہیں سے آرہا ہوں۔“ اس نے تفصیل بتا کر ان کا تردد دور کیا۔
”اتنا کام مت کرو، تھک جاؤ گے۔“ ماہ پارہ فکر مندی سے اونچے لمبے بیٹے کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ماں کی فکر مندی پر مسکرا دیا۔

”میں نے صرف انویسٹ کی ہے، ولید ہی بن کرے گا بزنس کو۔“ اس نے کپٹی دباتے ہوئے کہا۔
”اسارا، راحیل کے ساتھ چلی گئی۔ تمہارے ڈیڈ بھی پھر سے فور پر نکل گئے۔“ ماہ پارہ کو بیٹی کی فکر ہو رہی تھی بھلے راحیل معافی مانگ کر ساتھ لے گیا تھا مگر وہ اس کی طرف سے فکر مند تھیں۔
”ڈیڈ نے راحیل بھائی کے بزنس کو سپورٹ کرنے کے لیے کچھ کیا؟“ وہ جاننا چاہ رہا تھا اس ضمن میں فرہاد صاحب سے اس کی کوئی بات نہیں ہو پائی تھی۔

”ہاں بلیک چیک دیا ہے۔“ ماہ پارہ نے اس کے علم میں اضافہ کیا۔ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔
”مجھے گھر میں بچوں کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔ جتنی سے تو توقع فضول ہے۔ تم کب کر رہے ہو شادی؟“ واصفہ بھی کہہ رہی تھی زویا۔

”Not now mom۔“ ماہ پارہ کی بات جاری تھی جب وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
”اور واصفہ آئی والا قصہ دو بارہ مت دہرائیں۔ میں زویا کو پہلے ہی کلیئر کر چکا ہوں۔ وہ میرے لائف پارٹنر کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔ تھک گیا ہوں۔ آرام کروں گا۔“
عریشان ولی جیکٹ بازو پر ڈال کر واک آؤٹ کر گیا تھا۔
”شادی تو زویا سے ہی ہو گی تمہاری۔“ ماہ پارہ بڑبڑا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

ولید انٹرویو لے رہا تھا۔ اب تک جتنی لڑکیاں آئی تھیں انہیں ولید کی زیرک نگاہ نے ریجیکٹ کر دیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا آج کوئی سلیکشن نہیں ہو پائے گی لیکن آنور جب انٹرویو کے لیے آئی تو اس کا سراپا اور نجی تلی گفتگو ولید کو پہلی ہی نظر میں قائل کر گئی۔ گو کہ اس کے پاس کوئی تجربہ نہیں تھا مگر ولید کو کام کرنے والی لڑکیوں کی پہچان تھی۔

”اوکے مس آنور! آپ کو تھوڑی دیر میں اپائنٹ لیٹر مل جائے گا۔ آپ نکل سے جوائن کر لیں۔“ ولید نے فیصلہ کر لیا تھا۔

”تھینک یو سر!“ آنور کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ دو تین جگہوں پر پہلے ہی انٹرویو دیتی آئی تھی۔ جہاں کچھ امید نہیں بندھی تھی۔ اس کی ہمت ٹوٹ رہی تھی وہ مزید انٹرویو دیتا نہیں چاہ رہی تھی مگر جانے کیا سائی کہ آج کا آخری انٹرویو سمجھ کر بھگتا نے چلی آئی اور شو مئی قسمت کہ سلیکٹ بھی ہو گئی۔

”شازیہ آپ اندر آئیں۔“ ولید نے انٹرکام اٹھاتے ہوئے دوسری طرف کسی کو پیغام دیا تھا۔
”جواب کے ساتھ آپ کی اسٹڈی ڈسٹرب نہیں ہو گی؟ گریجویشن کالاسٹ ایئر ہے۔“ ولید نے یوں ہی برسبیل تذکرہ کیا۔

”میں منہج کرلوں گی سر! مجھے جاب کی سخت ضرورت ہے۔“ مبادا نوکری نہ چلی جائے آنسو نے جلدی سے کہا۔

”ہمارے آفس کا ماحول دیگر آفسز سے بہت مختلف لگے گا۔ پک اینڈ ڈراپ بھی ملے گی۔“ ولید دیگر سہولیات کا بتانے لگا۔

”بہت شکریہ سر۔“ آنسو نے خود کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کیا۔ اسے اتنی جلدی اتنی اچھی نوکری ملنے کی امید نہیں تھی۔ جتنی سگری وہ آفر کر رہے تھے اتنی تو اس کی اور قدوس صاحب کی محنت کا معاوضہ ملا کر بھی نہیں بنتا تھا۔

”میس سر!“ سلجے مزاج کی ایک لڑکی دستک دے کر داخل ہوئی۔ سلیٹے کی ڈریسنگ اور چہرے پر ملاحظہ لیے اسے وہ لڑکی قدرے بھلی لگی۔

”شازی! یہ آنسو ہیں، آپ کے ساتھ کام کریں گی۔ انہیں کمپیوٹر کی زیادہ Information نہیں ہے۔“ شازی نے آنسو کو دیکھا اور اشارہ کر کے شازی کو اس Task سمجھایا۔

”اوکے سر۔“ شازی نے خیر مقدمی مسکراہٹ آنسو کی طرف اٹھائی اور مودب ہو کر ولید کو مطمئن کیا۔

”اوکے مس آنسو! آپ مس شازی کے ساتھ ٹھوڑا ٹائم اسپینڈ کریں تاکہ کل آپ کو سمجھن نہ ہو۔“ ولید نے پروفیشنل انداز میں کہا۔

”اوکے سر، جینک یو۔“ آنسو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”ویکم! میں آپ کا اپائنٹ لیٹر ٹاپ کروا تا ہوں۔“ اسے شازی کے ساتھ جانے کا اشارہ کرتے ولید نے خوش دلی سے کہا تھا۔ وہ شازی کے ساتھ روم سے نکل گئی تھی۔ شازی اسے کافی دیر کام سمجھاتی رہی تھی۔

دوستانہ انداز میں کام سمجھتے اسے سہل گلنے لگا تھا۔

☆.....☆

عرشان ولی فائل اسٹڈی کرتے انگلیوں میں دبا قلم برسوج انداز میں لیوں پر مار رہا تھا۔ نظریں وقفے وقفے سے لیپ ٹاپ پر بھی ڈال رہا تھا۔ غالباً فائل سے متعلق انفارمیشن ٹپا کر رہا تھا۔ زویا اور کاشان اسی دم انٹر ہوئے تھے۔

”کہاں ہوتے ہو یا ر! نظر نہیں آرہے۔“ کاشان آتے ہی شروع ہو گیا۔

”قاتل اعظم کے قتل پر عمل کرتا ہوں۔ کام کام اور کام۔ تمہاری طرح فضول ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔“ اس نے مسکراتے ہوئے انہیں خوش آمدید کیا۔

”اور لاؤ یہاں جوتے کھلانے۔“ کاشان نے بے ساختہ جینکھی نظروں سے زویا کو دیکھا۔

”کچھ لوگ تم کو گ؟“ اس نے آداب میزبانی نبھانا چاہی۔

”کچھ کھانے کو منگوا لو۔ چائیز، تھائی۔“ کاشان نے ازلی لا پرواہی سے کہا۔

”تم لوگ ہر وقت کیا بھوکے ہی میرے پاس آتے ہو۔“ عرشان ولی اس کے فرمائشی پروگرام پر چھیڑنے لگا۔

”دیکھو!“ ناک پھلا کر کاشان نے ایک بار پھر زویا کو دیکھتے جیسے عرشان ولی کے رویے کی شکایت لگائی۔

عرشان اس کے پچکانداز پر ہنس دیا۔

”بی جمالو والی خصلت میں کب سے جتا ہو گئے۔“

زویا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل لینے کی حد تک وجہہ لگ رہا تھا۔ ایکائی بلو شرٹ پر بلیو ٹائی جھول رہی تھی۔ کف کہنیوں سے نیچے تک فولڈ تھے۔ بائیں مضبوط کلائی میں Seiko کی

بلیک گھڑی کلائی کی مضبوطی کو اجاگر کر رہی تھی۔ انھی گھڑی ناک، روشن پیشانی اور لائٹ براؤن آنکھوں میں شرارتی مسکان سما کے وہ کاشان کو چھیڑ رہا تھا۔ لائٹ براؤن سلکی گھٹنے بال کبھی پیشانی پر آ جاتے تھے جنہیں

وہ جب بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر اوپر اٹھاتا تو زویا کا دل جیسے دھڑکنابند ہو جاتا۔ وہ اس ساحر کے سحر میں عرصے سے جتا جی مگر اس کے رنجیکٹ کرنے کے بعد بھی وہ اس سے دستبردار نہیں ہو پارہی تھی۔ تب ہی تو خود اس نے ملنے بات کرنے کے جن کرنے لگتی تھی۔ حالانکہ وہ کال بھی کم ہی Pick کرنے لگا تھا۔

”تم کیوں چپ ہو؟“ عرشان ولی کو زویا کی گہری نظریں متواتر محسوس ہوئیں تو پوچھ بیٹھا۔ وہ کسی حد تک

اب اس سے بات کرنے سے احتراز کرنے لگا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا زویا اس کی طرف سے کسی خوش گمانی میں رہے۔

”من رہی ہوں تم دونوں کو۔“ وہ اس کی ایک نظر پر کھل کے مسکرائی۔

”جی بھر کے دیکھ لو مجھے۔“ کاشان نے پھر محل نشانی کی۔

”کیوں مرنے والے ہو۔“ عرشان ولی نے بے ساختہ کہا۔

”انگلیں جارہا ہوں ڈیڈ کے پاس، سال بھر کے لیے۔“ کاشان نے اطلاع دی۔

”اوہ.....! اور وہ تمہاری اسائنمنٹس؟“ اوکو لبا کھینچے اس نے پھر شرارتا کہا۔

”ستاروں سے آگے جہاں ابھی اور بھی ہیں۔“ بے باکی سے ایک آنکھ بند کرتے اس نے اپنے عزائم سے آگاہ کیا۔

”کب سدر ہو گے۔“ نفی میں سر ہلاتے عرشان ولی مسکرایا۔

”کتے کے دم کی مثال تو تم نے ہی ہی ہوگی۔“ کاشان بھی سو ڈھیوں کا ایک ڈھیٹ تھا۔ عرشان ولی کا

قبقبہ بے ساختہ تھا۔ اسی اثناء میں کاشان کا سیل فون بجنے لگا۔

”لگ جاؤ اپنے کام میں۔“ اس نے چوٹ کی۔ کاشان سیل فون کان سے لگا کر روم سے ملحق اوپن ایریا میں چلا گیا تاکہ سکون سے بات کر سکے۔

”چائیز یا تھائی فوڈ میں کچھ فیج دیں۔“ انٹر کام پر ہدایت دے کر اس نے ایک نظر پھر لیپ ٹاپ پر ڈالی۔ روم میں اب صرف وہ دونوں رہ گئے تھے اور ان کے سچ خاموشی تھی۔ زویا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”چپ ہو، خاص وجہ؟“ عرشان ولی نے خاموشی کا پردہ چاک کیا۔

”تم نے ملنا کیوں کم کر دیا؟“ زویا نے گہری نظروں سے دیکھتے سوال داغا۔

”بڑی ہو گیا ہوں۔“ معروف انداز میں فائل قریب کی۔

”بڑی ہو یا بھاگ رہے ہو؟“ زویا نے جیسے لہجے میں سوال کیا۔

”کس سے بھاگوں گا؟“ عرشان ولی نے نظریں اس کے چہرے پر جمادیں۔

”مجھ سے، میرے جذباتوں سے۔“ زویا نے ایک ادا سے کہا۔ عرشان ولی کے لب سرعت سے بھیج گئے۔

روشن پیشانی پر چند لکیریں ابھر گئیں۔ لب دانتوں تلے دبا کر اس نے جیسے لیوں کو کوئی گستاخ جملہ کہنے سے

روکا جیسے خود پر ضبط کیا ہو لیکن مزید چپ رہنا اسے بے کار لگا۔

”زویا! تم میری بچپن کی دوست ہو۔ اس لیے میں تم سے کوئی سخت بات نہیں کرنا چاہتا۔ میں ایک بات کو بار بار دہرا نا بھی پسند نہیں کرتا۔ تمہیں میری نیچر کا علم ہوگا۔ آئندہ کچھ بھی کہنے سے پہلے احتیاط کرنا۔“ اس نے نامگوار لہجے میں جتا کر سختی سے وارن کیا۔

”نہ کروں تو.....“ زویا کو چڑھنے لگی۔ ”جج سے ملنے، کانٹیکٹ کرنے کی کوئی کوشش نہ کرنا۔“ خفگی اس کے لہجے میں تھی۔ انداز دو ٹوک تھا۔ وہ یوں بھی لگی لپٹی رکھنے کا قائل نہیں تھا۔

”تمہیں مجھے جیسی کوئی لڑکی نہیں ملے گی۔“ چیلنج کرنے والا انداز تھا۔

”مجھے تم جیسی لڑکی چاہیے بھی نہیں۔“ عثمان ولی نے کمال سکون سے کہا۔ نظریں جتاتی ہوئی تھیں۔ زویا کو ہنسنے لگ گئے۔

”تم میری انسلٹ کر رہے ہو؟“ وہ برا مان گئی۔

”مجبور تم کر رہی ہو۔“ وہ جتا گیا۔

”ہے کون وہ، جس کی وجہ سے تم مجھے ٹھکرا رہے ہو۔“ زویا کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح عثمان ولی کو اپنا بنا لے۔

”جمل جائے گی تو دیکھ لینا۔“ وہ چیئر دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”ایکسیکو زوی!“ جیکٹ چیئر سے اٹھا کر بازو پر رکھ کر وہ روم سے واک آؤٹ کر گیا۔ زویا ہونٹ کی طرح اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆.....☆

ہاجرہ کپڑوں کا ڈھیر پھیلانے بیٹھی تھیں۔ روٹی، سوٹی کپڑے تہہ کر رہی تھیں۔ قدوس صاحب خشکیوں لگا ہوں سے گھور رہے تھے۔ وہ ابھی ابھی باہر سے لوٹے تھے۔ آتے ہی نظر کپڑوں کے ڈھیر پر پڑی تھی۔

”یہ گھر کو کیا تم لوگوں نے جنم بازار بنا رکھا ہے۔“

”میں نے بوتیک والی سے سلائی کا کام لینا شروع کر دیا ہے۔ محلے کے کپڑے سی کر اچھی اجرت نہیں مل رہی تھی۔“ ہاجرہ نے محلے کی ایک خاتون کے توسط سے اوسط درجے کی بوتیک سے رابطہ کیا تھا۔ خاتون کا بڑا تو نہیں درمیانے درجے کا پارلر تھا جس میں وہ بوتیک بھی چلا رہی تھی۔ اسے ہاجرہ کی سلائی پسند آئی تھی جس کی وجہ سے اس نے کافی کام دے دیا تھا۔

”اور زلیل کرواؤ محلے میں، سب کے سامنے۔“ قدوس صاحب چٹکھاڑے۔ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح تو انہیں اپنی مردانگی دکھانی ہی تھی۔ ایسے ہی تھی۔

”ذلیل کروانے کی کیا بات ہے۔ گھر کی وال روٹی چلانے کے لیے کرنا پڑتا ہے۔ آپ کی نوکری بھی چھوٹ گئی کل کو بیٹیوں کی شادی بھی کرنی ہے۔ درخشاں کو جس طرح رخصت کیا اس پر دل ابھی تک رورہا ہے۔“ ہاجرہ افسردہ ہو گئیں۔ ہر ماں کی طرح ان کے دل میں بھی امان تھے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو اچھے سے اچھا جینز، کپڑے دیں مگر وہ وقت و غربت کے ہاتھوں بندھی ہوئی تھیں۔

”دودن گھر بیٹھ گیا تو لگیں طعنہ مارنے۔ ساری زندگی عیش کرتی رہی تب تو نہ بولی تو۔“ قدوس صاحب کی آواز اچھوٹی ہوئی۔ روٹی سوٹی سرائیکی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں جیسے جنگ شروع ہونے کا خطرہ بجابٹ گئی تھیں۔

”کب عیش کیا۔ روزاول سے روکھی سوکھی کھا کر گزارا کیا۔ چند جوڑوں میں بال سفید کر لیے۔“ ہاجرہ کو طعنے جابک کی طرح لگے تو وہ بھی بلبلان گئیں۔ سوٹی نے دزدیدہ نظروں سے باپ کا چہرے دیکھتے ہاجرہ کا ہاتھ غیر محسوس طریقے سے دبا کر انہیں جیسے مزید بولنے سے روکنا چاہا۔

”چار پیسے کا کمر بہت زبان چلنے لگی ہے تیری۔“ قدوس صاحب آپے سے باہر ہو گئے تھے۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ کسی بڑوسی کی آمد کی دعا کرتی سوٹی تیزی سے دروازے کی اور بڑھی تاکہ یہ جھگڑا تو ختم ہوتا لیکن دروازے پر آنسو گرودیکھ کر وہ مزید پریشان ہو گئی تھی۔ اب تو پول کا رخ تھینا اسی کی طرف ہو جانا تھا۔

آنسو نے گھر کے باہر ہی سے قدوس صاحب کی تیز آواز ساعت میں محفوظ کر لی تھی۔

”السلام علیکم۔“ بکھرے کپڑوں اور غصیلے چہرے والے قدوس صاحب کو دیکھ کر اس نے دھیسے سے سلام کیا۔

”اس وقت کہاں سے آرہی ہو؟“ تفتیشی لہجہ تھا۔ آنسو نے گھٹا کر کیا۔ حقیقت کب تک چھپ سکتی تھی۔ سچ بتانا تو تھا۔

”انٹرویو کے لیے گئی تھی۔“ انداز مجرمانہ تھا۔ قدوس صاحب چونک گئے۔ ہاجرہ پر گھورتی نظر ڈالی۔

”اب یہ نوکری کرے گی۔ تم لوگ بہت من مانی کرنے لگی ہو۔“ وہ بھڑک اٹھے تھے۔

”نوکری کرنا من مانی نہیں ضرورت ہے ابا! گھر کے اخراجات پورے کرنے لیے ہم سب کو کوشش کرنی ہوگی۔“ اس نے ہمت کر کے انہیں منانے کی سعی کی۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے نوکری کرنے کی۔ تیرے چند ہزار سے گھر کی قسمت نہیں بدل جائے گی۔“ قدوس صاحب نے قطعی لہجے میں کہا۔

”ابا! میں ہاں کر آئی ہوں۔“ آنسو کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات آ گئے۔

”تو منع کر دے، مجھ سے پوچھ کر گئی تھی۔“ وہ دہاڑ رہے تھے۔

”میں تو صرف انٹرویو کے لیے گئی تھی۔ قسمت سے سلیکشن ہو گئی۔ ابا پلیز اجازت دے دیں۔ پندرہ ہزار سیرلی ہے۔ اچھی نوکری ہے۔“ بچی لہجے میں کہتے ہوئے آنسو نے سفارشی نظروں سے ہاجرہ کی طرف دیکھا کہ وہ ہی معاملہ سنبھال لیں۔

”پندرہ ہزار۔“ قدوس صاحب نے بے یقینی سے دہرایا۔

”جی اور ٹائم کے الگ ہوں گے۔ آنے جانے کی بھی کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ آفس کی گاڑی ہوگی۔ ابا پلیز انکار نہ کریں۔ گھر کے حالات دیکھیں۔“ آنسو دیگر سہولیات بتا کر انہیں نرم کرنا چاہ رہی تھی۔

”پھر بھی محلے والے لاوگ.....“ قدوس صاحب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

”لوگ کون سا ہماری بانڈی روٹی کے پیسے دیتے ہیں جو ہم ان کی فکر کریں تو جو ان کر لے آنسو۔“ ہاجرہ

درمیان اس نے جلدی سے کہا تھا۔ عثمان ولی نے اب کے اسے بغور دیکھا تھا۔ گھنی مڑی لابی پکوں کو پٹپٹاتے وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی اس کا سیل فون والا ہاتھ بے ساختہ نیچے ہو گیا تھا۔
”دیکھیں۔“

”آپ کو باس سے جتنا بھی ضروری کام ہے وہ ابھی تو نہیں ہو سکتا کیونکہ میں یہاں سے ہٹوں گی نہیں۔ بہتر ہوگا۔ آپ ہی پلٹ جائیں۔ سر جیسے ہی میننگ سے فری ہوں گے میں پہلی فرصت میں ان سے آپ کی میننگ فکس کر دوں گی۔ آئی سوئیر!“ عثمان ولی نے کچھ کہنا چاہا تھا مگر اس کی بات شروع ہونے سے پہلے ہی اچک کر آنسوؤں نے اسے آس دلا دیا۔ عثمان ولی کے ارد گرد جیسے مٹی پٹپٹانے چھوٹے لگے تھے۔ لڑکی کا انداز اتنا معصومیت لیے اور دلچسپ تھا کہ اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ اس پر سے وہ جس طرح دائیں بائیں ہاتھ پھیلائے اس کا راستہ بلاک کیے کھڑی تھی وہ اس بچکانہ حرکت پر لب و لہجہ سے تلبے دے رہا تھا۔ جیسے وہ اسے ڈانچ دے کر اندر داخل ہو جائے گا وہ جس طرح چست کھڑی تھی۔ اس نے مسکراہٹ چھپائی تھی مگر آنسوؤں کی مسکراتی نظروں سے بدگمان ہو کر شانوں سے سرکتا دوپٹا برابر کر کے دایاں ہاتھ پھروا کر کر گئی۔

اسی اثناء میں عثمان ولی کا سیل فون بجنے لگا تھا۔ نظریں اس پر جما کر اس نے کال پک کی تھی۔
”یار! کہاں ہے جلدی آؤ تمہارے روم کے باہر ایک محترمہ سلطان راہی بنی کھڑی ہیں۔ ان کی اجازت ملے تو آؤں نا.....!“ آنسوؤں کو نظروں کے حصار میں رکھتے اس نے بے ساختہ گفتگو کا آغاز کیا۔ وہ غالباً اس کی دیر پر اسے سرزنش کر رہا تھا۔ وہ اس کی گفتگو سنتی کچھ بزل سی ہونے لگی تھی۔
”آنسو ہوگی، فون دواے۔“ ولید نے سمجھتے ہوئے کہا۔ عثمان ولی نے بے ساختہ اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھایا۔

”آپ کے باس!“ آنسو بڑھے ہوئے سیل فون کو تعجب سے دیکھ رہی تھی، تب ہی ذرا شرارت سے جھکتے اس نے ہولے سے کہا۔ اس کی شرارت کو تیکسی نظروں سے دیکھتے اس نے سیل فون احتیاط سے لے کر کان سے لگایا۔

”جی سر!“ اتنا تو وہ جان گئی تھی۔ دوسری طرف ولید ہی تھا۔
”راستے سے ہٹاؤ اور عثمان ولی کو اندر آنے دو۔ جس کی وجہ سے میننگ رکی ہوئی ہے۔ تم اسے ہی روکے کھڑی ہو۔“ ولید نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات الیکم عود آئے تھے۔ عثمان ولی دلچسپی سے اس کے چہرے کے رنگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنی جلدی اتنے سارے تاثرات ایک چہرے پر وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

”سوری سر! لیکن آپ کی انٹرکشن پر عمل کر رہی تھی۔“ لب کانٹے اس نے پراعتاد لہجے میں کہا تھا۔
”میں آپ کی تعریف کر رہا ہوں۔ اندر آنے دو، عثمان کو۔“ ولید نے سراپتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔
”جی سر!“ سیل فون اس کی طرف بڑھاتے اس نے نجل انداز سے چہرے پر جھوٹی لٹ کوکان کے پیچھے کیا۔ اس کھڑی وہ خود کو دنیا کی احمق ترین ہستی سمجھنے لگی۔ اس پر سے عثمان ولی کی شرارتی نظریں مسلسل اس کا طواف کر رہی تھیں۔

نے دو ٹوک لہجہ اپنا کر کہا۔ بیٹیوں کے بڑے ہونے کے بعد اب وہ خود کو مضبوط محسوس کرنے لگی تھیں۔ تب ہی قدوس صاحب کے سامنے بھی بول پڑتی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو قدوس صاحب جواباً گولہ ضرور داغنے مگر پندرہ ہزار نے ان کا منہ بند کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے گھر سے نکل گئے۔

”پندرہ ہزار کا سن کر منہ بند ہو گیا۔ ورنہ پہلے کتنا دباؤ رہا تھا۔ خود میں تو کچھ کرنے کی صلاحیت ہے نہیں سوائے چلانے کے۔“ پیسہ اچھے اچھوں کا منہ بند کر دیتا ہے، سنا تھا آج دیکھ بھی لیا۔“ ہاجرہ سر جھٹک کر بڑبڑا رہی تھیں۔

”اچھا چھوڑیں نا، موڈ خراب نہ کریں۔“ آنسوؤں نے قدوس صاحب کی خاموشی کو اجازت جان کر سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ اجرہ کا موڈ بحال کرنے لگی۔

”آنسو جب تھیں پہلی سیلری ملے گی تاہم سی ویو چلیں گے۔ کتنا عرصہ ہو گیا کھلے سمندر کو دیکھے۔“ سونی نے پر شوق لہجے میں فرمائش کرتے حسرت سے کہا۔

”اور میں اونٹ پر بیٹھوں گی۔“ رولی نے ایکساٹینڈ ہوتے ہوئے کہا۔

”اچھا! ضرور چلیں گے۔“ اس نے مسکراتے ہوئے بہنوں کا مان بڑھایا۔

☆.....☆

آنسو کو آفس جوائن کیے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ شازیہ نے اسے چند دنوں میں ہی ٹرینڈ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں دلچسپی سے منہمک تھی۔ تب ہی انٹرکام پر ولید کی ہدایت ملی۔

”آنسو! میننگ شروع ہونے والی ہے۔ کسی کو اندر نہیں آنے دیجیے گا۔ ختی سے عمل کیجیے گا۔“
”او کے سر۔“ اس نے جانفشانی کا لیٹین دلایا۔ شازیہ آج نہیں آئی تھی اس لیے تمام کالز اور انفارمیشن اسے ہی دینی پڑ رہی تھی۔ وہ کلائنٹ کی کال سن رہی تھی تب ہی عثمان ولی سیل فون کان سے لگائے داخل ہوا تھا۔ اس کی پشت آنسو کی طرف تھی۔

”ایلیکسیو زی! ایلیکسیو زی سر!“ کال میں بڑی آنسو کی نظریں نووارد پر پڑیں تو ہیڈ فون اتارتے اس نے اجنبی کو آواز دی مگر غالباً اس کی آواز اس تک پہنچی نہیں تھی۔

”Hello Mr Can you listen to me!“

اس نے اب کے پہلے سے زیادہ تیز آواز میں کہا مگر وہ کان سے لگے سیل فون میں اس قدر مصروف تھا کہ شاید اس تک آنسو کی پکار پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کا رخ ولید کے روم کی طرف ہوتا دیکھ کر آنسو کو ولید کی انٹرکشن جہاں یاد آتی وہیں اسے اپنی نوکری جانی لگی اگر وہ اندر پہنچ جاتا تو ولید کے نزدیک اس کا کیا امپریشن پڑتا کہ ایک دن شازیہ کے نہ ہونے پر وہ اپنی کارکردگی نہ دکھا سکی تھی۔ ہیڈ فون بھینکنے کے انداز سے رکھتے اس نے تقریباً دوڑ لگا دی تھی اور ولید کے روم کے دروازے کے آگے چٹان بن کر کھڑی ہو گئی۔ سیل فون کان سے لگائے عثمان ولی اچانک ایک دو شیزہ کودائیں بائیں ہاتھ پھیلا کر راستہ روکنے پر ایک بل کو ٹھک گیا تھا۔ پنک سوٹ میں بھاگنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر بھی سرخی دوڑ گئی تھی۔ ستواں ٹاک، اس میں چمکتا نوز پن، گھنے کالے آبشار جیسے بالوں کی ٹیس اس کے ٹولڈر پر جمول رہی تھیں۔
”اندر میننگ چل رہی ہے۔ آپ اندر نہیں جاسکتے۔ باس کی ختی سے تاکید ہے۔“ پھولتی سانسوں کے

”اجازت ہے؟“ قدرے جبکراس نے جبکہ سر کی طرف دیکھا۔ آنسو کی تکیجھی نظریں ذرا کی ذرا اٹھی تھیں۔
 ”Yes Please!“ وہ سامنے سے ہٹ کر اپنے کیمین کی اور بڑھ گئی تھی۔
 ”بندے کو اتنا پیئڈم بھی نہیں ہونا چاہیے، اوپر سے دلکش مسکراہٹ، گھمبیر آواز، بندہ خواص باختہ نہ ہو تو اور کیا کرے۔ کتنی اسٹوپڈ حرکت کی میں نے۔“ وہ خود کو ملن طعن کرنے لگی۔ اسے دور سے شاز یہ تیز چلتی نظر آئی۔

”تم نے آج دیر کر دی؟“ آنسو کو اس کی بے وقت آمد پر حیرت ہوئی۔
 ”ہاں کچھ ضروری کام تھا اس لیے جھپٹی کا موڈ ہوا تو تمہیں انعام کر دیا لیکن کام وقت سے پہلے ہو گیا تو آفس چلی آئی کہ تاحق گھر میں بیٹھی بور ہوتی رہوں گی۔“ شاز یہ نے تفصیل سے کہتے اپنی سیٹ سنبھالی۔
 ”او کے!“ وہ کھوئی کھوئی سی تھی۔ شاز یہ نے اسے آئی بروا چکاتے ہوئے دیکھا۔ ”کوئی پراہلم!“
 ”یہ عثمان ولی کون ہیں؟“ آنسو نے اپنی الجھن اسے بتائی۔ اس کے انداز سے اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ وہ کوئی معمولی ہستی نہیں ہے۔

”آئے ہیں کیا؟“ جواب کی بجائے شاز یہ نے الٹا سوال جڑ دیا۔
 ”ہاں اور آتے ہی ان کی وجہ سے مجھے سبکی کا سامنا کرنا پڑا۔ بہت شرمندگی محسوس کر رہی ہوں۔“ اس نے منہ بنایا۔ اسے عثمان ولی کی نظریں بھل کر رہی تھیں۔
 ”ہوا کیا؟“ شاز یہ نے جانتا جاہا۔ آنسو نے ولید کی ہدایت اپنا کارنامہ اور عثمان ولی کا چڑا تا انداز تفصیل کے ساتھ من و عن گوش گزار کر دیا۔ شاز یہ کی ہنسی بے ساختہ تھی۔
 ”تم بھی ہنسو، میرے تیس بار خان بننے پر۔“ وہ برامان کر فائل اشاعت کرنے لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ ناراض ہو جاتی شاز یہ نے اپنی ہنسی کو قابو میں کیا۔
 ”سوری یار! لیکن چوبیس اسی مزیدار سناٹی تم نے کہتا ہوں رہ سکا ہنسی پر۔“ آنسو نے منہ بسورا۔
 ”عثمان ولی!“ شاز یہ ایک بل کوری۔ آنسو کی توجہ اس کی طرف تھی۔

Aarshmaan Wali one of the best person in this world! He is such a nice man.

”شاید ابھی ایسا کوئی لفظ بنایا نہیں جس میں ان کی تعریف کر سکوں۔“ شاز یہ ڈوب کے گویا تھی۔ آنسو کو حیرانی ہوئی اتنی تعریف پر۔

”ایسا بھی کیا ہے؟“ اس نے سر جھٹکا۔
 ”سر عثمان جدی پشتی رئیس گھرانے سے ہیں۔ بے حد جیننس۔ ان کا خود کا برنس یورپ تک پھیلا ہوا ہے۔ سر ولید کے بیٹ فریڈ ہیں اور اب پارٹنر بھی۔“ شاز یہ جانے ابھی اور کتنی تعریف کرنی تب ہی کال آنے لگی تھی۔ گفتگو کا سلسلہ رک گیا تھا۔ دونوں آنے والی کالز کی طرف متوجہ ہو گئیں۔
 وہ دونوں معمول کے کام میں مصروف تھیں۔ جب ولید کے روم کا دروازہ کھلا اور کچھ چائیز مہمانوں کو رخصت کرنے کو ولید اور عثمان ولی بھی برآمد ہوا۔ دونوں اپنی جگہ اکیٹو ہو گئیں۔ الوداعیہ انداز میں وہ چائیز مہمانوں کو تھینا عزت کے ساتھ رخصت کر رہے تھے۔

مصافحہ کر کے روانی سے چائیز لیکو ج میں گفتگو کرتے اس نے عثمان ولی کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ اتنی روانی سے بول رہا تھا کہ اسے رشک آنے لگا۔ ولید خیر مقدمی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ باتیں کرتے بالآخر مہمان رخصت ہو گئے۔ دونوں بیچ میں ہی رک گئے تھے۔
 ”اف! ٹھیکس کہ تو آ گیا۔ ورنہ یہ جی پوں تو میرے بس کا روگ نہیں۔“ ولید نے شکر کا سانس لیتے عثمان ولی کو سراہا۔

”اب میں بھی نکلتا ہوں۔“ عثمان ولی نے مسکراتے ہوئے ارد گرد نظر ڈالی تھی۔ دزدیدہ نظروں سے آنسو کی طرف دیکھا۔ اسے بھی منتظر دیکھ کر اس کے لبوں پر بڑی شری مسکراہٹ پھیل گئی جو آنسو کو پھر بھل کرنے لگی۔

”کل ایک اور میننگ ہے۔ انہیں سائٹ کا وزٹ کروادیں گے تم ٹائم پر آ جانا۔ ساتھ چلیں گے۔“ ولید کل کے لیے یاد دہانی کر دیا تھا۔

”میں تو ٹائم پر آ جاؤں گا۔ بشرطیکہ کوئی سلطان راہی بیچ میں نہ آئے۔“ اسے بھرپور نظروں سے دیکھتے اس نے شرارتی مسکراہٹ سے کہا تھا۔ انہیں ان دونوں کے مابین ہوتی گفتگو بغور سنانی دے رہی تھی کہ فاصلہ کم تھا۔ اب کے اس نے جب شرارت سے کہا تو آنسو کی نظریں بے ساختہ اس سے مل گئیں۔ وہ سرعت سے دوبارہ سر جھٹکا۔ عثمان ولی نے لب دبا کر مسکراہٹ روک لی تھی۔ وہ اس مزاج کا نہیں تھا مگر اس گھڑی اسے پزل کرنا اسے اپنے مزاج کے ایک روپ سے آشنائی دے گیا۔

☆.....☆

آنسو تھکی باری گھر میں داخل ہوئی تھی۔ ہاجرہ اور قدس صاحب محن میں براجمان تھے۔

”السلام علیکم!“ وہ ان دونوں کی طرف بڑھ گئی۔

”آج دیر کر دی تم نے۔“ ہاجرہ نے اس کے تھکے چہرے کو دیکھا۔ صبح کی نکلی وہ رات کے آٹھ بجے گھر میں داخل ہوئی تھی۔ نوکری کے بعد سے یہ ہی معمول تھا اس کا۔

”جی کو چنگ سینٹریس دیر ہو گئی۔ پیچرز ہو رہے ہیں بچوں کے تو Extra Time دینا پڑ رہا ہے۔“ وہ سائیڈ پر بیٹھ گئی۔

”دن بھر آفس میں جان کھپا کر کو چنگ چلی جاتی ہے۔ یہ وقت ہو جاتا ہے لوٹے، سونی بہن کو پانی پلا۔“ بڑبڑاتے ہوئے ہاجرہ نے آخر میں اونچی آواز لگائی۔

”کبھی اتنی فکر تو نے میرے لیے تو نہیں دکھائی، بیٹی کے گھر میں مھتے ہی تجھے اس کی فکر ستانے لگی۔“ قدس صاحب نے خفگی سے شکایت کی۔

”عورت مرد کے لیے فتاحی ہو جائے تب بھی مرد طنز کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ ہر وقت جلتی چابک عورت کے دجود پر مارنا اس کی سرشت میں جو ہے۔

کب لا پرواہی کی میں نے تمہاری طرف سے، آنسو لڑکی ذات ہے ہڈی تو زحمت کر رہی ہے۔ ہم سب کے لیے بیٹوں سے کہیں زیادہ۔“ ہاجرہ کو ان کی شکایت پر ہم کر گئی جس کا انہوں نے اظہار بھی کر دیا۔

”تو نہ کرے کس نے کہا ہے۔ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے دو پیسے کیا کمانا شروع کیے تم طعنے مارنے

لگیں۔“ قدوس صاحب بھی کمان کس کر میدان میں اتر آئے۔ سونی پانی لے آئی تھی۔ آنسو نے اسے دیکھا اور گھاس تمام لیا۔

”ابا پلیز! میں صرف اماں کی نہیں آپ کی بھی بیٹی ہوں۔ ہمیں یوں فٹ بال بنا کر لڑنے کا بہانہ نہ ڈھونڈا کریں۔“ اس نے پرس میں سے کچھ ڈھونڈتے ہوئے لڑنے کا میدان گرم دیکھ کر سیز فائر والے جملے کہے تو قدوس صاحب کچھ شندے پڑنے لگے۔ نوکری کے بعد سے آنسو میں مزید خود اعتمادی آگئی تھی۔ پہلے جو وہ قدوس صاحب سے ڈر کے چپ ہو جاتی تھی اب پیار سے انہیں رام کرنے کے جتن کرنے لگی تھی۔ وہ جان گئی تھی اس کا باپ اوپر سے بظاہر سخت ہے۔ زبان سے گولے داغتا ہے لیکن جوں جوں وہ باہر کی دنیا میں سانس لے رہی تھی اسے ان کے لیے کتنی سختی اور لڑواہٹ کی سمجھ آنے لگی تھی۔ ایک معمولی چیز اسی جو لوگوں کی جوتیاں سیدھی کرتے ان کی گالیاں سن کر ان کے ہاتھوں کی ککیریں سن کر اپنی ذات کو صاحب لوگوں کے جوتے تلے کچل کر چند ہزار کم کر جب گھبراتا تھا تو اپنی انا، مردانگی کے بلبلانے پر وہ گھر کی عورتوں پر ہی نشتر چلائے گا تا، باہر تو اس کا زور صاحب لوگوں پر نہیں چلتا تھا۔ وہ باہر محکوم تھا تو گھر میں حاکم بن جاتا تھا۔ جن حاکموں کے رویے سے وہ بدظن رہتا تھا۔ درپردہ وہ گھر میں ان ہی جیسا بن جاتا تھا اور جب گھر میں کم آمدنی پر طعنہ ملتا تو ان کی انا مزید بلبلاتا جاتی تھی۔ آنسو باپ کی نفسیات سمجھ گئی تھی۔ عورت رو دھو کر اپنا دکھڑا سنا دیتی ہے اور مرد کڑوے کیلے لہجے میں۔ دونوں کا انداز الگ ہوتا ہے۔ اس لیے عورت ازل سے مظلوم اور مرد ظالم تھا۔

”ابا یہ آپ کے گھٹنوں کی دوا، اماں یاد سے کھلا دیجیے گا۔ میں منہ دھولوں ذرا۔“ دوا قدوس صاحب کے ہاتھ میں تھائی۔ ان کا گھٹنا باد کر اٹھ کھڑی ہوئی تو قدوس صاحب کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے جھلک گئیں۔ اگلے ہی پل وہ دوبارہ اپنے خول میں مقید ہو گئے کہ مرد کو کب اپنی کمزوری دکھانا پسند ہوتا ہے۔

کھانے کے بعد سب اپنی اپنی جگہ پر لیٹ گئے تھے۔ وہ بھی لیٹی تو اکڑی کر نے بستر سے نکتے ہی جیسے شکوہ کیا۔ رات کی تاریکی گہری ہونے لگی تھی۔ ذہن کی اسکرین پر کچھ پل دستک دے رہے تھے۔ چھم سے شرارتی نظریں اور مسکراتے لب کے ساتھ عرشان ولی اس کے سامنے آگیا وہ کئی پل کے لیے ساکت رہ گئی۔ اسے سوچتی رہی پھر جیسے خوب صورت سوچ میں موٹا سا اڑدھانکل آیا۔ وہ بے ساختہ فلمی میں سر ہلانے لگی۔

”آنسو ربی بی! پھر سے خوش گمانی کو جگہ دے رہی ہو۔ پھر سے انہی گلیوں کا سفر کرنا چاہ رہی ہو۔ کیا زویا کے ہاتھوں ہوئی تذلیل اتنی جلدی بھول گئیں، اپنی حیثیت پہچانو۔“ اس نے جیسے خود کو باد رکراتے ہوئے جبر جبری لی۔

”ایک ٹھوکر نے زندگی کا چلن بدل دیا۔ سوچ کا انداز بدل دیا۔ مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی فیملی کے لیے خود محنت کروں گی۔ خیرات ہمیشہ سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنی نظروں میں گرنا نہیں ہے۔ جھوٹ و فریب کا کھیل سوائے ذلت کے کچھ نہیں دیتا۔ میں اب پھر سے جھوٹے خواب آنکھوں میں نہیں سجاؤں گی خوب صورت لڑکی سینڈرلا نہیں بن سکتی۔“

وہ خود کو یاد رکھ رہی تھی اور کچھ حقیقت جاننے کے بعد انسان کو سوائے تکلیف کے کچھ حاصل نہیں ہوتا لیکن یہ آگاہی یہ درد و فریبی سے کہیں بہتر ہے۔ وہ پرسوچ نظروں سے کھڑکی سے جھانکتے چاند کو دیکھنے لگی۔ چاند ہر آنکھ میں نظر ضرور آتا ہے مگر اتر نہیں ہے۔

عرشان ولی بالکئی کے گرل سے دایاں بازو نکالے آسمان کے سینے پر جھنگاتے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ یاف سیلوز و ہائٹ نی شرٹ اور بلیو جینز میں وہ بے حد آسودہ تھا۔ ایک عجیب سی خود فریبی وجود میں دوڑ رہی تھی۔ بلاوجہ لب مسکرا رہے تھے۔ گرل سے پشت کے ساتھ سر بھی نکالے اس کی نظریں چاند پر ہی تھیں جس کا عکس نیچے بے سوسنگ پول پر بھی پڑ رہا تھا۔ ہر سو چاندنی پھیل ہوئی تھی۔

”تو تم مل ہی گئیں، تمام یہ انتظار ہوا۔“ اس کے لبوں سے بے ساختہ دل کی بات نکلی تھی۔ بھرپور مسکراہٹ لبوں پر پھیل کر احساس دلا گئی کہ محبت کا جادو چل گیا ہے۔

☆.....☆

حمنی شاپنگ سے فری ہو کر مال سے نکلی تھی۔ بیگز کار میں ڈالتے سیدھی ہوئی تو اس کی نظریں بے ساختہ سامنے ریسٹورنٹ پر پڑ گئیں۔ دفعتاً اس کی آنکھیں محل کر مزید کشادہ ہو گئیں۔ شاہ میر کسی لڑکی کے ساتھ لہج کر رہا تھا۔ حمنی اسے کال کرنے لگی۔

”کیا کر رہے ہو؟“ حمنی نے اپنا شک دور کرنا چاہا۔

”مینگ میں بڑی ہوں۔“ شاہ میر کے جواب پر حمنی کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

”کہاں ہے مینگ؟“ اس نے لہجے پر مقدور بھرتا پور لکھا۔

”اُس میں اور کہاں!“ اب کے حمنی کا بارہ چڑھ گیا تھا۔ وہ تیزی سے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی تھی۔

شاہ میر اسے ایک دم سے سامنے دیکھ کر چونک گیا تھا۔

”تو یہ ہے تمہاری مینگ اور تمہارا اُس؟“ حمنی خونخوار نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ شاہ میر سے کوئی بات نہ بن سکی۔

”آپ کون؟“ لڑکی نے حیرت سے دریافت کیا تھا۔

”ان سے پوچھو، جن کے ساتھ لہج کر رہی ہو۔“ حمنی خشکیں لہجے سے کہتی شاہ میر کو گھور رہی تھی۔

”گھر چلو، تماشا کیوں کر رہی ہو۔“ شاہ میر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تماشا میں کر رہی ہوں یا تم شادی شدہ ہو کر فلٹ کر رہے ہو۔“ حمنی نے چلاتے ہوئے کہا۔ لوگ متوجہ ہونے لگے تھے۔ شاہ میر کے لیے بہت اگورڈ صورت حال ہو گئی تھی۔

”یہ میر ڈ ہیں؟“ لڑکی نے تحیر سے پوچھا تو حمنی مزید چراغ پا ہو گئی۔

”ذوب مرو!“ حمنی واک آؤٹ کر گئی تھی۔

”حمنی!“ پیچھے سے شاہ میر نے آواز دی مگر وہ ان کی طرف نہ دیکھی۔

☆.....☆

آنسو سر جھکائے، شسم پر بڑی تھی۔ تب ہی کسی نے انگلیوں سے کاؤنٹر بجایا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ عرشان ولی کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے شپٹائی۔ اگلے ہی لمحے ازلی خود اعتمادی سے گویا ہوئی۔

”Yes sir!“

”ولید صاحب سے ملنا تھا، روم میں ہیں؟“ وہ نہایت شرافت سے استفسار کر رہا تھا لیکن اس کی شرارتی نظریں آج بھی اسے مسکراتی محسوس ہوئیں۔

”سرراؤنڈ پر ہیں۔ آپ ان کے روم میں تشریف رکھیں۔“ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی جب پارٹنر تھا تو اسے کسی اجازت کی ضرورت کیوں پیش آنے لگی۔

”میں یہاں بیٹھ کر ہی ویٹ کر لیتا ہوں۔“ وہ سامنے وینٹگ ایریا میں ہی بیٹھ گیا۔ جہاں سے وہ آنر کو صاف دیکھ سکتا تھا۔ آنر نے کچھ نہیں کہا۔

”شازیہ نے تو بتایا تھا پارٹنر ہیں پھر یہاں بیٹھ کر انتظار کیوں کر رہے ہیں۔“ اسے اس کی نظروں سے ابھسن ہونے لگی جو وہ وقتاً فوقتاً اس پر ڈال رہا تھا۔ آنر کو اپنا کام کرنا دو بھر لگنے لگا۔

”عرشان! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو؟“ ولید کچھ لمحوں بعد آیا تو عرشان کو دیکھ کر حیرانی کا مظاہرہ کیا۔

”تم سے ملنے آیا تھا۔ مس نے ویٹ کرنے کا کہا۔“ کھڑا ہوتے ہوئے اس نے معصومیت سے کہا۔ آنر کا منہ اس جھوٹ پر کھل گیا۔ ولید مسکرا دیا۔

”تم نے اپنا تعارف کروانا تھا نا، اب تم مینوں بعد شکل دکھاؤ گے تو ایسا استقبال تو ہوگا۔“ ولید، آنر کی طرف رخ کر گیا تھا۔

”آنر! عرشان ولی ہیں میرے بزنس پارٹنر، اور اس آفس کے باس بھی۔ مس آنر نے پندرہ دن پہلے ہمیں جو ان کیا ہے۔“ ولید نے دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔

”اب کیا یہیں بڑے رہو گے، اٹھو۔“ ولید کے گھر کے پر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”آنر! دوکانی بھجوا دوں۔“ ولید نرمی سے کہتا عرشان کو لیے روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔

آنر نے انٹرکام کیا مگر کچن میں کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ ناچار خود کچن کی اور بڑھ گئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ شازیہ راستے میں ہی مل گئی۔

”ٹاقب کوکانی کا بولنے، سر ولید اور عرشان سر کے لیے۔“

”یار! میں نے ٹاقب کو اپنے پرسل کام سے قریبی سپراسٹور بھیجا ہے۔“ شازیہ کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات آ گئے۔

”پھر کافی کا کیا ہوگا؟“ آنر کو بھی تشویش ہوئی۔ جانے ٹاقب کب تک آتا۔ شازیہ چند لمحوں سوچتی رہی۔

”تم بنا دوکانی۔“ شازیہ نے آئیڈیا دیا۔

”میں.....!“ آنر کو حیرانگی ہوئی۔ گو اس نے کبھی کافی نہیں بنائی تھی مگر ٹاقب کو کوئی بار بناتے ضرور دیکھا تھا۔ اسے ترکیب اور چیزوں کی مقدار از بر تھی۔ ویسے بھی کوکنگ ایکسپرٹ تھی۔ گھر میں کافی جیسی عیاشی نہیں کرتی تھی مگر آفس میں اس ذائقہ سے آشنائی ہو گئی تھی۔

”کیوں بنانا نہیں آتی۔ پلیز یار! جلدی بنا دو ورنہ ٹاقب کے ساتھ میری بھی شامت آ جائے گی۔“ شازیہ نے متوقع سرزنش سے بچنے کے لیے لہجی لہجہ میں کہا۔

”اوکے لڑائی کرتی ہوں۔“ وہ دوستی میں بے چارگی سے ہامی بھر کے کچن کی طرف چل دی۔

کافی بن چکی تھی۔ آنر جھوٹی سی ٹرے میں دوکانی لیے شازیہ تک آئی۔

”یہ ٹاقب کہاں رہ گیا؟“ اب کافی اندر لے جانے کا مرحلہ درپیش تھا۔ شازیہ کو پریشانی لاحق ہو گئی۔

آنر کو بے چارگی سے دیکھنے لگی۔

”اب تم مجھے کافی اندر لے جانے کا نہ کہنا۔“ آنسو نے اس کی نظروں کو بھانپ کر صاف ہری جھنڈی دکھا دی۔

”شازیہ! جی! آپ کا سامان۔“ صد شکر کہ ثاقب چلا آیا تھا۔ شازیہ نے اس کے ہاتھ سے شاپر لے کر جھٹ آنسو کے ہاتھ میں موجود رے لے کر ثاقب کو تھما دی۔

”شکر ٹائم پر آگئے۔ اس سے پہلے کہ کافی ٹھنڈی ہو جائے اسے باس کے روم میں دے آؤ۔“
”ارے وا! لیکن بنائی کس نے۔“ ثاقب کو اپنا کام مکمل ہوتا ہوا دیکھ کر حیرت ہوئی۔
”آنسو نے اب سوال جواب کرنے کھڑے نہ رہو۔“ شازیہ نے اسے زبردستی دھکیلا۔

☆.....☆

”کافی دن ہو گئے تم نے چکر نہیں لگایا۔“ ماہ پارہ نے واصفہ کو کال کی تھی۔ وہ گلہ کر رہی تھیں۔
”میں زویا کو لے کر بہت پریشان ہوں۔“ واصفہ پر پردہ ناراض تھیں مگر وہ آخری کوشش کر رہی تھیں کہ کسی طرح ماہ پارہ عرشان سے ہاں کروالیں۔ ورنہ عرشان جیسے لڑکے کا ہاتھ سے ٹکنا انہیں بھی گوارا نہ تھا۔
”کیا ہوا زویا کو؟“ ماہ پارہ کو تشویش ہوئی۔

”عرشان کے انکار کے بعد وہ بہت دکھی ہے۔ نہ ٹھک سے کھاتی ہے نہ اپنا خیال رکھتی ہے۔ بہت صدمہ پہنچا ہے میری بچی کو۔“ واصفہ بڑھا چڑھا کر زویا کی دگر فنی کی داستان سنارہی تھیں تاکہ ماہ پارہ جلد ایکشن لے لیں۔

”میں زویا کو سمجھاؤں گی۔“ ماہ پارہ کو حقیقتاً فسوس ہوا۔
”تم نے بہت زیادہ ٹائم لے لیا ماہ پارہ۔ ابھی تک عرشان کو راضی نہ کر سکیں۔ میں کب تک زویا کو تہہ باری آس پر بٹھائے رکھوں۔“ واصفہ خفا ہوئے لگیں۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں عرشان سے جلد تفصیلی بات کر کے تمہیں بتاتی ہوں۔ یقین مانو میری تو دلی خواہش ہے زویا کے لیے۔“

”تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ماہ پارہ، ہوگا تو وہی جو عرشان چاہے گا۔ تم مجھے جلدی بتا دو۔ اللہ حافظ۔“ واصفہ نے رکھائی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا تھا۔

”سمجھ نہیں آ رہا یہ عرشان چاہتا کیا ہے؟“ ماہ پارہ سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز پر ماہ پارہ چونک گئی تھیں۔

☆.....☆

”آفس کے بعد مال چل رہی ہو، مجھے کچھ ضروری چیزیں لینی ہیں۔“ شازیہ نے سر اٹھا کر ایکدم سے پوچھا۔ دونوں کی تھوڑے ہی دنوں میں بہت اچھی دوستی ہوئی تھی۔

”نہیں یار! آفس کے بعد کو چنگ سینٹر جاتی ہوں، سپر زچل رہے ہیں بچوں کے۔ چھٹی نہیں کر سکتی۔ تم ویک اینڈ کار کھلو۔ فری ہوں کو چنگ سے۔“ نفی میں سر ہلاتے اس نے مصروفیت کا احوال سنایا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ شازیہ یان گئی۔
ولید کے روم کا ڈور کھٹکا تھا۔ عرشان کو برآمد ہوتے دیکھ کر آنسو سر مزید سسٹم پر جھکا گئی تھی۔

”السلام علیکم سر!“ وہ قریب آیا تو شازیہ نے سلام جڑ دیا۔
”والسلام، سسر کی شادی ہو گئی شازیہ؟“ آنسو کے جھگڑے سر کو دیکھتے اس کے لبوں پر چور مسکراہٹ پھیل گئی۔ جان گیا تھا وہ اس کا سامنا کرنے سے کتر رہی ہے۔

”جی سر! میں آپ کا پرستی شکر یہ ادا کرنا چاہ رہی تھی۔“
”No Need! کوئی اور پر اہم ہو تو بتائیے گا۔“ اس کی نظریں اسی کا طواف کر رہی تھیں۔ اسے سر پر کھڑا دیکھ کر وہ مزید سر جھکا گئی تھی۔

”جی سر!“ شازیہ نے نمون مسکراہٹ سے کہا۔
عرشان پلٹ گیا تھا۔ ایک دم پھر رخ ان کی طرف کیا۔

”اور ہاں شازیہ!“
”جی سر۔“ الرٹ ہوتے ہوئے کہا۔ ”جب یہ مراقبے سے فارغ ہو جائیں تو انہیں اطلاع دے دیجیے گا۔ کافی بہت اچھی بناتی ہیں۔“ شریر مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف اشارہ کیا تھا۔ آنسو نے جھگڑے سے سر اٹھایا تھا۔ شازیہ مسکراتے ہوئے آنے والی کال کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

آنسو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
”ہائے!“ نظریں ملنے پر اس نے ہولے سے کہا تھا۔ پھر پلٹ گیا۔ وہ کئی ثانیے اس کے اٹھتے قدموں کو دیکھنے لگی یہاں تک کہ وہ نظروں سے اوجھل بھی ہو گیا۔

”تمہیں ہو کیا جاتا ہے سر کو کچھ کے۔“ شازیہ کال سے نمٹ کے ہنسی۔
”پہلی ملاقات میں ہی شرمندہ کر دیا، مذاق اڑاتے ہیں میری بے وقوفی کا۔“ اس نے جھلاتے ہوئے کہا۔

”سرایسے نہیں ہیں، یونو پہلے میں سر عرشان کے آفس میں جاب کرتی تھی۔ فیملی پر اہم پر آفس چھوڑنا پڑا۔ میرے فیامی کو میرا جاب کرنا پسند نہیں تھا۔ بعد میں اس نے خود ہی منگنی توڑ دی۔ شکر ہے جان چھوٹی، سائیکو ٹائپ تھا۔ دوبارہ آفس جوائن کرنے گئی تو دیکھیں نہیں تھی۔ سر نے ولید کے آفس میں لکوا دیا۔ سسر کی شادی میں سر نے بہت ہیلپ کی۔ اگر کسی انسان کا ظاہر و باطن خوب صورت دیکھنا ہو تو سر عرشان کو دیکھ لو۔“ شازیہ پر پھر تعریف کا بھوت چڑھ گیا تھا۔

”ہیں واقعی.....“ عرشان ولی کے سامنے تالو سے لگے والی زبان چل رہی تھی۔
”نہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں۔“ شازیہ نے تیوری چڑھائی۔ آنسو کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”اتنا پڑ پڑ سر عرشان کے سامنے کیا کرونا جنہیں دیکھ کر زبان تالو سے لگ جاتی ہے۔“ اب کے شازیہ ہنسی تھی۔ آنسو نے اسے گھورتے چٹکی لی تھی۔

☆.....☆
”میں تمہاری کوئی بکو اس سننا نہیں چاہتی۔“ جمنی تیز تیز بولتی لاؤنج میں داخل ہوئی تھی۔ پیچھے پیچھے شاہ میر بھی تھا۔

”نہیں ضرورت کیا تھی وہاں تماشا کرنے کی۔“ شاہ میر تیز آواز میں کہتا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ ماہ پارہ نے اس نظر کو حیرانی سے دیکھا اور وہ بھی ان کے پیچھے لگیں۔

کمرے میں داخل ہو کر جینی نے اپنا بیگ گھسیٹ کے نکالا اور کپڑے سوٹ کیس میں ڈالنے لگی۔
 ”تم پاگل ہو گئی ہو جینی!“ شاہ میر شا کڈ کے عالم میں اس کی حرکت کو دیکھ رہا تھا۔
 ”تم اتنے کمرے ہوئے نکلو گے میں نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔“ جینی آنسو بہاتی دکھی تھی۔
 اسے حقیقتاً یہ سب دیکھ کر برا لگا تھا۔

”میں نے ایسا کر دیا۔ فریڈ تھی۔“ اس نے چڑ کے کہا۔
 ”وہ تو نظریہ آ رہا تھا فریڈ تھی یا کچھ اور۔“ جینی نے اسے نیکی چوتھوں سے گھورا۔
 ”ملازموں کے سامنے کیسا تماشا کرتے آئے ہو تم لوگ۔“ ماہ پارہ اندر داخل ہوئی تھیں۔
 ”اپنے بیٹے سے پوچھیں جسے ریٹورنٹ میں اس کی گرل فریڈ کے ساتھ پکڑا ہے۔“ جینی نے غصے سے کہا۔
 ”زیادہ کدو اس کرنے کی ضرورت نہیں ہے تم نے دیا کیا ہے ان پانچ سالوں میں، اولاد تک کی نعت سے
 محروم رکھا ہوا ہے تم نے۔“ شاہ میر آؤٹ آف کنٹرول ہونے لگا۔
 ”اس میں میرا تصور کیا ہے؟“ جینی کو اس کا طعنہ چابک کی طرح لگا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے شاہ میر کو
 دیکھ رہی تھی۔

”تو اور کس کا ہے، میں تو کہتی ہوں شاہ میر دوسری شادی کر لو، طلاق دواے، اس سے تمہیں اولاد کا سکھ
 نہیں ملنے والا۔“
 ماہ پارہ نے جلتی پہ تیل ڈالا۔ شاہ میر نے مزید کچھ کہنے سے پرہیز کیا۔ غصے میں دانستہ طور پر وہ جینی کی
 دکھتی رگ کو چھیڑ گیا تھا۔
 جینی وار ڈروب تک گئی تھی کچھ پیپر ز نکال کر ان تک آئی تھی۔

”یر ہیں میری رپورٹس جو پانچویں تم اپنے آپ کو چپک کرالو۔ کہیں کی تمہارے اندر نہ ہو۔“
 شدید اشتعال سے جینی نے رپورٹس شاہ میر کے منہ پر ماری تھیں۔ ایک یہ طعنہ اس کا جگر چٹائی کر رہا تھا
 آج تو شاہ میر بھی طعنہ دینے والوں میں شامل ہو گیا تھا۔ جینی آنسو بہاتی اسے دکھی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔
 شاہ میر شا کڈ کی کیفیت میں اپنے پیروں میں پڑے پیپر ز کو دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

”نور صاحبہ! آپ نے سلائی کے پیسے پہلے کچھ اور بتائے تھے اب اتنے کم دے رہی ہیں، یہ زیادتی
 ہے۔“

ہاجرہ بوتیک والی کو سمجھانے کی سعی کر رہی تھیں۔ پہلے کپڑے دیتے ہوئے نور نے زیادہ پیسے بتائے
 تھے۔ اچھی اجرت ملنے کی امید پر ہاجرہ نے کافی سارا کام لے لیا تھا۔ ان میں سے آدھا جی جان لگا کر وہ
 وقت سے پہلے مکمل بھی کر چکی تھیں کہ نام پر کام دیکھ کر بوتیک والی خوش ہو جائے گی اور جب وہ کپڑے لینے
 آئیں تو وقت سے پہلے اور صاف ستر کام دیکھ کر خوش بھی ہوں مگر جب انہوں نے سلائی کی ادائیگی کی تو
 کم معاوضہ دیکھ کر ہاجرہ نے انہیں یاد دلایا۔

”میں نے اتنے ہی بتائے تھے آپ کو سننے میں غلطی ہوئی ہوگی۔“ نور نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔
 ”ایسا کیسے ہو سکتا، جب مجھے یقین ہوا کہ محنت کے اچھے پیسے مل رہے ہیں تب تو میں اور میری بیٹیوں

نے جان مار کر سلائی کی اور پھر آپ نے ار جنت بھی سلوائے ہیں۔“ ہاجرہ ان کی غلط بیانی پر حیران تھیں۔ کس
 فرمائے سے وہ منہ پر جھوٹ بول رہی تھیں۔

”میں تو اتنے ہی دوس کی، کام کرتا ہے تو کریں۔ ورنہ محنت کرنے والوں کی کی نہیں ہے۔“ نور صاحبہ نے
 بے مروتی اور رکھائی کی انتہا کر دی تھی۔ ہاجرہ دکھی کی تصویر بن گئیں۔

”غریب کے ساتھ ہر کوئی زیادتی کرتا ہے مگر سکھ نہیں پاتا، برنس بچ پر چلتا ہے جھوٹ پر نہیں۔“ ہاجرہ کو
 اپنی بے بسی کا اندازہ تھا۔ وہ اس جھوٹی مکار عورت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھیں۔

”میں یہاں لپکھ رہی تھی۔ سلائی میں بھی فٹنگ نہیں۔“ ناندرا نہ نگاہوں سے کپڑوں کو دیکھتے نور
 نے کام میں نقص نکالنا شروع کر دیا۔ ہاجرہ نے لمبی سانس لی۔

”ٹھیک ہے آپ ان کے پیسے دیں اور باقی کپڑے لے جائیں، ہمیں آپ کا کام نہیں کرنا۔“
 ”جینی مرضی۔“ نور نے چند سو کے نوٹ نکال کر ہاجرہ کی ہتھیلی پر رکھے اور کپڑے اٹھا کر اپنے ڈرائیور
 کو پکڑانے لگیں۔

”جھوٹے لوگ!.....!“ ہاجرہ پریشانی سے نوٹوں کو دیکھ رہی تھیں۔
 ”گھر کا راشن لاتا ہے اور یہ.....“ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی تھیں۔ اس آس پر رات دن جاگ کے محنت کی تھی کہ
 گھر کا راشن آجائے گا مگر غریب جو سوچتا ہے وہ ہوتا کب ہے۔

☆.....☆

”تمہاری روز روز کی آمد کی وجہ آنسو تو نہیں؟“ عثمان ولی آج پھر آفس آیا بیٹھا تھا۔ ولید بیٹ فریڈ تھا
 وہ اس کے انداز سے اسے پہچان گیا تھا۔ جب ہی بلا جھجک سوال کر بیٹھا۔
 ”ہاں!“ اس نے بھی چھوٹے ہی اقرار کر لیا۔

”سیرئس ہو؟“ ولید اسے پرکھ رہا تھا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ عثمان ولی کھلی کتاب کی طرح اس
 کے سامنے تھا۔

”آج سے پہلے تم نے مجھے کسی لڑکی کے لیے اس طرح کی حرکت کرتے دیکھا؟“ عثمان نے الٹا سوال
 کر دیا۔ ولید نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

”تم اچھی طرح سوچ لو پھر آنسو سے بات کرو۔ وہ غریب گھرانے سے ہے۔ چڑ اسی باپ، لوگوں کے
 کپڑے سیتی ماں اور دو چھوٹی بہنیں ہیں۔ گھر کی کفالت کے لیے نوکری کر رہی ہے۔“ ولید نے اسے سچائی
 سے آگاہ کیا جو آنسو بتا چکی تھی۔

”کلاس کی کوئی پسند نہیں آ رہی تو زبردستی گلے میں گھنٹی تو باندھنے سے رہا۔ مجھے آنسو سے شادی کرنی ہے
 کلاس سے نہیں۔ مجھے جسم، ہم سفر کی تلاش تھی وہ آنسو پر آخر تم ہو گئی ہے۔ میں نے ابھی آنسو سے کوئی بات
 نہیں کی۔ سے لی وہ کہیں انجج ہو۔“ عثمان نے ہرج بھج پر سوچ لیا تھا اور ایسا سوچتے اس کا دل عجیب سے انداز
 میں دھڑکا تھا۔ اگر جوابیا ہوا تو اور وہ سر جھٹک رہا تھا۔

”بات تو درست ہے، یہ ابھن تو صرف آنسو ہی سلجھا سکتی ہیں۔“ پر سوچ انداز میں کہتے ولید نے انٹر کام اٹھایا۔
 ”ارے!.....!“ عثمان ولی جان گیا تھا وہ کیا کرنے لگا ہے مگر ولید نے جیسے اس کی کسی نہیں۔ اس نے جو

ٹھان لیا تھا اس پر عمل کرنے لگا۔

”آنسور آپ روم میں آئیں۔“

”بہت جلد باز ہو، زندگی میں پہلی بار اس قسم کی جوبیشن سے واسطہ پڑا ہے، بولنے کے لیے جملہ تو سوچ لینے دیتے۔“ عثمان ولی نے اسے گھورتے ہوئے اس کی جلد بازی پر صلوٰۃ میں سنائیں۔

”تو اظہار کرنے جا رہا ہے میرے بھائی، جنگ پر نہیں۔“ ولید کو اسے اس روپ میں دیکھ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ پیشانی پر انگلیاں چلاتے اس کی مسکراہٹ بے ساختہ تھی۔

”محبت اچھے اچھوں کو حواس باختہ کر دیتی ہے۔ سارے جملے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔“

پرسل Experience ہے۔“ ولید اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

”کم ان.....!“

”ریڈی.....!“ پہلا جملہ دروازے پر کھڑی آنسور سے کہتے لہجہ دھیمہ کر کے عثمان ولی کو شرارت سے دیکھا۔ عثمان ولی نے بعد میں بدلہ لینے کا اشارہ کیا۔ ولید محفوظ ہوا۔

”Yes sir!“ آنسور میز سے فاصلے پر آکھڑی ہوئی تھی۔ عثمان ولی نے بے ساختہ اس کی اور دیکھا تھا۔ اناری رنگ کے سوٹ میں وہ خود بھی اناری رنگ لیے ہوئے تھی۔ گواس کے کپڑے معمولی ہوتے تھے مگر کپڑوں کی قسمت جیسے خود جاگ جاتی تھی۔ جب وہ انہیں زیب تن کرتی تھی۔ کچر میں جکڑے آدھے بال باں میں ٹولڈر پر پڑے تھے۔ دوپٹا سیتے سے دونوں شانوں پر تھا۔

”بنتھیں۔“ ولید نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”یونو ہمارے آس میں کام کرنے والے تمام لوگ ایک فیملی ممبر کی طرح ہیں۔“ ولید نے تمہید باندھی۔

”جی سر! مجھے احساس ہے۔“ وہ صوب تھی۔ درپردہ اس تمہید کی وجہ ڈھونڈنے لگی تھی کہ اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کی پوریں ایک دوسرے سے دبائے عثمان ولی اسے ہی بغور دیکھ رہا تھا جو اس کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز کر رہی تھی۔

”عثمان ولی آپ سے کچھ پرسل باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے فیصلے میں اختیار ہیں۔ آپ کے فیصلے سے آپ کی جاب پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ ولید اپنی چیز سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گیا۔ آنسور نے تحیر سے عثمان ولی کو دیکھا کہ اسے مسلسل اپنی اور دیکھتے دیکھ کر اس کی پلکیں خود بہ خود جھپک گئیں۔ کچھ تھا اس کی گہری آنکھوں میں۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ آنسور کی ہتھیلیاں نم ہونے لگی تھیں۔ شہادت کی انگلی کو مروٹی، لب کھلتی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے۔

”آنسور میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری زندگی میں آنا چاہیں گی؟“ اٹنے ہاتھ کا مکہ بنا کر اس نے اپنے لبوں پر رکھ لیا تھا۔ کہنی گلاس پر تکی ہوئی تھی۔ نظریں آنسور پر مرکوز تھیں اور وہ خود بھی آنسور شاگڈی اسے دیکھتی رہ گئی۔

(جاری ہے)

”نہلی“

دروازے پر زور زور سے دستک ہوئی تھی۔ فخر عالم جو پلنگ پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کا نوالہ منہ میں جاتے جاتے رک گیا تھا۔ انہوں نے زور زور سے دستک دینے والے کو ذرا غصیلی نظروں سے دیکھا تھا جو کہ اب اندر آچکا تھا۔ سیدہ جو فخرنگ سے ٹھنڈے پانی کی بوتل لارہی تھیں۔ سامنے ستار آکھ کر مسکرانے لگیں۔

”ارے ستار کیا بوارک کیوں گئیں اندر آؤ کھانا کھاؤ۔“ سیدہ وہیں پلنگ کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔
 ستار جو فخر عالم کو دیکھ کر رک گئی تھی اگر پتا ہوتا کہ وہ گھر میں ہیں تو وہ کبھی یہاں کارخ نہیں کرتی۔ اس کے کارنگ اڑ چکا تھا۔
 ”نہیں خالہ پوادراصل میں نہلی کے پاس آئی تھی اور کھانا تو کھا کر ہی آئی ہوں۔“ ستار کے چہرے پر نف کے واضح رنگ سیدہ سے چھپے نہیں رہ سکے تھے۔ وہ جانتی تھیں اس کے ڈراور پچکا ہٹ کی وجہ۔
 ”ٹھیک ہے نیلما اندر ہے، تم اندر چلی جاؤ اس کے کمرے میں۔“
 ”جی خالہ!“

مکمل ناول



بدقسمتی کہ فخر عالم کی سخت گیر آواز نے اس کے قدموں کو زمین پر ہی جکڑ لیا۔
 ”دروازہ ذرا ہولے سے بجایا کر دیو کی چار سو گز کا بنگلہ نہیں ہے جو گھر والے میاؤں دور بیٹھے ہوں۔“
 ”جی فخر بھائی!“ اور پھر وہ تیزی سے اندر پہلی کے کمرے میں بھاگی تھی۔ ستارا کے اس طرح اندھا دھند بھاگنے پر وہ سگ کر رہ گیا۔

”بے وقوف۔“ اور پھر اپنا کھانا کھانے لگا تھا۔
 ”ارے بھئی! امت ڈانٹا کر دو دیکھا نہیں کیسے تمہیں دیکھ کر بیماری کے چرے کی ہوائیاں اڑ گئی تھیں۔“
 ”اماں! لڑکیوں کا اس طرح رہنا مجھے سخت ناپسند ہے۔ ابھی تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے پاگلوں کی طرح اندر بھاگی ہے۔ آرام سے بھی تو چلا جاسکتا ہے۔“

”اچھا چھوڑو! ان باتوں کو تم کھانا کھاؤ تمہیں اسنور سے دیر ہو رہی ہے۔“ سیدہ اس لمبی ہوتی بحث کو سہجائی ہوئی بولیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ فخر عالم کو زور سے ہنسی بولتی، چنچل سی لڑکیوں سے سخت چڑ ہے۔ جب کہ یہ ساری خوبیاں ستارا اور نیلما میں کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھیں۔
 ”ہائے اللہ جان بچی۔“ ستارا دھم سے نیلی کے پاس بیٹھی تھی۔ نیلما جو چائے پی رہی تھی۔ ستارا کے یوں اچانک بیٹھنے سے چائے جھلک کر اس کا ہاتھ جلا گئی تھی۔

”یادداشت کیا افتاد آ پڑی ہے۔“
 ”فخر سے بڑھ کر کوئی افتاد ہو سکتی ہے بھلا۔“
 ”ارے بار! تو تو تینا طرہا کرناں جب وہ گھر میں ہوں تو۔“
 ”اب مجھے کوئی الہام تھوڑی سی ہوا تھا کہ وہ گھر میں ہیں ورنہ سچی میں اس وقت تو تیرے گھر نہ آتی۔“
 ”ہاں وہ آج جلدی کھانا کھانے آگئے ہیں اور جب سے آئے ہیں میں بھی اپنے کمرے میں دبی بیٹھی ہوں۔“ اس نے ایک گرم چائے کا گھونٹ لیا۔

”اچھا تو یہ بتا خیریت تو ہے؟ کیوں آئی ہے؟“
 ”تو پہلے مجھے چائے پلا پھر بتاتی ہوں۔“ ستارا نے نیلی سے آدمی کپ چائے کی پیالی لے لی تھی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی۔

”اب پھوٹ بھی دے بلا وجہ کا تجس پھیلا رہی ہے۔“ نیلی نے کھورتے ہوئے کہا۔ ستارا نے چائے ختم کر کے خالی کپ پھیل پر رکھا۔

”آج اتوار بازار لگا ہے میں تجھے لینے لٹی ہوں بازار چلنے کے لیے۔“
 ”نابا باتا میں نہیں جارہی فخر بھائی گھر میں ہیں خوا خواہ ابھی ٹھیک ٹھاک لیکچر سننے کو مل جائے گا۔“ نیلی۔
 صاف انکار کیا۔

”ہاں تو ابھی کون چلنے کا بول رہا ہے۔ فخر بھائی جب اسنور چلے جائیں پھر چلتے ہیں۔“
 ”اور اتوار بازار سے خریدنا کیا ہے؟“

”راجہ نے آج اتوار بازار میں بیوٹری کا اسٹال لگایا ہے۔“
 ”اوہ اچھا ابھی میں بولوں اتنی آؤ تالی کیوں ہو رہی ہیں میڈم۔“
 ”اب پتا چل گیا تا تو چل جلدی سے تیار ہو جا۔“

”ستارا تو خود تو پھنسنے کی مجھے بھی پھنسنے کی۔ پتا نہیں تھے اس لو فر راجہ میں کیا نظر آتا ہے جو تجھے وہ اچھا لاتا ہے۔ سچی مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ نیلی نے برا سامنہ بنایا تھا۔

”محبت اندھی ہوتی ہے میری جان!“
 ”جی ہاں راجہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ تو واقعی پوری طرح اندھی ہو چکی ہے۔“
 ”اچھا اب زیادہ بکواس مت کر جلدی سے میرے ساتھ اتوار بازار چل راجہ میرا انتظار کر رہا ہو گا۔“
 ”کہاں جاتا ہے؟“ سیدہ کے کانوں میں ستارا کا بس ایک جملہ کانوں میں پڑا تھا۔
 ”وہ..... وہ..... خالہ۔“

ستارا اسٹپٹا کے رہ گئی اور یہی حال کچھ نیلی کی بھی تھی۔ کہیں انہوں نے کچھ سن تو نہیں لیا اگر سن لیا تو صحیح لی ثابت آ جاتی دونوں کی۔
 ”اماں! ستارا مجھے بازار چلنے کا بول رہی ہے۔ ہمارے گھر کے قریب میدان میں جو اتوار بازار لگا ہے نا وہاں سے اس کو کچھ سوٹ خریدنے ہیں۔“ نیلی نے بڑی مشکل سے بات سنبھالی تھی۔ ورنہ سنی تو اس کی بھی گم ہو گئی تھی۔

”ٹھیک ہے تو چلی جاؤ اس میں اتنا گھبرانے والی کیا بات ہے۔“
 ”خالہ وہ فخر بھائی!“ ستارا کو سب سے زیادہ خوف فخر عالم کا ہی تھا۔ کیوں کہ انہیں لڑکیوں کا بازاروں میں گھومنا سخت ذہر لگتا تھا۔

”فخر اسنور چلا گیا ہے بلکہ نیلما تم یوں کرو اپنے لیے بھی دولان کے سوٹ خرید لینا گرمیاں آگئی ہیں اور اس رمضان تو گرمیاں اپنے عروج پر ہوں گی۔“ سیدہ نے دراز سے اپنا دالٹ نکالا اور دو ہزار نکال کے نیلما کی طرف بڑھائے۔

”سچ اماں!“ خوشی کے مارے اس کی پانچھیں کھل اٹھیں۔ نیلما کو کپڑے بنانے کا بے حد شوق تھا۔ ایک سے ایک لان کے پرغڈ کاٹن کے کڑھائی والے سوٹ اس کی الماری میں بھرے پڑے تھے مگر یہ بھی اس کو کم لگتے تھے۔

وہ دونوں تیار ہو کر باہر نکل گئیں۔ نیلما کی بالکل بے اختیار نظر سامنے والے گھر کی جانب اٹھی تھی۔ وہاں دروازے پر کوئی لڑکا کھڑا تھا۔ اس کی نظریں بھی نیلی پر ہی پڑی تھیں۔ نیلی نے اپنی بڑی سی چادر مزید چہرے پر لٹائی تھی کہ اس کا آدھا چہرہ چھپ کر رہ گیا تھا۔

”ستارا!“

”ہاں۔“

”یہ سامنے فریڈ خالہ کے گھر میں کرائے دار آگئے ہیں کیا؟“
 ”ہاں سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ چلو اچھا ہے پوری کٹی ہماری پر رونق رہتی ہے سوائے فریڈ خالہ کے بچے کے پورشن کے۔ وہاں بھی اب رونق ہو جائے گی اگر فریڈ خالہ بے چاروں کو رکے دیں تو۔“
 ”ہاں یہ بھی ٹھیک کہتی ہے۔“ باتوں باتوں میں اتوار بازار آچکا تھا۔

☆.....☆

عرشان کو آئے ہوئے پورے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ ابھی تک تو اسے یہاں کوئی مسئلہ درپیش نہیں رہا تھا اور

پھر اسے یہاں کون سازندگی بھر رہا تھا۔ صرف ایک ماہ کی تو بات تھی۔ سی اے کے پیپرزدے گا اور پھر واپس کراچی چلا جائے گا۔ یہاں لاہور آنے کی سب سے بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سکون سے پیپرزد کی تیاری کرے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ کرنی الحال ایک ماہ تک اپنا سیل فون آف رکھے گا تاکہ کوئی اسے فون بھی نہ کر سکے۔ ایک کمرہ کرائے پر با آسانی مل گیا تھا کہ یہ تھوڑا سا ماہ صرف ایک ماہ کا ہی تو دینا تھا۔ وہ یہاں اپنے دوست کے جان پہچان والوں کے ہاں تھا۔ اسی لیے فریڈ خالہ نے بغیر کوئی سوال کیے اسے یہاں رہنے کی اجازت دی تھی اور پھر عرشان کی کون سی تاک جھانک کرنے کی عادت تھی۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا عرشان نہایت ہی سو پر اور سنجیدہ خوب صورت دُور و جاہت شخصیت کا مالک تھا۔ جسے اپنی پڑھائی کے علاوہ کوئی سرکار نہیں تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے پیپرزد کی تیاری کر چکا تھا تو سوچا تھوڑا ریٹ کر لے۔ باہرنگلی میں شاید کوئی بیس بیسے والا آیا تھا۔ عرشان کی بھوک جاگ اُٹھی۔ صبح چکی خالی ایک کپ چائے اور چند بسکٹ کھائے تھے۔ ”چلو عرشان ملک دوپہر کے لُچ میں آج بیس سے ہی گزارا کرتے ہیں۔“ عرشان ایک لمبی سانس کھینچتا ہوا پلنگ سے کھڑا ہوا۔ وہ باہر دروازے پر آیا مگر جب تک وہ ٹیلی والا چاچا تھا۔ سامنے سے دو لڑکیاں باہرنگلی تھیں۔ ان میں سے ایک لڑکی کی بالکل بے ساختہ نظر اسی کی جانب اٹھی تھی۔ اتفاق کے عرشان کی نظر بھی اسی چہرے پر ٹپک گئی تھی۔ سورج کی تیز تر شعاعوں کی روشنی سے اس کے میدے جیسی رنگت چمکی تھی۔ ان بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں گھبراہٹ کے رنگ ابھرے تو جلدی سے اس لڑکی نے اپنے سر پر چادر کو اپنی دو انگلیوں کی مدد سے آگے کو کھینچ لیا تھا اور دوسری لڑکی کے ساتھ آگے کو بڑھنے لگی تھی۔ جانے کیوں عرشان کی بے اختیاری نظروں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا اور جب عرشان کو اپنی اس بے اختیاری کا احساس جاگا تو وہ خفیف سا ہو گیا۔ خود کو لُسن طعن کرتا وہ واپس اندر چلا گیا تھا۔

☆.....☆

”نیلما! تیار ہو گئیں تو جلدی کر دیجھے اسٹور بھی کھولنا ہے۔“ فخر عالم نے اپنی کٹائی میں پینڈ وایج بانڈھی اور گھڑی میں ٹائم دیکھا جہاں پورے آٹھ بج چکے تھے۔ ”بس فخر بھائی آئی۔“ نیلی نے جلدی جلدی اسے بیگ میں لٹے سیدھے نوٹس ٹھونسنے اور باہر نکل آئی۔ ”ہزار دفعہ کہا ہے کہ پہلے سے ریڈی ہو جایا کرو مگر نہیں تم سنو جب تاہر روز پندرہ منٹ خود بھی لیٹ ہو جاتی ہو اور مجھے بھی دیر کروا دیتی ہو۔“

”سوری فخر بھائی! وہ منٹنائی۔“

”اچھا اب جلدی کرو۔“ فخر عالم باہر نکلا۔

”ارے ایک منٹ رو۔“ سیدہ تیزی سے بچن سے برآمد ہوئیں۔

”یہ لو پکڑو ناشتہ بھی جلدی جلدی میں تھوڑا سا پی کھایا ہے یہ کالج میں کھالیا۔“ سیدہ نے ریڈ کلر کالج بکس نیلما کو ہاتھ دیا۔ نیلما نے جلدی سے لُچ بکس اپنے بیگ میں ٹھونسا اور اپنی پیاری سی اماں کو پیار کرنی باہر نکل گئی۔

”اب ان میڈم کو جلدی سے بلاؤ۔“

”جی۔“ نیلما نے اپنے گھر کے برابر سے لگے ستارا کے گھر کا دروازہ بجایا۔ وہ ایک سیٹلڈ بھی ضائع کیے باہرنگلی تھی بلکہ وہ جیسے انتظار میں ہی آدھے گھنٹہ پہلے دروازے سے گویا لگ کر کھڑی تھی کہ نیلما اس کا دروازہ بجائے اور وہ باہر نکلے ورنہ فخر عالم کے غصے سے وہ اپنی طرح واقف تھی۔

نیلما اور ستارا کا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا تھا۔ دونوں ایک ہی عمر کی تھیں۔ اسکول سے کالج تک کا سفر انہوں نے ایک ساتھ طے کیا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی ہمراز تھیں۔ ایک دوسرے کی خوشی و غم میں شریک۔ انہوں گھرانوں میں آپس میں کبھی یاد نہیں پڑتا کہ معمولی سی بھی تو تو میں میں ہوئی ہوگی۔ سیدہ اور فرخندہ انہوں کی بہنیں تو نہیں مگر بہنوں سے بڑھ کر دونوں ایک دوسرے کو عزیز اور پیاری تھیں۔ سیدہ کے دو بچے فخر عالم اور نیلما تھے اور فرخندہ کی صرف ایک ہی بیٹی ستارا۔ نیلما، نیلی کا نام فرخندہ نے ہی رکھا تھا۔ اس کی نیلی بڑی نیلی آنکھوں کی وجہ سے میدہ جیسی سفید رنگت کھڑے نقوش معصوم سی بھولی بھالی نیلی آنکھوں والی لہما لہا لگتی تھی۔ جب کہ ستارا بھی پیارے سے نقوش والی ستاروں کی طرح چمکتی روشن آنکھوں والی سیدہ کے لیے بہت خاص تھی۔ سیدہ اور فرخندہ نے کبھی بھی ستارا اور نیلما میں کبھی کوئی فرق نہیں رکھا۔ فخر عالم لہما لہما لہما کی زندگی رنگت کا مالک کسی ریاست کے شہزادے سے کم نہیں تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد گھر کی سیدہ اور لہما کی ذمہ داری اسی کے کندھے پر تھی۔ جسے وہ نبھاتا تھا۔ نیلما اور ستارا دونوں کو وہ خود ہی اسکول سے کالج تک فخرنگ چھوڑنے اور لینے جاتا تھا۔ وہ کسی پر بھی رتی بھر بھروسہ نہیں کرتا تھا اور کبھی کبھی تو دونوں فخر عالم کی اس ذمہ داری سے چڑچڑا کر رہتی تھیں۔ رنج ہو جایا کرتی تھیں۔ فخر عالم کے بے انتہا غصے اور سنجیدہ طبیعت سے لہما اور ستارا دونوں ہی خائف رہتی تھیں۔ بہت سوچ سمجھ کر وہ فخر عالم کے آگے منہ کھولتی تھیں۔

”فخر بھائی!“

فخر عالم اسٹور پر بیٹھا ہاتھ میں ڈائری اور پین لیے اسٹور کا کوئی حساب کر رہا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔

”ہاں کو۔“

”فخر بھائی! یہ سامان کی لسٹ ہے آپ یہ نکال دیجیے میں ذرا آگے سے اپنا ایک کام اور منٹا کے آجاتا ہوں۔“

”اچھا ٹھیک ہے میں نکال دیتا ہوں۔“ فخر عالم نے لسٹ تھام لی تھی۔

”بھائی! ذرا چارائے، ایک ڈبل روٹی اور مکھن کی چھوٹی ڈیا تو دینا۔“ ایک خاتون اس دوران آئی تھیں۔

”جی بہن۔“ فخر عالم نے جلدی سے ان خاتون کو فارغ کیا۔

”سلام فخر صاحب! کیسے مزاج ہیں۔“

جھوٹا ہوا بڑا ایا چاہے خواہمیں ہی کیوں نہ ہوں سب فخر عالم کو عزت دیتے تھے اور فخر عالم کو بھی اگر ان لوگوں سے کوئی شکایت نہیں تھی تو گاہوں کو بھی فخر عالم سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ فخر عالم صاحب حساب کتاب میں بالکل گھرا تھا۔ بالکل خالص اور اور جینل سامان اپنے اسٹور میں رکھتا تھا۔ اسی لیے زیادہ تر گاہک فخر عالم کی نیک نیتی ایمانداری کی وجہ سے اس کے اسٹور سے چیزیں خریدتے تھے۔

”و علیکم السلام! الحمد للہ جاوید صاحب آپ سنائیے۔“ فخر عالم نے خوش اخلاقی سے ان سے ہاتھ ملایا تھا۔

”جی اللہ کا احسان ہے۔“

”اچھا فخر صاحب! ہم نے سنا ہے فریڈ خالہ نے اپنے نیچے والا پورشن کرائے پر دے دیا ہے۔“

”ساتو میں نے بھی ہے مگر زیادہ کچھ علم نہیں ہے۔“

”فریڈ خالہ نے ایک نوجوان چھڑے چھانٹ لڑکے کو کمرہ کرائے پر دیا ہے۔ ارے میں کہتا ہوں کیا

ضرورت تھی اگر کرائے پر دینا ہی تھا مگر تو کسی فیملی والے کو دیتیں اب جانے کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ آج کل تو دہشت گرد لوگوں کا گرد پ بھی چوری چھپے ادھر ادھر وارداتیں کرتا پھر رہا ہے۔ اب مجھے تو یہ بھی دہم ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا خواستہ سے لڑاکا کہیں سے چوری کر کے آیا ہو یا قتل و قتل کا سلسلہ ہو یا کسی گرد پ کا لڑاکا ہو کوئی واردات کر کے بھاگا ہو اور پولیس سے چھپتا پھر رہا ہو۔ بار خیر صاحب بہت سے ایسے شک و شبہات نے دل و دماغ میں گھر کر لیا ہے۔ آپ بتائیں اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

”جاوید صاحب! میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا اور آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے محلے کی خبر رکھنے کی کوئی عادت نہیں تھوڑا بہت چٹا چل جاتا ہے آپ کے ذریعے۔“ خیر عالم نے صاف لعلی کا برملا اظہار کر دیا تھا۔

”خبر رکھا کریں خیر صاحب ہمارے آپس پاس کیا ہو رہا ہے۔ ہمارے آس پڑوس میں کون آ جا رہا ہے۔ سب ہمارے علم میں ہونا چاہیے۔“

”میں معذرت خواہ ہوں جاوید صاحب! مگر یہ سب میرے مزاج کے خلاف ہے۔“ خیر عالم کو وہ لینے کی عادت سے سخت نفرت تھی۔ وہ تو بس اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ تھا مگر وہ بھی جانتا تھا کہ ہمارے متوسط طبقے میں یہ ساری باتیں یہ جرحیں ایک دوسرے کے گھروں میں تا تک جھماک کرنا محبوب مشغلہ تھا۔

”اسی اثناء میں جاوید صاحب کا فون بجنے لگا تو وہ چلے گئے۔

رات کو خیر عالم اپنا اسٹور بند کر کے گھر جانے لگا تھا۔ گھر کے قریب پہنچا کہ بلا ارادہ ہی نظر سامنے فریدہ خالہ کے گھر پر پڑی۔ قدم خود بخود فریدہ خالہ کے گھر کی جانب بڑھنے لگے۔ خیر عالم کی ہانک کی آواز بر اندر سے نیلی نے دروازہ کھول کر باہر بھاگنا مگر وہاں تو خیر عالم ندراد۔ سامنے نظر اٹھی تو خیر عالم کو فریدہ خالہ کے کرائے دار کے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ نیلما نے سوالیہ نظروں سے دیکھا اور پھر اندر واپس سیدہ کے پاس آئی۔

”اماں! خیر بھائی فریدہ خالہ کے کرائے دار کے کیوں گئے ہیں؟“

”اچھا پتا نہیں بیٹا، ہو سکتا ہے کوئی کام ہو۔ اچھا تم یوں کرو جلدی سے دسترخوان لگا لو اتنے میں خیر بھی آ جائے گا۔“ سیدہ نے نیلی سے دسترخوان اٹھا کے نیلما کو تھمایا۔ دس منٹ بعد خیر عالم بھی آ گیا تھا اور دسترخوان بھی لگ چکا تھا۔

”السلام علیکم!“

”ولیکم السلام! چلو خیر بیٹا جلدی سے آ جاؤ کھانا گرم ہے۔“ نیلما اور سیدہ دونوں دسترخوان پر بیٹھ چکی تھیں۔

”بس میں ہاتھ منہ دھو کر آتا ہوں۔“ خیر عالم واش بیسن کی جانب بڑھ گیا۔

”نیل! اچھی سی چائے بناؤ آج سر میں بہت درد ہو رہا ہے۔“ خیر عالم ڈرائنگ روم میں جاتے جاتے بولا تھا۔

”جی بھائی، ابھی بنا دیتی ہوں۔“ دسترخوان نیلما نے سیٹ لیا اتنی دیر میں نیلما نے برتن دھوئے تو چائے بھی تیار ہو گئی تھی۔ وہ تین کپ گرم چائے کے ڈرائنگ روم میں لے آئی تھی۔ ایک ایک کپ خیر عالم اور اماں کو دیا اور چائے کے لیے وہ سنگل صوفے پر بیٹھ گئی۔

”خیر بھائی تم فریدہ خالہ کے کرائے دار کے گئے تھے۔“ سیدہ نے بہت عام سے لب و لہجہ میں پوچھا تھا۔

”جی اماں! مرثیہ نام ہے۔ یہاں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں آیا ہے۔ وہ بھی صرف ایک مہینے کے لیے۔“

لڑائی میں رہتا ہے۔ مجھے تو کوئی خرابی نہیں لگی مرثیہ میں۔ لوگوں نے جانے کیوں اتنی افواہیں پھیلائی۔ لیکن مرثیہ کے خلاف۔“ خیر عالم نے گرم چائے کا ایک سپ لیا۔

”ٹھیک کہتے ہو ماشاء اللہ سے بہت نیک اور سعادت مند بچہ ہے۔ دوپہر کو مجھے دودھ منگوانا تھا میں نے ان بچے سے کہا۔ کہنے لگا اتنی میں وہیں آگے تک جا رہا ہوں لا دوں گا۔“ نیلما کا تو جیسے ایک ایک عضو امت بنا ہوا تھا۔ اس کے نیلے جمیل جیسی کالج پر مرثیہ کا کلس ابھرا تھا۔

”اس محلے کے لوگ بھی نہ بس ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔“ خیر عالم کی چائے ختم ہو چکی تھی۔ خالی کپ اس نے نیلی پر رکھا۔

”خیر ہمیں کسی سے کیا لینا دینا مرثیہ فریدہ خالہ کے جان پہچان کا لڑکا ہے اس لیے اکیلے اسے رکھا ہے۔ کمر اس کے جانے کے بعد وہ کسی فیملی کو ہی رکھیں گی۔“

”اماں مجھے بھی یہی بتا رہی تھیں فریدہ خالہ۔“

”اور تم سناؤ نیلی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“ خیر عالم نے اچانک ہی سوال کیا تھا کہ وہ گھبرا کر رہ گئی تھی۔

”جج..... جی خیر بھائی اچھی چل رہی ہے۔“

”گڈ! فرسٹ ایئر کی طرح فائل میں بھی مجھے تمہارا گریڈ اے دن ہی چاہیے۔“ نہایت سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

”کیوں نہیں انشاء اللہ میری بچی اتنی محنت کرتی ہے تو صلہ تو ملے گا ہی نا۔“ سیدہ نے جانثار نظروں سے نیلما کو دیکھا۔

”ہوں..... اچھا اماں آج میں بہت تھک گیا ہوں سونے جا رہا ہوں، شب بخیر۔“

”شب بخیر بیٹا!“ سیدہ نے خیر عالم کو سکراتی ہوئی اور نظر اتار کر نیلی سے دیکھا۔

”نیل بیٹا!“

”جی اماں!“

”جاؤ جا کر تیل لے آؤ میں تمہارے سر میں تیل ڈال دوں گی۔“

”جی اچھا۔“ وہ اپنی خالی پیالی اور خیر عالم، سیدہ کی خالی پیالی اٹھائے کچن میں چلی آئی۔

☆.....☆

ستارا اپنی دیوار سے لگی لکڑی کی سیزمی پر چڑھتی ہوئی سیدہ کے گھر میں جھانکنے لگی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا خیر عالم نہیں تھیں تھا جس کا مطلب تھا وہ اپنے کمرے میں سو گیا ہے۔ نظر کچن پر پڑی جہاں چار پائی بچھی لی تھی۔ جاوید کو خود کو پورا ڈھانچا ہے وہ سورہا تھا ہونہ ہو یہ یقیناً نیلی ہی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ رات کو اس کا انتظار کرے گی۔ دیوار پھلنگ کر آ جائے اور ستارا کو رات کے بارے میں کچھ خاص بھی بتاتا تھا۔

”نیل! نیلی!“ ستارا نے بہت آہستہ آواز میں اس کو پکارنا شروع کیا مگر وہ بھی شاید سارے گھوڑوں کا ابلبل بچ کر سو گئی تھی۔ اتنا پکارنے پر بھی نیلی کس سے من نہ ہوئی ستارا کو غصہ آ گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اسے اب کیا کرنا چاہیے۔ ستارے نے دیوار پر چڑھ کر جو چھلانگ پٹنگ پر لگائی تو سیدہ حائل کے اوپر ہی گری گئی۔

”یا دشت.....!“ خیر عالم نے چادر ہٹائی اپنے چہرے سے تو اپنے اوپر ستارا کو پایا اور جو ستارے نے خیر عالم کو دیکھا تو اس کا سانس رک گیا اب تو قیامت کا وقت تھا۔ اس نے چھلانگ بھی لگائی تو کس پر۔ چہرے پر

دروخوف کے سائے تیزی سے منزل لانے لگے تھے۔ ستاروں کی روشنیوں سے بھری آنکھوں میں اپنی موت نظر آنے لگی۔

”فخر بھائی!“ سوکے ہونٹوں پر یکپہی سی تھی مگر مقابل بھی کون تھا فخر عالم وہ خاموشی سے بس اس کو گھور رہا تھا۔ ستارا کو ایسا لگا جیسے ابھی ثابت سالم ہی نکل جائے گا۔ بہت ساری ہمت جمع کر کے وہ فخر کے اوپر سے اٹھنے لگی تھی کہ چادر پر ایک بار بھی انکا تودہ بارہا ہے وہ اس کے دستِ سینے پر گر گئی تھی۔

”سو..... سو..... ری..... فخر بھائی! وہ میں..... میں نیلی سے ملنے.....“ حلق سے گویا دل باہر نکلنے کو تھا۔

نوٹے پھوٹے لفظوں میں وہ اپنے آنے کا مقصد بتانے لگی تھی۔

”ایک منٹ۔“ وہ اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو فخر عالم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا اور نہایت احتیاط سے وہ نرم وجود خود سے الگ کیا۔

ستارے نے نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ اندھا دھند اندر نیلی کے کمرے میں بھاگی تھی۔ دل خوف سے بری طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد فخر عالم کے عنائی گداز لبوں پر مسکراہٹ کی ایک تحریر دم ہونے لگی تھی۔ دل کا اس طرح دھڑکنے کوئی اور ہی کہانی نہ بنا تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر اس کا خوف زدہ چہرہ گویا چپک کر رہ گیا تھا کہ اچانک ہی اس کی مسکراتی نظر فرش پر مڑے مڑے سفید سے گند پر پڑی۔ فخر عالم نے جھک کر وہ کاغذ اٹھا لیا، اسے کھولا تو خوشبو جو ناک کے تھنوں تک پہنچی تو دماغ پر لگی۔ اس سفید کاغذ پر لکھی تحریر کو جو پڑھنا شروع کیا تو آنکھوں کے سرخ ڈورے بہت واضح ہونے لگے تھے۔

”نیلی.....“ ستارا بھائی ہوئی جھٹ سے نیلما کے گلے سے لگی تھی۔ ستارا کے یوں گلے سے لگنے پر نیلی پریشان ہو گئی۔

”ستارا کیا ہوا سب خیریت تو ہے نا؟ میں کب سے تمہارا ویٹ کر رہی ہوں۔ ارے اب کچھ بولے گی بھی یا یوں ہی گلے گلے سسکیاں لیتی رہے گی۔“

”مت بوجھ نیلی آج میں نے بہت قریب سے اپنی موت دیکھی ہے۔“ اس کی نظروں میں فخر عالم کا سنجیدہ چہرہ ایک بار پھر ٹھوم گیا تھا۔

”کیوں ایسا کیا دیکھ لیا۔“ نیلما نے اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے اس کے گھبرائے چہرے کو دیکھا تھا اور پھر اس نے خود پر بیٹی روداد اس کو سنادی جسے سن کر جہاں نیلما کو ہنسی تو آئی بہت مگر پھر فکر مند ہوتے ہوئے بولی۔

”خود تو ڈانٹ کھانا سو کھانا مجھے بھی پھنساوے گی۔ اب دیکھنا صبح کتنا بڑا لنگر چرویں گے بھائی، ان کو سب پتا چل جائے گا کہ رات کو دونوں اس طرح ایک دوسرے کی دیوار پھلانگی ہیں۔“

”ہاں مگر ابھی تو سوچ ابھی میں کیا کروں۔ میں تو نہیں جاری باہر۔“ ستارے نے ڈرتے ہوئے کہا اور نیلما کے چنگ برہنہ ہو گئی۔

”تو ٹھیک ہے آج ہم دونوں جاگ کر خوب ساری باتیں کریں گے۔“ نیلما بھی خوش ہوتی اس کے برابر میں آ بیٹھی۔

”صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔“ مگر صبح کا سورج دونوں کے لیے خوب گرم ثابت ہوا۔ فخرندہ اور سیدہ نے اچھی خاصی کلاس لگی تھی دونوں کی، ستارا اور نیلما دونوں ہی سر کو جھکانے ڈانٹ ستی رہیں مگر جو سب سے حیران

ان بات تھی وہ یہ کہ فخر عالم کرسی پر بیٹھا بالکل خاموش تھا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ بلکہ ناشتہ کر کے اسٹور چلا گیا۔ آج ان دونوں کا کالج جانا بھی کینسل ہو گیا تھا۔ سارا دن دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ فخرندہ بھی سیدہ کے گھر پر ہی رہی تھیں۔

”پتہ نہیں کب عقل آئے گی دونوں کو۔“ فخرندہ نے ستارا اور نیلما کو دیکھا جو باورچی خانے میں تھیں نیکرونی بناری تھیں۔ ساتھ ساتھ کسی مذاق بھی جاری تھا۔

”مجھے تو ستارا کی زیادہ فکر ہے۔ نیلما سے زیادہ بچپنا کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے۔“

”ارے فخرندہ! پریشان مت ہو نہ ہی فکر مند جب اپنی عملی زندگی میں قدم رکھیں گی تو خود ہی عقل آ جائے گی۔“ سیدہ نے پیار بھری نظروں سے اپنی آگن کی ان دو بچکتی چڑیوں کو دیکھا۔

☆.....☆

”ستارا ایک بار پھر سوچ لے کہ کہیں ہم دونوں کی مشکل میں نہ پڑ جائیں۔“ نیلما نے ستارا کو خوف زدہ نظروں سے دیکھا تھا۔ چہرے پر ہزار ڈرو خوف کے رنگ منڈلا رہے تھے۔

”میں نے بہت سوچ مجھ کے فیصلہ کیا ہے نیلی میں واقعی رجبہ کے بغیر مر جاؤں گی اس نے کہا تھا کہ اس نے اپنا رشتہ بھیجا تھا مگر اماں نے منع کر دیا بلکہ جتنی سے ان لوگوں کو بے عزت کر کے گھر سے نکال دیا تھا۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے۔ ستارا لیکن اس مسئلہ کو ایک بار پھر بیٹھ کے سنجیدگی سے حل کیا جاسکتا ہے ہو سکتا۔“

”ناہمت کی کوئی راہ نکل آئے گھر سے بھاگنا کیا ٹھیک رہے گا۔“ نیلما کے دل و دماغ میں خطرے کی گھنٹیاں زور شور سے بگڑ رہی تھیں۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے بہت برا ہونے والا ہے۔

”نیلی اب تو جا..... راجہ وہ رہا۔“ ستارے نے دور سے ہی رجبہ کو دیکھ لیا تھا جو اس کو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔

”ستارا ایک بار پھر سوچ لے۔“ ہاتھ ہاتھ سے جھوٹ گیا تھا جو کہ نیلما نے ایک بار پھر تھام لیا۔

”اب سوچنے بجھنے کی ساری صلاحیتیں مفلوج ہو چکی ہیں نیلی، اللہ حافظ۔“ اور پھر نیلما سے ہاتھ چھڑایا اور رجبہ کی طرف بڑھ گئی۔ نیلی نے ایک آخری نظر ستارا کو دیکھا اور پھر دل کو سنبھالتی واپس قدموں کو موڑ گئی اسے شدت سے ایک بات کا احساس جاگا تھا کہ جو ہوا ہے غلط ہوا ہے اور اگر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو وہ شاید پتھر کی بن جائے گی۔

ستارا اور نیلما کالج سے جلدی نکل گئی تھیں۔ ستارے نے اپنی دوستی اور محبت کے واسطے دے کر اس کو زیر کر لیا تھا مگر کئی کے کو نے پرا کر اس کو یہ احساس بھی جاگا کہ فخرندہ خالہ کو کیا جواب دے گی۔ گھبراہٹ کے مارے وہ پوری پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ ایک تو آج سورج بھی پوری آب و تاب سے سر ہوش نکھیر رہا تھا۔ ایسا فسوس ہوا کہ ہر کوئی اسی کو دیکھ رہا ہے۔ پیچھے کچھ قدموں کی آواز پر اس کا دل مزید سبے جا رہا تھا۔ اپنے دروازے پر ایک دو عورتیں بھی کھڑی تھیں۔ جن کی نظر اسی پر تھی۔ جن سے وہ جلد از جلد بھاگ جانا چاہتی تھی۔ چھپ جانا چاہتی تھی مگر جب بد قسمتی دروازے پر کھڑی ہو تو ساری خوش قسمتی خوش نصیبی کے دروازے سے بند ہو جاتے ہیں۔ اس کے گھر کے دروازے پر بڑا سا تالا لگا اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس پر زور زور سے تھپتھپا لگا رہا تھا۔ اب کہاں جائے وہ فخرندہ خالہ کے جاتی ہے تو ایک ہزار سوال اس کو کٹھنرے میں کھڑا کر دیں گے۔ جائے پناہ کی کوئی تو جگہ ہو..... پیچھے پلٹ کر اگر دیکھی گئی تو مر جائے گی۔ اچانک اس کی نظر فریدہ خالہ کے گھر کی جانب گئی۔ کرائے دار کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ تیزی سے

عرشان کے پورٹن میں گھس گئی۔

”ارے یہ تو نیلی کی سیدہ بہن کی بیٹی۔“

”یہ تو فخر بھائی کی بہن ہے مگر یہ اس کرائے دار کے گھر میں کیوں گئی ہے اور یہاں تو کوئی لیڈ بڑ بھی نہیں رہتی۔“ علی میں بہت سے لوگوں نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اپنے اپنے دروازے پر کھڑی خواتین تو انکشت بدنداں ہو کر رہ گئیں تو پیچھے کچھ مرد حضرات جبرائلی کا پیکر بنے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔

”اچھا تو سیدہ بہن کے گھر میں تالا لگا ہے جس میں تو نیلما نے فائدہ اٹھالیا۔ چلو بھی جلدی چلو کہیں کوئی غلطی نہ کر لیں دونوں۔“ ایک مجمع لگ چکا تھا۔ مرد اور مکمل کی خواتین، عرشان کے دروازے پر اکٹھا ہو چکے تھے۔

”ارے حیراں! دیکھ فخر عالم تیرے بیٹے راجہ کو کیسے راتا ہوا لارہا ہے۔“ مکمل کی خواتین انجوائے منٹ سمجھ کر فریاد خالہ کے گھر کے پاس اکٹھا گئیں۔ انہی میں سے ایک عورت نے زور سے بولتے ہوئے کہا تھا۔

حیرا نے سخت جگر کو اس طرح پشیمان کیا کہ کہنے پر ہاتھ مارتی تیزی سے بھاگی۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم کیوں اس طرح میرے بیٹے کو مار رہے ہو۔“ حیرا نے فخر عالم کے شکبے سے راجہ کو چیل کی طرح چھینا تھا اور خود سے چٹا لیا تھا۔ اس کے منہ سے اور ناک سے خون کی لکیر بہہ رہی تھی۔

”پوچھیے اپنے سپوت سے کہ ستارا کو کہاں لے کر بھاگ رہا تھا۔“ فخر عالم کے چہرے پر زمانہ بھر کا غصہ تھا۔ حیرا نے راجہ کو پھر فخر عالم کے پیچھے جرموں کی طرح سر کو جھکائے روئی ہوئی ستارا کو دیکھا جس نے بڑی سی چادر میں خود کو چھپا رکھا تھا۔

”ارے اتنے ہی خدا فی جدار بنے پھرتے ہو ذرا خود اپنے گھر میں بھی جھانک کے دیکھو تمہاری بہن اس چلپلائی دھوپ میں اپنے ماں بھائی کی آنکھ میں دھول چھوٹ کر فریاد خالہ کے کرائے دار کے گھر میں اسکی کیا کر رہی ہے۔“ حیرا نے اپنے سخت جگر کا بہتا خون ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ گویا وہ زخمی شیرنی بن گئی تھی۔ جیسے کسی نے اس کو انگاروں پر ٹھیس لیا ہو۔

”اور وہ لڑکا گھر میں اکیلا رہتا ہے اور میرا بیٹا بھلا کیوں لے کر بھاگے گا، اسی ستارا کی بیٹی نے بھلایا پھلایا ہوگا۔ بھلا میرا معصوم بچہ کیوں ایسی بے ہودہ حرکتیں کرنے لگا۔“

”اماں تم ٹھیک کہتی ہو ستارا نے ہی مجھے کہا تھا کہ آؤ بھاگ چلیں۔“ راجہ نے صاف اپنا دامن بچایا تھا۔ فخر عالم نے نہایت محمور کر دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ بڑھانے لگا کہ اس کا گریبان پڑ کے زمین پر شیخ بچ کر مارے مگر حیرا نے اس کو پیچھے کر لیا۔

مکمل والوں کے ہاتھ گویا ایک مزے دار حامو موضوع گفتگو لگ گیا ایک تماشہ شور شراب۔

☆.....☆

”سیدہ دیکھ یہ دو پند کتنا خوب صورت ہے نا اس پر گوٹے اور کرن کا سارا کام میں نے اپنے ہاتھ سے کیا ہے۔“ فخر خندہ نے آرگنر انشوکا پورا دو پند پھیلایا۔

”ایسا ہی ایک سرخ دو پند میں نے نیلی کے لیے بھی بنایا ہے۔“

”فخر خندہ ماشاء اللہ بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ میں بہت جلد ستارا کو لے جاؤں گی بس یہ انٹر کا امتحان دے لے تو گھر میں شادیانے کی دھوکی رکھوں گی۔“ سیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ارے فخر خندہ یہ گلی میں اتنا شور شرابہ کیا ہے۔“ اچانک ہی جب شور شرابہ بیچ و پکار مچی تو دونوں کھڑی

ہو گئیں۔

”ہاں سیدہ اللہ رحم کرے چلو آؤ دیکھتے ہیں۔“

جب دروازے پر دونوں آئیں تو پوری گلی مرد عورتوں سے بھری پڑی تھی۔ فخر خندہ کی نظر ستارا پر پڑی ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ تیزی سے اس کے پاس آئیں۔ فخر عالم حیرا سے کیوں اس قدر اونچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ کچھ بے نیس پڑ رہا تھا۔ سیدہ بھی فخر خندہ کے پیچھے جانے لگی تھیں کہ مکمل کی ایک اور عورت سیدہ کا ہاتھ پکڑے۔

”نیلی کی بیٹی تو فریاد خالہ کے دروازے پر لے آئی تھی۔ نیلما کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کرے وہ اپنی جان بچانے کے خاطر آگئی لیکن جانے کہاں.....! وہ ایک جھوٹا سا کرہ تھا۔ جہاں ایک پلنگ اور کرسی

میز کے علاوہ کچھ نہیں رکھا تھا۔ ایک سفری بیگ تھا جو پیک تھا۔ میز پر کچھ کتابیں رجسٹر قلم وغیرہ رکھے تھے۔ پلنگ پر پر پل ٹکری شرت رکھی تھی۔ ہاتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آئی جس کا مطلب تھا کہ ان سب سامان کا مالک ہاتھ روم میں نہا رہا تھا۔ نیلما ایک سائیز دیوار سے جا لگی گلی میں چپل پہل ہو رہی تھی۔ سوچا یہ چپل

پہل کم ہو تو وہ یہاں سے نکل جائے گی۔ کوئی پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے۔ اس کو یہاں کھڑے کھڑے، گلی میں شور شرابہ چپل پہل کم کیا ہوئی مزید سے مزید چیخ پکار بڑھ ہی گیا تھا۔ نیلما کا تودل ہی بیٹھا جا رہا تھا۔

ہاتھ خندہ سے ہو گئے تو دونوں پاؤں شل ہونے کے ساتھ ساتھ کپکپا بھی رہے تھے۔ دل تو جیسے ابھی پسلیوں سے نکل کر باہر آ جائے گا۔ نیلی بھیل آبشار کی طرح بہنے لگے تھے یہ احساس جلد ہی ہو گیا کہ وہ اب بھس بھس چکی ہے۔

”یا میرے رب میری مدد کر۔“ نیلما نے سر جھٹ کی طرف اٹھا کے رب سے مدد طلب کی۔ اسی اثناء میں عرشان بھی ہاتھ روم سے نکل کر باہر آ گیا تھا۔ گلی میں جب اس قدر چیخ و پکار ہوئی تو عرشان کے کان میں بھی پڑی مگر وہ کندھے اچکا کر رہ گیا مگر جب نہادھو کر باہر نکلا تو مجمع معنوں میں الجھ کر رہ گیا بالکل سانسے ہی دیوار سے لگی اس انجان سی لڑکی کو دیکھا جو زار و قطار رو رہی تھی۔

”ایکسکوزی۔“ عرشان کی سجدہ آواز پر نیلما نے نظر اٹھا کے دیکھا تو جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ عرشان نے بلیک جینز کے علاوہ اپنے کسرتی وجود پر اور کچھ نہیں ڈالا ہوا تھا۔ نہانے کی وجہ سے بالوں سے

بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ عرشان نے وہ سارے گیلے بال دونوں ہاتھوں سے پیچھے کیے تھے۔

”کیا میں جان سکتا ہوں آپ کون ہیں اور یہاں میرے روم میں کیا کر رہی ہیں؟“ عرشان کے چہرے پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

”نیلی.....!“

اچانک ہی سیدہ اور فریاد خالہ اندر داخل ہوئی تھیں۔ نیلما نے سیدہ کا چہرہ دیکھا تو بھاگ کر ان کے گلے سے لگی اور سینے سے لگ کر بلک بلک کر رو دی تھی۔

”عرشان یہ سب کیا ہے؟“

”فریاد خالہ نے مشکوک نظروں سے اس کو دیکھا اور ان نظروں میں جولا تعدا سوالات تھے۔ عرشان صبح معنوں میں چکر اکر رہ گیا تھا۔ وہ کوئی ٹین ایئر لڑکا تو نہیں تھا کہ فریاد خالہ کی آنکھوں کے سوالات اور سیدہ کے چہرے پر لکھی تحریر اور سب سے بڑھ کر سیدہ کے سینے میں چھپی روئی بلکتی نیلی کا رونا نہیں سمجھ سکتا۔ کیا

مطلب لے وہ اس بات کا، کیا نیلما نے جان کر اس کو چھینسا ہے یا بات اور کچھ ہے۔

سیدہ، نیلما کو خود سے لگائے عرشان کے گھر سے باہر نکلی تھیں مگر فریدہ خالہ، عرشان کو چھوڑنے والی نہیں تھیں۔

”تمہارے بارے میں میرے بیٹے حمزہ نے سب کچھ بتایا ہوا ہے کراچی میں میرا بھتیجا بھی فون پر تمہارے بارے میں سب کچھ بتا چکا ہے۔ تمہارے کردار کے بارے میں مجھے رتی بھر شک و شبہ نہیں مگر یہ جو سب نظریں دیکھ رہی ہیں ان میں کیا سچائی ہے وہ سب تم مجھے سچ بتانا کیونکہ نیلما اور اس کے گھر والوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ لوگ ایک شریف اور عزت دار سلکھے ہوئے لوگ ہیں۔ نیلما کو میں اپنی بیٹی کی طرح ہی سمجھتی ہوں میں نے بھی اس کے کردار میں کوئی جھول کوئی خرابی نہیں دیکھی۔ وہ بچی میرے سامنے کی بچی ہے۔“

”پلیز آئی آپ نے جو دیکھا، جو سمجھا وہ سب ایک غلط فہمی کے علاوہ کچھ نہیں۔ ان میں کوئی حقیقت کوئی سچائی نہیں ہے۔ میں خود نہیں جانتا یہ سب کیا ہے۔“

رش ختم ہو چکا تھا سب اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے مگر کچھ عورتیں حیران کے گھر میں اکٹھی ہوئی تھیں اور خوب مروج مسالہ لے کر بحثا رہی تھیں۔ حمزہ لے رہی تھیں سب کی زبانوں پر دو نام تھے۔ ”نیلما اور ستارا“ یہ ٹاپک تو جانے کتنا عرصہ چلے، کئی دنوں تک لوگ اس واقعے کو دہرائیں گے۔ جب تک اور کوئی ٹاپک اور کوئی واقعہ رونما نہیں ہو جاتا۔

”چنانچہ.....!“ نہایت زور سے فخر عالم نے نیلما کے منہ پر چھڑا رہا تھا کہ وہ نیچے فرش پر گر پڑی۔

”فخر اصل بات کیا ہے وہ بتاؤ یقین کر دو راہرا اس کا قصور ہوا تو میں خود تمہارے سامنے اس کا گلا گھونٹا کے مار دوں گی یا زہر دے کر مار دوں گی۔ زندہ درگور کر دوں گی۔“ سیدہ نے طیش میں فرش پر پڑی نیلما کو گھورا تھا۔

”یہ دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دے رہی تھیں۔ آج اگر میں بروقت ریلوے اسٹیشن نہ پہنچتا تو رتبہ ستارا کو لے کر نہ جانے کہاں لے جا چکا ہوتا۔ رتبہ کوئی شریف قسم کا لڑکا نہیں ہے ایک آوارہ مفت قسم کا لڑکا ہے جو کچھ وہ ستارا کے ساتھ کرتا وہ مجھے بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے اس سے آگے میں اور کچھ نہیں کہہ سکتا ستارا کے لیے۔“ فخر عالم نے فرخندہ کے برابر میں بیٹھی روٹی سسکتی سر کو جھکائے ستارا کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔

”فخر بیٹا! اگر تم اس کو وہ ہیں چلتی ٹرین کے آگے دھکا بھی دے دیتے تو خدا کی قسم میں اف نہیں کرتی تم نے بہت غلط کیا اس کو یہاں میرے پاس واپس لا کر۔“ فرخندہ نے آنسو بھری آنکھوں سے فخر عالم کو دیکھا۔ ”کاش کے یہ پیدا ہوتے ہی مر جاتی مجھے میں اتنی بدناماتی بے عزتی تو نہ اٹھانی پڑتی سرتو دور، نظر اٹھا کر چلنے کے قابل تک نہیں رکھا ان دنوں نے۔“ فرخندہ، سیدہ ایک دوسرے کا سہارا تھیں۔ دونوں ہی اس بے عزتی پر تڑپ کر رہ گئیں۔ فخر عالم نے سرد سانس لیا اور ستارا نیلما کو گھورتے ہوئے اندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆.....☆

عرشان کے پاس دوسرے دن فرخندہ، سیدہ اور فریدہ خالہ چلی آئیں۔

عرشان جو اپنا بیگ پیک کر چکا تھا اس کو آئے پورا ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ اس کے پیپر ز ختم ہو گئے تھے۔ اب کراچی آئے مگر جانے کی تیاری کی۔ بیگ کی زپ بند کیے وہ سفری بیگ اٹھائے باہر نکلے گا تھا کہ ان تینوں کو اچانک گھر میں آتا دیکھ کر وہ نہ بھی کے عالم میں دیکھنے لگا۔

”بیٹا عرشان یہ سیدہ ہے نیلی کی امی۔“ فریدہ خالہ نے تعارف کرایا اور پھر اپنے یہاں آنے کا مدعا بھی پیش کیا۔

”جی.....“ وہ شاکر نہ کیا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے فریدہ آئی آپ جانتی ہیں اس میں میرا رتی بھر بھی قصور نہیں ہے۔“

”بیٹا تصور تو ہمارا بھی نہیں ہے مگر پھر بھی ہماری بچی کی ذات پر انگلیاں اٹھانی جارہی ہیں۔“ فرخندہ نے التجائی نظروں سے دیکھا تھا۔

تینوں نے مل کر بہت منت سماجت کی تھی مگر عرشان کسی طور نیلما سے نکاح پر رضامند نہیں تھا۔ بالآخر بہت سوچ بچار کے بعد بہت اللہ رسول کے واسطے دیے ہاتھ جوڑ دیے مگر عرشان کی ”نہ“ ”ہاں“ میں نہیں بدلی تھی۔

سیدہ نے اپنے سر پر اوڑھنی چادر اتار کے عرشان کے قدموں میں ڈال دی اور خود بھی اس کے قدموں میں بیٹھ گئیں۔

”ارے ارے آئی خدا کے لیے ایسا مت کیجیے کیوں مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔ آپ بالکل میری ممانی طرح ہیں میرے لیے قابل عزت و احترام والی ہستی ہیں۔“ عرشان نے فوراً سے پیشتر سیدہ کو اٹھایا اور ان کی چادر ان کے اوپر ڈال دی۔

تو پھر اپنی ممانی کے صدقے ہی میری نیلی کو اپنا لودر نہ لوگ میری بچی کا چنا حرام کر دیں گے کوئی اس کو اپنی زندگی میں شامل کرنا پسند نہیں کرے گا۔ آپ کو آپ کے چاہنے والے کا واسطہ دیتی ہوں۔ میری نیلی سے نکاح کر لیں اسے اس دوزخ سے نکال کر لے جائیں۔ انجانے اور نادانستی میں بہت بڑی غلطی نیلی سے سرزد ہو گئی ہے۔“

سیدہ ہلکے ہلکے کر رہی تھیں، تڑپ رہی تھیں۔ عرشان کا نرم و ملائم دل یہ سب دیکھ نہیں سکا اس سے زیادہ دیر برداشت نہیں ہوا۔ اس نے اپنا سفری بیگ اپنے کندھے اتارا اور فریدہ خالہ کے پاس چلتا ہوا آگیا۔

”میں اس نکاح کے لیے تیار ہوں۔“

عرشان کی رضامندی جیسے جسم میں ایک نئی روح پھونک گئی تھی۔ کانوں میں خوشی کے شادیا نے سے بجنے لگے تھے۔

کوئی ایک گھنٹہ کی کارروائی تھی نیلما، عرشان کے نکاح میں آگئی تھی۔

”جیتے رہو بیٹا! آپ نے جو مجھ پر احسان کیا ہے وہ میں مر کر بھی نہیں چکا سکتی۔“ سیدہ نے عرشان کو تشکرانہ نظروں سے دیکھا تھا مگر عرشان نے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ اس کو اب جلد از جلد کراچی پہنچنا تھا۔ اپنے گھر ایہوں کے پاس۔ اس لمحے وہ جتنا بچھتا تا تم تھا۔ اس کا لاہور آنے کا فیصلہ اس کے لیے نہایت بھاری پڑ گیا تھا۔ نیلما عرشان کے ساتھ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہو رہی تھی کہ تڑپتی ہوئی واپس سیدہ کے گلے سے لگی تھی۔ ان کی جدائی کا درد جسم کے ہر عضو سے عیاں تھا۔ باپ کی طرح چاہنے والا بھائی اس سے سخت باراض تھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں۔ یہ غم پہ درو جانے اور کتنا اٹھا پڑے۔ جان سے عزیز ہمارا ز نوشی و دم دکھ دیکھ کی ساسھی بہن جیسی دوست اس سے مل نہیں سکی تھی۔ وہ ان سب کے بغیر اکیلی انجان لوگوں میں کیسے رہ پائے گی۔

”ہاں تو کچھ غلط ٹھوڑی تھا۔ ہمارا جو کچھ بھی ہے اتنے بڑے پیانے پر پھیلا بزنس آپ دونوں بھائیوں کا
 ہی تو ہے۔“

”ہاں چاہے اس عرصے میں آپ کی ماما کی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔“

”مافی جاچو.....“ تین سالہ ارمان بھاگتا ہوا عرشان کے پیروں سے لگا تھا۔

’السلام علیکم ساریہ بھابی۔“ عرثان نے ساریہ کو مسکراتی نظروں سے دیکھا۔

’جی سار یہ بھابی دونوں شوق پورے ہو گئے۔‘

”تو کیسا رہا تجربہ۔“

تو محترم عثمان ملک فیصلہ بھی تو آپ کا تھا ہم سے دور جانے کا۔“ پیچھے سے شہیر کی آواز ابھری تھی۔

عمرشان!“عالمہ کی پکار پر عمرشان شہیر سے الگ ہوا تھا۔

جی مہا!۔

یہ لڑکی کون ہے؟“

وہشت!

”مما یہ نیلما ہیں۔“ عثمان نے پیدا کی لکڑی بڑی سی چادر میں لپی لڑکی کا تعارف کرایا تھا۔ ساریہ اور شہبیر کی نظر بھی سر کو توجہ دے جھکائے نیلما پر تھی۔

رداؤں کی جست 49 جولائی 2017ء

”اور ایک بات۔“ فخر عالم کھڑا ہو گیا تھا۔ واپس پلٹا اور جھک کر ان ستاروں بھری آنکھوں میں جھانکا جہاں اب نہ وہ پہلے جیسی چمک دکھائی دیتی تھی اس کا عکس۔

وہاں سے ہٹا چلا گیا تھا۔
کتنی بڑی گالی دے رہا تھا وہ..... کہ خود اس کو اپنے وجود سے کھن آ رہی تھی۔ اپنے ہی وجود سے غلامت محسوس ہو رہی تھی۔ یہ جو ہار سنگھار کیا تھا ہاتھوں میں چوڑیاں پاؤں میں پائل تھیں پر بندیا مجموعہ گلے میں ہاریہ زیورات جو اس کے جسم پر سجائے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ بہت سے سانپ پتھور ہر پلے کڑے کوڑے اس کے جسم پر چنے ہوئے تھے اس کے ساموں میں رینگ رہے ہوں دیمک کی طرح اس کو نوچ رہے ہوں، کھارے ہوں۔

لگا رہے ہوں۔ ستارے روتے ہوئے ایک ایک زلیخہ خود سے نوج نوج کر دوڑ پھینکا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ فخری کڑوی سچائی نے اس کو کتنی ہی گہری کھائی میں دفن کر دیا تھا۔ اپنی وقعت اپنا مقام اپنی حیثیت اس نے اپنے ہاتھوں سے گنوا دی تھی۔ اپنی عزت و آبرو اپنی سوانحیت پر خود اس نے اپنے ہاتھوں سے داغ لگا دیے تھے۔ فخر عالم نے اس کو اس کی اوقات دکھا دی تھی۔ وہ جگہ دکھا دی تھی جو اس کی تھی۔ دل تو دور فخر عالم نے تو اپنے قدموں میں بھی اس کو جگہ نہیں دی تھی۔ یہ پوری سیاہ رات اس کے نصیب کو بھی سیاہ کرتی چلی گئی تھی۔ وہ پوری رات اس نے ماتم کرتے گزاردی تھی۔

☆.....☆

”السلام علیکم!“ عرثمان کی یکدم سے آتی آواز پر عالمہ ملک نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”عرشمان میری جان! عالمہ ملک صوفی سے انھیں اور تیزی سے عرشمان کی جانب بڑھیں۔“

“ما!”

عرشان نے اسے دونوں بازو پھیلا دیے جس میں عالمیہ ملک سائیں۔

”کیسے ہو میری جان! کہاں تھے اس طرح بھی بھلا کوئی غائب ہوتا ہے۔ کتنے دن میں نے ٹرپ ٹرپ کر

ارے ہیں کچھ اندازہ بھی ہے۔“

”آئی تو مہما! آئی نو..... بٹ آپ تو جانتی تھیں ناکہ میں سی اے کے پیپرزدوں کا جس کے لیے مجھے ہر

ثابت نہیں ہو جاتا ان کو جیل میں ہی رکھیں گے۔ وہاں لاہور میں فخر عالم کا کوئی اپنا رشتہ دار نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں یہ ایکلی ہیں تو فخر عالم نے ہی مجھ سے بہت ریکوریٹ کی کہ کچھ دنوں تک میں ان کو کراچی اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاؤں فخر عالم جیسے ہی رہا ہوتے ہیں وہ فوراً سے بیشتر اپنی بہن کو لے جائیں گے۔“ جو کچھ اس نے سوچا وہ سب کہہ ڈالا تھا۔ میں گھڑت کہانی آرام آرام سے ان لوگوں کے گوش گزار کر دی۔

”مہا کیا میں نے کچھ غلط کیا؟“ عریشان نے عالمہ سے سوال کیا۔
 ”نہیں میرے چاند تم نے بالکل کچھ غلط نہیں کیا جو کیا نیکی کے لیے کیا۔ مجھے بہت خوشی ہے بلکہ یہ یہاں جب تک جا رہے ہو سکتی ہیں۔ ہمیں کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ عالمہ ملک کے چہرے پر نیلما کے لیے خاص پسندیدگی کے رنگ تھے۔

”کیوں ساریہ تم کیا کہتی ہو؟“ عالمہ ملک نے ساریہ کو دیکھا۔
 ”مما آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں ہمیں قبول ہے۔ اچھا ہے عریشان کی نیکی میں ہم بھی کچھ حصے دار بن جائیں۔“ ساریہ نے خوش دلی سے کہتے ہوئے نیلما کو دیکھا۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ ساریہ نے نیلما کو مخاطب کیا تھا۔
 ”جی نیلما.....!“ نیلما نے انہی نیلی نیلی آنکھیں اور برکواٹھائی تھیں۔
 ”ارے ساریہ یہ بالکل نیلی آنکھوں والی گز یا نہیں لگ رہی۔“ کھنیری پلکوں کی باڑاٹھائے گرانے پر وہ بالکل کا کچ کی نیلی آنکھوں والی ڈول ہی لگ رہی تھی۔ جس کا عالمہ ملک نے بلا جھجک اعتراف کر دیا تھا۔

”ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ ممّا۔“ ساریہ نے بھی مسکرا کے نیلما کو دیکھا تھا۔
 ”یار آپ کو کچھ اندازہ ہے میں یہاں کتنی دیر سے کھڑا ہوں۔“ عریشان نیلی آنکھوں والی ڈول کے ٹاپک سے اب پور ہونے لگا تھا۔ بلکہ شدید کوفت کا شکار ہونے لگا تھا۔ وہ جلد از جلد اپنے فیورٹ بیڈروم میں جانا چاہتا تھا۔

”ہاں یار کافی ٹائم ہو گیا تم یوں کرو اپنے بیڈروم میں جا کر آرام کرو رات کے ڈنر میں ڈیو سمیت ملاقات ہوگی۔“ شہمیر نے عریشان کے کندھے پر ہاتھ مارا تھا۔
 ”ساریہ یوں کرو میرے برابر والا جو روم ہے وہ کھلوادو وہاں نیلما رہ لیں گی۔“
 ”جی ممّا! میں ابھی نوری سے کہہ کر تھوڑی بہت صفائی کروا دیتی ہوں۔“ ساریہ مسکراتی ہوئی نوری کو بلانے چلی گئی۔

”آؤ بیٹا! تم یہاں آؤ جب تک میرے ساتھ.....!“ عالمہ ملک نے نیلما کی موی مگلا بی کلائی تھامی اور اپنے ساتھ ہال میں لے آئیں۔

☆.....☆

صبح معمول سے ہٹ کر تھی۔ گھر میں خاموشی سنانے کا ہر طرف راج تھا اور یہ ہی خاموشی اور سنا سنا سارا کے اندر گھر کر چکا تھا جس سے شاید مرنے کے بعد ہی جھنکارا مل سکتا تھا۔ پرانا محلہ پرانا گھر بے شک وہ لوگ چھوڑ چکے تھے مگر وہ تکلیف دہ باتیں وہ کاٹ دارز ہریلی نظریں وہ دل میں تیر کی طرح بیوست یادیں ہمیشہ اس کا پیچھے کرتی رہیں گی۔
 پوری رات تو دیے بھی اس نے روتے جاتے گزاردی تھی۔ آکھ بھی لگی تو جب اللہ رب العزت سے اپنے

گناہوں کی معافی کا وقت جا چکا تھا۔ صبح فجر کی اذانوں میں اس کی آنکھ کٹی تھی۔ اس وقت بھی صبح ساڑھے دس بجے اس کی آنکھ کٹی تھی۔ کمرے میں ایک طائرانہ نظر ڈالی تو کمرہ خالی اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ فخر عالم بیڈروم میں نہیں تھا۔ شاید وہ اسٹور جا چکا تھا۔ وہ کمرے سے باہر آئی۔ سامنے ہی تخت پر سیدہ اور فرخندہ بھی مڑ پھیل رہی تھیں۔

”السلام علیکم!“ ستارہ نے آہستگی سے سلام کیا تھا۔
 ”والسلام علیکم صبحتی رہو خوش رہو صدا سہاگن رہو۔“ سیدہ نے مڑ پھوڑے اور اٹھ کر ستارہ کو گلے سے لگا کر اس کی پیشانی پر بیاہ کیا۔ جب کہ فرخندہ نے بری طرح اس کو نظر انداز کیا اور اٹھ کر وہاں سے اندر اپنے کمرے میں چلی آئیں۔ یہ منظر ستارہ کی ستارہ جیسی آنکھوں میں دکھ کے آنسو بھر گیا تھا۔ اپنی ذات مزید زمین کی گہرائیوں میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ دل خون کے آنسو روئے لگا تھا۔ ستارہ کی نظروں کے ارتکاز پر سیدہ نے بھی دیکھا تھا۔ تخت پر اب وہاں فرخندہ نہیں تھیں۔ جس کا مطلب وہ ستارہ کو دیکھتے ہی اندر چلی گئی تھیں ان کی ناراضی بھی اپنی جگہ درست تھی مگر سیدہ نے بہت سمجھایا فرخندہ کسی طور ستارہ کو معاف کرنے کے حق میں نہیں تھیں۔

”فکرت کرو انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا بہت جلد۔ تمہاری امی ابھی تم سے ناراض ہیں۔ غصے میں ہیں مگر بہت جلد سب بھول بھال کے تمہیں گلے سے لگائیں گی۔ ماں اپنی اولاد سے زیادہ دن تک ناراض نہیں رہ سکتی۔ وقتی غصہ ہے تم زیادہ پریشان مت ہو۔“ سیدہ نے بہت پیار سے ستارہ کو سمجھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی پیشانی پر بیاہ کیا تھا۔

F ”امی مجھ سے جائز ناراض ہیں۔ سیدہ خالہ میں نے غلطی نہیں بہت بڑا گناہ کیا ہے ان کا اعتبار توڑا ہے ان کے بھروسے ان کے اعتماد کا کل کیا ہے۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔“ ان ستاروں بھری آنکھوں سے چند منی ٹوٹ کر رخسار پر پکھرتے چلے گئے تھے۔

”دعا کرو میری جان! اچھا یہ بتاؤ رات فخر نے تو کچھ نہیں کہا۔“ سیدہ ایک ماں تھیں انہوں نے ستارہ کے چہرے پر بہت کچھ کھوج لیا تھا۔ ایک رات کی دہن کے چہرے سے وہ قوس و قزح کے ساتوں چمکتے دیکھتے رنگ مفقود تھے جو ہونے چاہئیں بلکہ ستارہ کا بابا یاں رخسار کچھ سرخ ہو رہا تھا۔ جسے ستارہ نے بڑی مہارت سے میک اپ سے چھپا لیا تھا۔

”ستارہ!۔۔۔!“
 ”جی۔۔۔۔۔!“ ستارہ بری طرح چونک کر رہ گئی۔ اس کی سوچوں کے سارے دھاگے رات کی کہانی میں الجھ چکے تھے۔ فخر عالم کا چہرہ اتنی زور سے نہیں لگا تھا جتنا اس کے لفظوں نے اس کا وجود چھلنی کر دیا تھا۔ اس کی روح پر ایسی ضرب لگائی کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی بے سکونی رہے گی۔ سوچوں کا تسلسل جانے اور تسنی گہرائی تک پہنچتا کہ سیدہ کی آواز نے حال کی دنیا میں بچ لیا۔

”کیا بات ہے چہرے پر یہ ادا سی کیوں ہے۔ آنکھوں میں یہ ویرانی کیوں ہے۔۔۔۔۔ مجھے اپنی ستارہ پہلے والی چاہیے ویسی ہی ہنسی ٹھٹھکیلائی رونق نکھیرنی آنکھوں میں ستاروں کی مانند روشنی چمک لانی۔“
 ”آپ کو نیلی یاد نہیں آتی؟“ ستارہ کے اچانک پوچھے گئے سوال پر سیدہ خاموش ہو کر رہ گئیں۔ حالانکہ اس نے تو کوئی غلطی بھی نہیں کی تھی۔ کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی قصور وار ٹھہرائی گئی۔ پھر اتنی بڑی سزا کیوں

ملی اسے۔۔۔۔۔ سیدہ خالہ یہ میری لگائی ہوئی آگ تھی جس میں نیلی بیماری بھی لپیٹ میں آگئی میں تو آپ لوگوں کی نظروں کے سامنے ہوں مگر نیلی کو جدائی کی یہ کٹھن سزا کیوں دی گئیوں اپنے آپ سے دور کر دیا۔“ سیدہ نے اب بھی کچھ نہیں کہا سوائے خاموشی سے دیکھنے کے۔

”دیکھو گیارہ بج گئے ہیں میں تمہارے لیے ناشتہ بنا کے لاتی ہوں۔“ سیدہ مکمل طور پر اس کی باتوں کو نظر انداز کیے جن کی جانب بڑھ گئیں۔

”سیدہ خالہ یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“ ستارہ نے سیدہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سیدہ نے پیچھے پلٹ کر اپنا ہاتھ ستارہ کے ہاتھ میں دیکھا پھر ستارہ کو دیکھنے لگیں۔

”تم بیٹھو میں ناشتہ لا رہی ہوں۔“ سیدہ نے ستارہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے آرام سے ہٹایا اور آگے گئیں۔ ستارہ نے نہایت دکھ سے جاتی ہوئی سیدہ کو دیکھا۔

☆.....☆

”ٹھک ٹھک ٹھک۔“ دروازے پر ہولے سے دستک دی گئی تھی۔ اگر جناب کی اجازت ہو تو کیا میں اندر آ سکتی ہوں۔“ عرشان جو لپٹاپ پر کوئی کام کر رہا تھا۔ کا ہی مہندی آنکھوں کو لپٹاپ کی اسکرین سے ہٹا کر دروازے کی جانب دیکھا۔

”اوہ ہائے رخسار اندر آؤ۔“ عرشان نے لپٹاپ آف کر دیا۔ سائیڈ میں رکھ کے کھڑا ہو گیا تھا۔ رخسار اندر داخل ہو گئی اس کے چہرے پر ناراضی اور نفی کے واضح رنگ تھے۔

”چلو شکرت کو میرا نام تو یاد رہا ورنہ میں بھی مجھے بھولنے کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی تمہارے ذہن کی ish اسکرین سے مٹ چکا ہے۔“ ناراضی سے بولتی ہوئی وہ اندر داخل ہوئی۔
 ”ارے یار تم تو سمجھا کر دو۔“

”جی میں سمجھا کروں مگر بندے کو کم از کم اتنا بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے کہ ایک کال یا ٹیکسٹ ہی کر دیا جائے مگر کال یا ٹیکسٹ تو دور محترم نے فون تک آف کر دیا تھا۔ وہ بھی پورا ایک مہینہ۔“ شکایتوں کا پورا انبار کھول دیا تھا۔

”او کے او کے بابا لگتا ہے مگر میں سب سے زیادہ تم ہی ناراض ہو۔“
 ”کیوں نہیں ہونا چاہیے؟“ الٹا سوال داغا تھا۔ عرشان نے مسکرا کے سر نیچے جھکا لیا اور سر جھکانے لگا۔

”ٹھک ہے اب بتاؤ ناراضی دور کرنے کے لیے کیا کیا جائے۔“
 ”غلطی کی ہے تو سزا بھی ملے گی اور سزا یہ ہے کہ آج کا سارا وقت تم میرے ساتھ گزار دو گے۔“
 ”او کے ڈن میں اپنی اچھی دوست کو منانے کے لیے یہ تو کر ہی سکتا ہوں۔“ عرشان آگے بڑھا اور رخسار سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا جیسے رخسار نے تمام لیا تھا۔

”ارے واہ وہم تو سمجھے تھے خدا خواست یہاں بہت بڑی جنگ چھڑ گئی ہوگی، کمرے کی ہر شے جس نہیں دوچکی ہوگی مگر صبح تو جلدی ہی ہو گئی۔“

سارے دو گلاس جوس کے لاتی تھیں۔
 ”جی نہیں ساریہ بھابی میری دوست بہت اچھی ہے۔ مجھ سے زیادہ دیر ناراض نہیں رہ سکتی۔“ عرشان نے خیر انداز میں اس کو دیکھا تھا۔

”جیسی تو تم میری چھوٹی سی بہن کی اس خوبی کا فائدہ اٹھاتے ہو۔“ ساریہ نے چاہ سے اپنی چھوٹی بہن رخسار کو دیکھا۔

”ساریہ بھائی رخسار آپ کی بہن بعد میں اور میری بیسٹ فرینڈ پہلے ہے۔“ عثمان نے ٹرے سے اورنگ جوس کا گلاس اٹھا لیا تھا اور دوسرا گلاس اٹھا کے رخسار کو تھمایا۔

”اچھا یہ بتاؤ کہ آج کیا ایجنڈا بنایا جائے۔“

”ساریہ آپ آج کا پورا دن ہم نے پلان کر لیا ہے لچ اور ڈنر ہم باہر ہی کریں گے۔“ رخسار نے خوشی خوشی بتایا۔

”زبردست یہی تو کیا آپ لوگوں میں کسی تیسرے فرد کی گنجائش نکلتی ہے۔“ ساریہ کا اشارہ خود اپنی جانب تھا۔

”بالکل بھی نہیں۔“ رخسار نے صاف انکار کیا اور خالی گلاس واپس ٹرے میں رکھ دیا۔ ”عثمان نے بھی جوس ختم کر کے خالی گلاس ٹرے میں رکھا جو ساریہ کے ہاتھ میں تھی۔

”کبھی یہ مسئلہ اب آپ دونوں بہنیں حل کریں میری طرف سے تو کھلی آفر ہے کہ آپ ہمیں جوائن کر سکتی ہیں۔“

”جی نہیں مجھے کباب میں ہڈی بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“ ساریہ نے عثمان کو جواب دیا۔ عثمان ہولے سے ہنس دیا۔

”میں تیار ہو جاؤں پھر نکلتے ہیں۔“ عثمان نے اپنی وارڈروب سے اپنی بیگرن شدہ جینز اور ریڈی ٹی شرٹ نکالی اور ڈریسنگ روم میں گھس گیا۔

رخسار کی نظریں ڈریسنگ روم کے دروازے پر ٹپک گئی تھیں جہاں ابھی عثمان گیا تھا۔ ساریہ نے اس کی نظروں کے چلتے دیکھ لیے تھے۔

”بہت جلد انشاء اللہ تم عثمان سمیت اس بیڈ روم کی ہر شے کی غیر شراکت مالک ہوگی۔“ ساریہ نے رخسار کے گال پر ہاتھ پھیرا۔ رخسار نے ساریہ کو دیکھا۔

”جی.....!“

”بالکل جی..... کل ہی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ ہم بہت جلد رخسار کو یہاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لے آئیں گے تاکہ عثمان کے ٹیل ڈال جائے۔“

”اوہ ساریہ آپ آج نہیں جانتیں آپ نے مجھے کتنی بڑی خوشی دی ہے۔“ رخسار ساریہ کے گلے سے لگی تھی۔ چہرے پر خوشی کے لاکھوں رنگ کھل اٹھے تھے۔

”میں سب جانتی ہوں تمہاری دیوانگی اور محبت سے واقف ہوں۔“

”چلو بھئی آئی ایم ریڈی۔“ اسی اثناء میں فل تیار عثمان ڈریسنگ روم سے نکل آیا۔

”جاؤ۔“ ساریہ نے ان کے ساتھ کی ڈیوڑھیوں دعا میں دی تھیں۔

☆.....☆

”یہ لو میں تمہارے لیے کچھ کپڑے خرید کے لائی ہوں۔ تم پر اچھے لگیں گے لو بہن کے دیکھو ناپ وغیرہ تو سب ٹھیک ہے نا۔“ ساریہ نے بہت سے شاپنگ بیگز نیلما کو تھما دیے۔

”آپ نے اتنے بہت سے خرید لیے میرے لیے تو سہیل سے ہی بہت ہیں۔“ نیلما کو یہ سب اچھا نہیں لگا تھا۔

”نیلما بالکل تکلف مت کر دوں گے تمہیں اس گھر کی بنی سبھا ہی نہیں مانا بھی ہے۔ اس لیے بلا جھجک تم ماما سے باجھ سے کچھ شیز کر سکتی ہو۔ کسی شے کی ضرورت ہو تو ماما کی تکلف کے ہم سے کہہ سکتی ہو۔“ ساریہ نے نرمی سے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ کو تھمایا تھا۔ ان چند دنوں میں نیلما اسے بہت اچھی لگی تھی۔ معصوم سی بھولی بھالی۔ چالاکی اور ہوشیاری تو نام کو نہیں تھی بلکہ اس نے نوٹ کیا تھا کہ وہ کچھ گھبرائی گھبرائی اور سبھی سبھی سی رہتی ہے ہر وقت۔ عام لڑکیوں جیسی بات ہی نہیں تھی۔ نیلی جمیل جیسی آنکھوں میں ایک درد تھا خوف تھا جسے وہ لاکھ چہپانے پر بھی چھپائیں پائی تھی۔ عائد ملک نے کہا تھا کہ ”ساریہ تم پتا کرو آخر اس بیاری سی چھوٹی سی بچی کو کیا دکھ ہے۔ شاید اپنے بھائی کا دکھ ہو۔“

ساریہ کے لائے ہوئے ڈیوڑھی سوٹ میں سے اس نے ایک خوب صورت قیمتی سوٹ نکال کر پہن لیا تھا۔ بلیو اور فیروزہ کی کاٹن انیمیر ایڈری سوٹ میں اس کی رنگت کھل اٹھی تھی۔ نیلما اس وقت ساریہ اور عائد ملک کے ساتھ ہال میں بیٹھی لی دی دیکھ رہی تھی۔ سر پر سلیپ سے دوپٹا اوڑھے وہ ان لوگوں کے سچ بیٹھی خود کو ان فٹ محسوس کر رہی تھی مگر ساریہ کی ڈانٹ پر وہ یہاں بیٹھی تھی۔

”ہیلو گائیز۔“ کیف کی آمد پر ساریہ نے مڑ کے دیکھا۔

”ارے کیف تم کیسے ہو؟“

”بالکل ٹھیک تم سناؤ کیسی ہو۔“

”ٹھیک۔“ وہ مسکرا دی بھائی کے آنے پر وہ خوشی سے پھولے نہیں ساری تھی۔

”السلام علیکم آئی!“ کیف نے سر کو خم کیا۔

”جیتے رہو کیسے ہو۔“ عائد ملک نے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔

کیف کی نظر صوفے کے ایک کونے میں کھڑی سی نیلما پر پڑی۔

”کیا میں جان سکتا ہوں۔ آسان سے یہ پری آپ کے گلے میں کب اتری ہے؟“ کیف کو نیلما پہلی ہی نظر میں اٹریکٹ کر گئی تھی۔

”بھئی یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ تسلی سے بتاؤں گی۔ پہلے یہ بتاؤں کہ اس بار کتنے دن کے لیے آئے ہو۔“

”ایک دو ماہ کے لیے سوچا ہے کہ رمضان اور عید کر کے جاؤں گا۔“ کیف نیلما کے بالکل سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

”یہ تو بہت اچھی خبر ہے اب ہم تمہاری شادی کر کے ہی تمہیں تمہاری دلہن کے ساتھ دینی رخصت کریں گے۔“ ساریہ نے محبت سے بھائی کو دیکھا۔

”اوہ کیف مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میرا خیال ہے مجھے بھی اب سنجیدگی سے اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔“

کیف کی مسلسل نظریں گھبرائی سی نیلما پر تھیں۔

”ارے کیف بھائی آپ۔“ اس دوران رخسار اور عثمان بھی اندر داخل ہوئے تھے۔ رخسار تو تقریباً ہمارے ہوئے کیف کے پاس آئی تھی۔ کیف نے کمرے ہو کر رخسار کو خود سے لگایا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔

”اور سناؤ عریشان کیا چل رہا ہے سب؟“
 ”فائن۔“ عریشان بھی کیف سے بے فکر ہوا تھا۔

”نیللی بیٹا.....!“

”جی آئی!“ نیلما نے بڑی مشکل سے اپنی بڑی بڑی جھیل جیسی نیلی آنکھیں اوپر اٹھائی تھیں۔
 ”ارے کیا انہوں نے بیولینس لگائے ہوئے ہیں۔ بہت خوب صورت شیڈ ہے آپ کے لینس کا۔“
 کیف کو یکدم بے ساختہ تعریف پر عریشان کی نظریں اب پڑیں تھیں نیلما پر۔ نیلما گھبرا کر رہ گئی۔
 ”نیللی۔“ عریشان نے پکارا تھا۔ نیلما نے عریشان کی طرف دیکھا۔
 ”تمہارے بھائی کی کال آئی تھی وہ تم سے بات کرنا چاہ رہے ہیں تم اپنے کمرے میں جاؤ میں کال ملا کر لا رہا ہوں فون۔“

”جی بہتر۔“ وہ اس مشکل سے چمٹکا رہا تھا جیسا کہ عریشان نے اس کو نکال لیا تھا مگر جو اس نے کہا تو جیسے دل خوشی کے مارے دھڑک اٹھا وہ اس وقت شدت سے اپنی کوئی تیار کر رہی تھی۔
 ”تم یہاں بھی تو بات کر سکتے تھے۔ عریشان بلا وجہ نیلی کو کمرے میں بھیج دیا۔“ رخسار کو کچھ خاص اچھا نہیں لگا تھا نیلما پر عریشان کی یوں اہمیت جتنا۔

”ہو سکتا ہے کوئی خاص بات کرنی ہو چھا ہے نا بے جادہ جی پر بڑا ترس آتا ہے۔ اپنیوں سے دور یہاں ان کی یاد میں روتی رہتی ہے۔“ عالمک ملک نے عریشان کی تائید کی تھی۔
 عریشان مزید کچھ بولے وہاں سے کھڑا ہو گیا تھا۔ چہرے کے یہ رنگ بالکل الگ تھے جو صرف رخسار نے ہی نوٹ کیے تھے۔

نیلما اپنے روم میں بے مبری سے عریشان کا ویٹ کر رہی تھی۔ وہ فخر عالم سے بات کرانے کا کہہ رہا تھا۔
 مطلب فخر عالم نے اس کو معاف کر دیا تھا۔ ایک گونہ سا سکون مل رہا تھا۔ دل کو کہہ دے سیدہ اور فخر عالم سے بات کرے گی وہ اپنی ہی گہری سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ عریشان کے اندر آنے کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ عریشان نے نہایت جارحانہ انداز میں اس کا نازک بازو تھام لیا اور اپنی سست کھینچا تھا۔ وہ ٹھہری نازک اندام سی کسی گڑیا کی طرح اس کے پہاڑ جیسے وجود سے بری طرح ٹکرائی تھی۔

”آج کے بعد میں تمہیں نہ دیکھوں کہ تم کیف کے سامنے بھی آئی ہو بالفرض اگر یہاں کیف آتا بھی ہے تو تم اپنے کمرے میں ہی رہو گی۔“ ان کا ہی مہندی آنکھوں میں شعلوں کی پھینکا رکھی جس سے نیلما کو اپنا چہرہ ہی نہیں اپنا پورا وجود بھی جھلٹا ہوا محسوس ہوا تھا۔

”انڈراشینڈ۔“ مگر نیلما نے کچھ نہیں کہا اس کے دونوں بازوؤں کو نہایت ہی جارحانہ طریقے سے عریشان نے پکڑا ہوا تھا کہ تکلیف کی شدت سے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

”میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ عریشان کی گرفت پر مزید سختی کہ نیلما کراہ کر رہ گئی تھی۔
 ”جی.....“ سچ معنوں میں وہ عریشان کے اس روپ اس غصے سے ڈر رہی تھی۔ عریشان نے اس کے چہرے کو تیز نظروں سے دیکھا اور ایک جھٹکے سے خود سے الگ کرنا ہوا کرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے نیلی جھیل آنکھوں سے گرم گرم سیال بہہ کر اپنا مقام کھوتے چلے گئے تھے۔ وہ بیڈ پر بیٹھی سسک اٹھی تھی۔ عریشان کے رویے اس کے اس انداز لب و لہجے نے اس کو بہت چوٹ پہنچائی تھی۔

”فخر بھائی یہ کیا کیا آپ نے میرے ساتھ بہت ظلم کیا ہے آپ لوگوں نے مجھ پر میری نادانستگی میں کی گئی غلطی کی اتنی بڑی اور ٹھن سزا۔“ نیلما اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپائے بلک بلک کر رو رہی تھی۔

☆.....☆

ستار نے رات کے کھانے پر فخر عالم کی فیورٹ ڈش بنائی تھی۔ فخر عالم کو منٹن پلاؤ اور چکن کے شامی کیباب بہت پسند تھے اور میٹھے میں سویوں کا زردہ۔ ستار نے اپنی یہ زندگی دل و جان سے قبول کر لی تھی۔ وہ نادم تھی۔ شرمندہ تھی۔ اپنی غلطی اپنے عین گناہ پر پشیمان تھی۔ یہ شاید اس کی ماں کی کوئی دعا کوئی نیکی کوئی عادت ہی تھی کہ وہ غلط باتوں میں جانے سے بچ گئی تھی۔ کسی کے غلط ارادوں کی بھیبت چڑھنے سے بچ گئی مگر فخر عالم واقعی بہت بلند اور عظیم ہستی تھا جس نے سب کچھ جانتے بوجھتے اس کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اپنی زندگی میں شامل کر کے اپنا شریک سفر بھی بنایا۔ وہ فخر عالم کو مانا لینا چاہتی تھی۔ اپنی اسی کو مانا لینا چاہتی تھی جو اس سے سخت ناراض تھیں خفا تھیں۔

”بیٹا ستار! کھانا تیار ہو گیا؟ فخر بھی آ گیا ہے۔“ سیدہ بکن میں چلی آئی تھیں۔

”جی سیدہ خالہ کھانا تیار ہے بس میں دسترخوان لگا رہی ہوں۔“

”وہ میں لگا لوں گی تم یوں کرو جاؤ دیکھو فخر کو کسی شے کی ضرورت نہ ہو۔“ سیدہ زیادہ سے زیادہ وقت دونوں کو ایک ساتھ دینا چاہتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ فخر عالم ناراض ہے ستار سے مگر ستار اچھا ناٹم فخر عالم کو دے گی اس کی ناراضی دھکی آئی ہی کم ہوگی۔

”سیدہ خالہ وہ..... وہ.....“ سوچا تو بہت کچھ جاسکتا ہے مگر عمل کرنے میں جان پر بن آئی بہت مشکل sh ہے۔ فخر عالم کا سامنا کرنے میں۔

”کوئی میں..... وہ..... نہیں جاؤ شاباش بیٹا اپنی زندگی سہل اور پرسکون کرنا چاہتی ہو تو زیادہ سے زیادہ وقت فخر کو دو۔ وہ دل کا برا نہیں ہے بس ذرا تم سے ناراض ہے مگر تم اس کو مناؤ گی تو وہ مان جائے گا..... چلو جاؤ.....“ ستار امرتی نہ کرتی مصداق اپنے بیڈ روم میں آئی تھی۔ فخر عالم ابھی ابھی نہا کر نکلا تھا گیلے بالوں کو تولیہ سے خشک کر رہا تھا اس کے لیے چوڑے جسم پر بلیوٹراؤزر کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ ستار نے جھجک کر لمبی خم دار پلکوں کی باڑ عارض پر گرائی تھیں۔ فخر عالم کی روشنی سیاہ نظریں ستار پر پڑیں اس کی جھجک وہ سمجھ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ اس کی خمدار پلکوں کا لرزنا دیکھتا رہا وہ چہرہ تھا جسے اس نے بچپن سے اپنے دل میں بسایا تھا۔ جس کی ہر لمحہ ہر بل پر سنش کی بھی پوجا کی تھی۔ وہ اس کی محبت اس کا عشق اس کا جنون تھا۔

جانے دل نے کیا حکایات ہوئے سے سناٹی کہ وہ دھیرے دھیرے اس کے بہت پاس آ گیا تھا۔ ستار کا دل بری طرح دھڑکا تھا اس کے یوں قریب آنے پر وہ بری طرح گھبرا کر رہ گئی تھی۔ فخر عالم نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی پر اپنی انگشت شہادت رکھی اور چہرہ اوپر کو اٹھایا تھا۔ سیاہ آنکھیں ان ستاروں بھری آنکھوں میں گاڑھ دیں۔ جہاں وہ اپنا عکس واضح طور پر دیکھ سکتا تھا مگر ان ستاروں بھری آنکھوں میں وہ روشنی نہیں تھی جو وہ بچپن سے دیکھتا رہا تھا۔ دل باغی ہو رہا تھا اس کا ہاتھ کوئی خوب صورت جسامت کرنے کے لیے اس کے گلابی لرزتے ہونٹوں پر ایک تحریر رقم کرنے کے لیے..... وہ کوئی فرشتہ نہیں تھا ایک انسان تھا جس کے سینے میں دل تھا جو صرف ستار کے نام پر دھڑکتا تھا اور اپنی ان دھڑکتی دھڑکنوں کی آواز اس کے دل تک پہنچانے کے لیے وہ اس کے چہرے پر جھٹکا چلا گیا تھا۔

ستاراج معنوں میں شپٹا کے رہ گئی تھی اس کو امید نہیں تھی کہ فخر عالم اچانک سے گستاخوں کا حملہ کر دے گا۔ وہ پوری کی پوری بیسنے میں شرابور ہو کر رہ گئی تھی۔ فخر عالم نے اپنا چہرہ ستارا کے گھبرائے شرمائے چہرے سے اور اٹھایا تھا اور جو گلیا تو لیا اس نے اپنے چوڑے شانے پر ڈال رکھا تھا وہ تو لیا ستارا کے چہرے پر ڈال دیا تھا اور مسکراتا ہوا ڈیرنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

شیشے میں اس کا عکس دیکھنے لگا وہ جھجکتی شرماتی بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی تو کبھی اپنے ماتھے پر آتی چھوٹی چھوٹی بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑتی۔

دستر خوان پر فرخندہ کے علاوہ وہ تینوں بیٹھ چکے تھے۔
 ”اماں فرخندہ خالہ کھانا نہیں کھائیں گی۔“ فخر عالم کو فرخندہ کی غیر موجودگی بہت محسوس ہوئی تھی۔ ”میں نے بہت کہا مگر وہ منع کر رہی ہیں کہہ رہی ہیں ابھی بھوک نہیں ہے بعد میں کھاؤں گی۔“ اب بھلا وہ کیا بتائیں کہ ستارا کی وجہ سے وہ یہاں نہیں آنا چاہتی ہیں۔

”نہیں یہ تو غلط بات ہے۔ آپ ریکیے میں فرخندہ خالہ کو لے کر آتیا ہوں۔“ فخر عالم دستر خوان سے اٹھا اور فرخندہ کے کمرے میں جا گیا تھا۔ ستارا نے سر کو جھکا لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیوں نہیں آ رہی ہیں دستر خوان پر۔ آج چونکہ جمعہ تھا اس لیے فخر عالم اسنور جلدی بند کر دیا کرتا تھا تو دستر خوان پر وہ تھا۔ ورنہ تو سیدہ اور ستارا ایک ساتھ کھانا کھاتیں اور فرخندہ کا کھانا سیدہ کمرے میں ہی لے جا کر کرتی تھیں۔ اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ کمرے سے باہر نہیں آئیں گی مگر اس کی سوچ غلط ثابت ہوئی۔ فخر عالم فرخندہ کو اپنے ساتھ لے ہی آیا تھا۔ فرخندہ، سیدہ کے برابر میں بیٹھی تھیں۔ ستارا کے دل کو تھوڑا سکون میسر آیا تھا۔ اس نے سالن کی ڈش اٹھا کر فرخندہ کی جانب بڑھا دی تھی۔ جسے انہوں نے بری طرح نظر انداز کرتے ہوئے کباب کی ٹرے اٹھا لی تھی۔ یہ منظر نہ تو فخر عالم سے چھپا رہا اور نہ سیدہ کی آنکھوں سے۔ ستارا کا دل چھوٹا سا ہو گیا تھا۔ سیدہ نے اس کا دل رکھنے کے لیے سالن کی ڈش تمام لی تھی۔

”لاؤ ذرا پیچھے تو چکھاؤ کیسا بنا ہے سالن۔“

”اہم اہم ہم، ہم، بہت مزے کا بنا ہے۔“ سیدہ نے ایک لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”لو فخر تم بھی لو ستارا نے بہت مزے کا بنایا ہے سالن۔“ فرخندہ نے پھر بھی نظر اٹھا کے نہیں دیکھا۔ ستارا ادا سی سے مسکرا دی تھی۔ رات کو جب وہ کچن کے سارے کام سے فارغ ہو کر بیڈروم میں آئی تو فخر عالم نیم دراز بیک کراؤن سے ٹیک لگائے موبائل میں کچھ دیکھ رہا تھا۔ ستارا تو سچی وہ سو گیا ہو گا اور اصل مقصد بھی ستارا کا بیڈروم میں دیر سے آنے کا یہی تھا کہ وہ فی الحال فخر عالم کی نظروں کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ شام کی بے باکی نے اس کا دل سہا دیا تھا۔ دھڑکا دیا تھا۔ وہ فخر عالم کے اس روپ کے لیے تیار نہیں تھی۔ ستارا نے کن آنکھوں سے فخر عالم کو دیکھا تھا۔ اس کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ دل کو سنبھالتی وہ اپنا ہلکا سالان کا سوٹ لیے وائٹ روم میں آگئی تھی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو فخر عالم کروٹ بدل کر سو چکا تھا۔ ستارا نے سکھ کا سانس لیا اور بیڈ کے دوسرے کونے پر سوٹ کر لیٹ گئی اس سے پہلے کہ وہ آنکھیں بند کرتی فخر عالم نے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑا اور اپنی جانب کھینچ لیا تھا اور اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی فخر عالم کی مضبوط آہنی ہاتھیں اس کے گردنا مگر اصرار کھینچ چکی تھیں۔ اس کی بے بسی فخر عالم کی مضبوط آہنی ہاتھوں میں دم توڑ چکی تھی۔

☆.....☆

مالک ملک عرشان کے بیڈروم میں آئی تھیں۔ عرشان کی صبح دوپہر کے گیارہ بجے ہوئی تھی۔ وہ فریش ہو کر ٹیبل کے سامنے کھڑا تھا۔ خود پر فریوم کا فراخ دلی سے اس پرے کیا۔ ناشتہ کر کے وہ آج آفس شہیر کے ماتھے ہی بیٹھنے گا۔

”کڈ مارٹک ماما!“ ممر کے سامنے سے ہٹا اور مالک کو مسکرا کے دیکھا۔

”مارٹک ٹو مائی چائلڈ۔“ مالک ملک کے چہرے پر سنجیدگی اور پریشانی کے آثار تھے جو عرشان کی نظروں سے چھپنے نہیں رہ سکے۔

”سب خیریت ہے ماما آپ مجھے کچھ پریشان لگ رہی ہیں؟“

”جی میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے یہ بتاؤ کل رات نیلما کے بھائی کا فون آیا تھا سب ٹھیک تو ہے نا کوئی پریشانی والی بات ہوئی تھی؟“

”نیلما کے بھائی کا فون؟“ عرشان کل کا سارا قصہ بھول چکا تھا۔

”ہاں تم نے نیلما کو ہال سے کمرے میں جانے کا کہا تھا کہ اس کی بات اس کے بھائی سے کراؤ گے۔“

”جی..... جی..... ہاں ماما..... آیا تھا اور میں نے بات بھی کرائی تھی۔“ عرشان کو سب یاد آ گیا تھا کہ کس بار ماہیہ طریقے سے کل اس نے نیلما سے بات کی تھی۔

”تو پھر کیا بات ہوئی ہے کیونکہ نیلما نے نرات کا کھانا کھایا اور صبح کا ناشتہ کیا ہے۔ بس روئے جاری ہے۔“

”بڑی مشکل سے ساریہ نے اس کو ایک گلاس دودھ کا پلایا ہے۔ وہ بھی دمیت ہوئی۔ میں تو بہت پریشان ہوئی۔“

”جی..... جی..... ہاں ماما..... آیا تھا اور میں نے بات بھی کرائی تھی۔“ عرشان کو سب یاد آ گیا تھا کہ کس بار ماہیہ طریقے سے کل اس نے نیلما سے بات کی تھی۔

”کچھ کہہ رہے ہو؟“ مالک ملک کو اس کی بڑبڑا ہٹ سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

”نہیں ماما میں دیکھتا ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں بلکہ یوں کریں نوری سے میرا اور نیلی کا ناشتہ نیلی کے بیڈروم میں بھجوا دیں میں بات کرتا ہوں۔“ عرشان کی کاہی مہندی آنکھوں کی چمک عینابی لبوں کی معنی خیز لہراہٹ مالک ملک کو کوئی اور ہی کہانی سنار ہے تھے۔ عرشان مالک ملک کے سر پر بوسہ دینے باہر نکل گیا تھا۔

عرشان بغیر ناک کیے اندر داخل ہوا۔ نیلما اپنے بیڈ پر گھٹنوں میں منہ دیے شاید رو رہی تھی جس کا ثبوت اس کے نازک لرزے وجود نے دے دیا تھا۔ عرشان نے دروازہ بند کیا اور مضبوط قدم ویز قائلین پر دھرتا اس تک آیا۔

”کچھ لمبے تو اس کو نرم و گرم نظروں سے دیکھتا رہا پھر بڑے آرام سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ آہٹ پر نیلما نے اپنے گھٹنوں سے سر اوپر اٹھایا اپنے سامنے بالکل قریب عرشان کو بیٹھے دیکھ کر وہ جع معنوں میں گھبرا کر رہ گئی۔ وہ چیخے ہلکتی بیک کراؤن سے جا کر گئی۔“

”کیا بات ہے نرات کا کھانا کھانا۔“ صبح ناشتہ سب خیریت ہے اور ماما بتا رہی تھیں وہ میٹنگ بھی ہوئی۔

”ابھی تو ہمارے بیچ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو یہ نوبت آئے۔“ عرشان نے شریر لب و لہجے میں کہتے ہوئے

ان کی بڑی بڑی نیلی جھیل آنکھوں میں جھپکا مگر وہاں سوائے خوف کے اور کچھ نہیں تھا وہ شاید عرشان کی بے

امانی میں کہا گیا پر شوخ جملہ بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔ عرشان اس کی معصومیت پر ہولے سے مسکرایا۔

”اچھا لاؤ دکھاؤ میں نے زیادہ زور سے پکڑ لیا تھا تمہارا بازو۔“ عرشان نے اس کا بازو پکڑنا چاہا مگر نیلما

نے بری طرح اس کا ہاتھ جھٹک دیا وہ سائیز میں سے اترنے لگی تھی کہ عثمان نے اس کی کلائی پکڑ کے کھینچی کہ وہ سیدھا اس پر آ رہی۔

”ماحرم نہیں ہوں جو مجھ سے یوں بھاگ رہی ہو..... دکھاؤ.....“ عثمان کو اپنا ہاتھ اس طرح جھڑکنا خاصا ناگوار گزار تھا۔ عثمان نے اس کا دوپٹہ ہٹا کے اس کی آستین اوپر کی بازو پر واقعی نیل کے اور سرخ انگلیوں کے نشان اس کی میدے جیسی رنگت پر بہت واضح ہو گئے تھے۔ اس نے نیلما کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ کے اس کا بازو چیک کیا جہاں وہی نشان پڑے تھے۔

”اوہ مائی گاڈ یہاں تو میری انگلیوں کے نشان پڑ گئے ہیں اس کا مطلب کل میں نے تمہارے ساتھ کچھ زیادہ ہی سختی کر دی ہے۔“ عثمان نے نیلما کے نشانوں پر اپنی انگلیوں کے لمس چھوڑے تھے اور ان دیکتے لمس کی پیش سے نیلما کے دل کی کیا حالت تھی عثمان اس سے بے خبر تھا۔

”پلیز چھوڑیں۔“ نیلما کی بھیگی آواز پر عثمان نے اپنی کاہی نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اس چہرے پر ایسا کچھ تو تھا جو بل بھر میں عثمان کا سب کچھ چین سکون ختم کر گیا۔ اس کا دل پہلی بار نیلما کے نام پر دھڑکا تھا۔ وہ بے خود سا ہو کر بس یہ چہرہ دیکھتا ہی رہا اور جانے یہ بل مزید اور کتنے گزر جاتے کے دروازے پر دستک دی گئی تھی۔ عثمان نے نظروں کا رخ بدلا اور وہاں سے اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا جہاں نوری ناشتے کی ٹرالی لیے کھڑی تھی۔

”تم جاؤ۔“ عثمان نے ٹرالی نوری سے لی اور ٹرالی لیے اندر داخل ہو گیا۔ اس دوران نیلما نے خود کو R سنبھال لیا تھا۔ بندے سے نیچے اتر گئی تھی اور اپنے دو بٹے کو مزید پھیلا کر خود پر ڈال لیا تھا۔

”چلو آؤ پہلے ناشتہ کرتے ہیں پھر کوئی بات ہوگی۔“ عثمان ٹرالی کو صوفہ سیٹ تک لے آیا تھا۔ نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔“ نیلما نے آہستہ سے کہا۔

”تو اس کا مطلب ہے تم روایتی بیویوں کی طرح ناراض ہو نو پر اہم مجھے منانے کا فن آتا ہے۔ اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گا تو ان جاؤ گی نا؟“ عثمان اس کی طرف بڑھتا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کے یہاں لاسکے۔

”نن..... نہیں..... میں کھالوں گی۔“ اس سے پہلے کہ عثمان اس تک پہنچتا وہ خود ہی آکر سنگل صوفے پر سٹ کر بیٹھ گئی کیونکہ عثمان سے کچھ بعید نہیں تھا وہ اپنے کبے پر عمل بھی کر گزرے۔ چڑیا کی طرح تھوڑا سا چٹک لیا تھا۔

”بس اتنا سا۔“ نیلما کے ہاتھ کھینچنے پر عثمان نے ٹوکا۔

”نہیں بس مجھ سے اور نہیں کھایا جائے گا۔“ ان نیلی جمیل میں فی تیر نے لگی تھی اپنی بے بسی کی اپنے اس قدر کمزور ہونے کی..... تنہا اور اکیلا ہونے کی۔

”اوہ کوئی بات نہیں..... میں نے بھی کھالیا۔“ عثمان نے بھی بس کھالیا تھا۔

”پریشان مت ہو آج کے بعد میں تمہیں احتیاط سے چھوڑوں گا۔“ عثمان کی پھر سے رگ طرانت بھڑکی تھی۔ نیلما جو اس کے پہلے والے جملے پر بمشکل نظر اٹھا کے دیکھ رہی تھی اس کے دوسرے جملے پر وہ کان کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی تھی۔ یہ دیکھ کر عثمان نے دلکشی سے دیکھا تھا۔

☆.....☆

دوسرے دن ستارہ نے پورا گھر صاف کیا، کھانا بنایا اور پھر سیدہ اور فرخندہ کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔

فرخندہ تو اس کے بیٹھے پر فوراً سے اٹھ کر جانے لگی تھیں مگر ستارہ نے فرخندہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”اور کتنی سزا دو کی امی بس کر دیں ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ ستارہ کی آنکھوں سے آنسو موتیوں کی طرح نکلنے لگے تھے۔

”میری بلا سے مرجاؤ مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“ کس قدر بے حسی تھی ان کے لب و لہجہ میں کہ ستارہ کے ساتھ ساتھ سیدہ بھی بڑب کے رہ گئیں۔

”فرخندہ کچھ علم ہے کیا کہہ رہی ہو۔“

”سیدہ میں کچھ نہیں جانتی ہوں بس اتنا جانتی ہوں کہ اس کو کبھی میرے سامنے مت آیا کرے نفرت ہوتی ہے مجھے اس کے وجود سے بھی۔“ ستارہ کا ہاتھ جھڑکتی ہوئی وہ وہاں سے نکلتی چلی گئیں۔

”ستارہ بلکی ہوئی آپنے بیدارم میں بھاگی تھی۔ پیچھے سے سیدہ پکار رہی تھیں۔

”آج فیصلہ ہو کر رہی رہے گا۔“ سیدہ غصے میں انھیں اور فرخندہ کے پاس آئیں۔ فرخ عالم نے یہ سارا نظارا

نہایت دکھ سے دیکھا تھا مگر اس کے اندر کا غصہ ایک بار پھر اٹھ آیا تھا۔ وہ اپنے بیدارم میں تیزی سے آیا۔ ستارہ

و بیدارم سے منہ زارہ قطار رو رہی تھی۔ فرخ عالم نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو سختی سے تھام کر اپنے مقابل کیا۔

ستارہ کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فرخ عالم آجائے گا۔

”جی تو چاہتا ہے اس کا نکات اس سستی سے تمہاری ذات کا نام و نشان مٹا دوں تمہارے وجود کو کچی کچی کر کے زمین کی انتہائی گہرائیوں میں دفن دوں تمہیں اس کال کوٹھری میں ہمیشہ ہمیش کے لیے قید کر دوں جہاں

گھپ سیاہ اندھیرا اور سمیر خاموشی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نا ہو کر یہ دل یہ آنکھیں مجبور ہیں..... جنہیں تم سے

مشق ہے، محبت ہے، تمہاری چاہ ہے۔“ فرخ عالم نے اپنی بات کہی اور اس کو ہلکے سے جھٹکے سے خود سے الگ

کرتے ہوئے باہر نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ فرخندہ اور سیدہ کے کمرے میں آیا تھا۔

”اتنی نفرت کرتے ہیں آپ مجھ سے۔ اکی کو میرا وجود برداشت نہیں ہے اور آپ کو میرا جینا..... میری اپنی

زندگی میری اپنی سانسیں کہاں ہیں..... میرا وجود کہاں ہے..... میری یہاں کس کو ضرورت ہے۔ تین ماہ سے

زیادہ ہو گیا تھا فرخندہ اور فرخ عالم کی سچ ادائیگی کی بے رخی ناراضی فحش برداشت کرتے کرتے..... اب تو دل

بھی درد کے مارے پھٹنے لگا تھا۔ دماغ کی رگیں دکھنے لگی تھیں..... رواں رواں، زخم زخم ہو گیا تھا۔ روح تک

کھال ہو گئی۔ وہ کوئی نہ گھڑی ہوگی جب یہ جسم روح کا ساتھ چھوڑے گی۔ دل کا دھڑکنا..... سانسوں کا رکنا

بند ہو جائے گا۔ پاؤں اس قدر ٹل ہو گئے تھے کہ اب ان زخموں سے خون رسنے لگا تھا۔

تین ماہ کا یہی۔ اثر تھا سوچیں جواب ساتھ چھوڑنے لگی تھیں۔ فرخ عالم کے یہ جملے کانوں میں زور زور سے

اپنی ذات پر بٹتے ہوئے لگ رہے تھے۔ کمرے کی ہر شے گردش کرنی لگ رہی تھی۔ ہر شے گھوم گھوم کر اس کو

پہلارہی تھی۔ ان ستاروں جیسی آنکھوں کی ہر روشنی مانند پڑ گئی تھی۔ اندھیرا ہر طرف نظر آ رہا تھا۔ فرخ عالم کا آخری

جملہ بار بار گونج رہا تھا جاؤں طرف۔

”تمہیں اس کال کوٹھری میں ہمیشہ ہمیش کے لیے قید کر دوں جہاں گھپ سیاہ اندھیرا اور سمیر خاموشی و

تنہائی کے علاوہ کچھ نہ ہو۔“

تو فرخ عالم تمہاری دعا قبول ہو گئی تمہاری خواہش تمہاری آرزو پوری ہونے کا وقت آ گیا اور پھر وہ آنکھیں

ستاروں کی روشنی سے بھری آنکھیں ہمیشہ ہمیش کے لیے بند ہو گئیں اس کی تھکاؤں کو ان اندھیروں نے خود میں

سیٹ لیا تھا۔

”دیکھو فرخندہ آج تم جو کر رہی ہو تمہارا رویہ تمہارا برتاؤ بہت غلط ہے ستارا کے ساتھ۔ مانتی ہوں اس کے قدم بہک گئے تھے مگر وہ شرمندہ پریشان اور پشیمان و نام ہے اپنی غلطی پر۔ تین ماہ ہو گئے ہیں اب خدا کا واسطہ بس کر دو، معاف کر دو ستارا کو۔ مجھے دیکھو میری انگلی جی میری نظروں سے دور ہے جس کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں ترس گئی ہیں جس سے بات کرنے کے لیے میں تڑپتی ہوں مگر ستارا میں نیلما کو دیکھ لیتی ہوں مگر تم کیوں اتنی بے حس ہوتی ہو..... اچھا ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جان بچھوٹ جائے گی کسی شکل میں ہی نہیں دیکھ سکو گی۔“

”سیدہ یہ کیا کہہ رہی ہو تم بھلا کوئی ماں ایسا کر سکتی ہے اپنی اولاد کے ساتھ۔“ فرخندہ تڑپ کر رہ گئی تھیں۔

”تو جو تم ابھی کر رہی ہو وہ ٹھیک ہے اور جو کچھ فرخندہ عالم کر رہا ہے وہ صحیح ہے۔“

”فرخندہ نے کیا کیا ہے؟“

”فرخندہ میں بھی ایک ماں ہوں، اپنی اولاد کے ہر رنگ کو پہچانتی ہوں جانتی ہوں۔ فرخندہ ستارا کو بیوی تو بنالیا ہے اس کو اس کا حق تو دے دیا ہے مگر جو بچی محبت اور عزت ہے وہ بچی اب تک اس سے محروم ہے۔ یقین کرو اگر ستارا کو تم دونوں کی وجہ سے کچھ ہو گیا تو میرا مرنا منہ دیکھنا۔“

”اماں!“ پیچھے فرخندہ عالم دہلتا ہوا آیا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہی ہو اللہ نہ کرے۔“

”کیوں اللہ نہ کرے..... اس معصوم بچی کو جس طرح تم دونوں ستارے ہو، رلا رہے ہو، تڑپا رہے ہو وہ سب کیا میں دیکھ نہیں رہی ہوں۔“ سیدہ نے دونوں سے اپنی ناراضی کا اظہار کر دیا تھا۔ فرخندہ نے تو نظریں ہی چرائی تھیں۔

”بیٹا میں جانتی ہوں تم نے ستارا کو سب کچھ دیا ہے ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی جوڑے کپڑے مہنگی مہنگی جیولری عمدہ والی میک اپ ہر آسائش دنیا جہاں کی برکت تو کیا تمہیں لگتا ہے وہ یہ سب پا کر خوش ہے مطمئن ہے پرسکون ہے نہیں نا؟“ سیدہ نے خاموشی کی ایک نظر فرخندہ عالم کے پر سوچ چہرے پر ڈالی تھی۔

”عورت عزت کی محبت و توجہ کی بھوک ہوتی ہے اپنے شوہر کی پیار بھری نظروں کی پیاسی ہوتی ہے اور ستارا کو تم نے یہ سب نہیں دیا۔“ سیدہ نے دہمی ہو کر سانس لی اور فرخندہ کو دیکھا۔

”فرخندہ میں ستارا کو یہاں لارہی ہوں، تم اس سے بات کر دو پیار کرو اس کو اپنے گلے سے لگاؤ۔ اپنی نرم گرم آغوش میں چھپا کر اس کا درد بانٹو۔“ حیدہ نے فرخندہ کے کندھے پر ہولے سے ہاتھ رکھا۔ فرخندہ نے کچھ نہیں کہا ان کی خاموشی کا مطلب رضامندی ہی تھا۔

فرخندہ اور فرخندہ عالم کو چھوڑ کر سیدہ، ستارا کو لینے چلی گئیں مگر ابھی ایک منٹ بھی نہیں مگر راتھا۔

”فرخندہ فرخندہ جلدی آؤ.....“

سیدہ کی چیخ پر دونوں دیاں بھاگے تھے۔

فرخندہ عالم نے اپنے کمرے کی بازوؤں میں ستارا کا بے ہوش وجود اٹھالیا تھا اور تیزی سے اسپتال کی سمت بھاگے تھے۔

ایک گھنٹے کی ٹریفک سے ستارا کی حالت بہتر ہو گئی تھی اس کو ہوش آ گیا تھا بلکہ ڈاکٹر نے جو خوشخبری سنائی

ان تینوں کے دل نہال ہو گئے تھے۔

”مبارک ہو آپ لوگوں کو ستارا بڑیکلیٹ ہیں۔“ فرخندہ تیزی سے اندر آئی تھیں اور ہلکی ہوئی ستارا کو خوب بار کیا تھا۔ اس کو اپنی نرم گرم آغوش میں بھر لیا تھا۔

”میری بچی میرے دل کا ٹکڑا تمہاری حالت دیکھ کر تو میری جان ہی ٹکڑ گئی تھی۔ پیروں تلے سے جیسے زمین ٹکڑ گئی تھی۔“

”فرخندہ بس کرو شکر ادا کرو ستارا کو ہوش آ گیا ہے وہ ٹھیک ہو گئی ہے اب اگر تم اس کو اتار لاؤ گی تو کہیں نہ اٹو استہ ستارا کی طبیعت پھر سے نہ بگڑ جائے۔“ سیدہ نے فرخندہ کو ستارا سے الگ کیا۔

”خدا نہ کرے اب میری بچی کو کوئی دکھ پہنچے۔“ فرخندہ نے ستارا کی ہیکل آنکھیں بھیجا چہرہ اپنے دوپٹے سے صاف کیا تھا۔

”اب کوئی نہیں روئے گا بس اب خوشیاں ہی خوشیاں ہمارے دروازے پر دستک دیں گی۔“ سیدہ مسکرا رہی تھی مگر اس بار ان کی یہ مسکراہٹ بہت پھمکی سی تھی آنکھوں میں اداسی سی تھی وہ کمرے سے باہر آ گئی تھیں۔ نیلما کی شدت سے محسوس ہوئی تھی۔

”ای تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟“

”ہاں میری شہزادی میں نے تمہیں معاف کیا۔“ فرخندہ نے ایک بار پھر ستارا کو خود سے لگا لیا تھا۔

☆.....☆

”عرشان آخر اس میں غلط کیا ہے۔“ رخسار اس کی ضد سے زچ ہو گئی تھی۔

”اچھا تو اس میں درست کیا ہے تم مجھے وہ بھی سمجھا دو۔“ رخسار سے زیادہ عرشان اس کے سوالوں سے زچ ہو گیا تھا بلکہ صحیح معنوں میں چڑھ گیا تھا۔

”عرشان! کیف بھائی نیلما کو پسند کرنے لگے ہیں۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں آخر اس میں برائی ال کیا بات ہے۔“

”کیف کو تو ہر دوسری لڑکی پسند آ جاتی ہے۔“

”ہاں تو اس میں کیا برائی ہے وہ مرد ہیں، اسٹبلش ہیں، خوب صورت ہیں، دینی میں ایک شاندار جاب ہے۔“

”اور ان سب سے بھی بڑھ کر دینی میں کیف نے نام صرف شادی کی ہوئی ہے بلکہ دو چھوٹے چھوٹے بچے بھی ہیں۔“ طنز کا تیر پھینکا تھا۔

”ہاں تو کیا ہوا وہ افورڈ کر سکتے ہیں۔ دو کیا چار بیویاں رکھ سکتے ہیں۔“ رخسار پوری طرح کیف کی حمایت میں بات کر رہی تھی۔

”میری بلا سے وہ چار کیا چھ شادیاں کر لیں یہ اس کا اپنا فضل ہے مگر نیلی کا نام کیف کے ساتھ مت لو۔“

عرشان کو سخت ناگوار لگ رہا تھا۔ بار بار رخسار کا جراح کرتا۔

”اچھا تو نیلما میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں پوری دنیا میں اس کا کوئی نہیں سوائے ایک بھائی کے وہ اس وقت جیل میں نہ جانے کون سا جرم کر کے قید ہے۔ اس کی بہن یہاں غیر کے در پر اکیلی پڑی ہے اب اس کو ایک گھر ایک جیون ساسھی ملتا ہے تو نہ جانے تمہیں کیا پراہم ہے۔“

”کیوں کہ وہ میری ذمہ داری ہے۔“ عرشان سے زیادہ دیر اس سے بحث میں الجھنا نہیں جا رہا تھا۔
 ”کیا مطلب ہے تمہارا اس بات سے۔“ رخسار چونک کر رہ گئی تھی۔ شک کی لہر اس کے اندر دوڑ گئی
 عرشان نے اس کی طرف سے رخ ہی پھیر لیا تھا۔ رخسار اس کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اس کی پُرسوج کا ہی
 مہندی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔
 ”عرشان جج جج بتاؤ آخر وجہ کیا ہے؟“
 ”نئی میری منکوحہ ہے میں نے اس سے نکاح کیا ہے۔ وہ میری ذمہ داری، عزت اور میری غیرت
 ہے۔“

”نہیں تم مذاق کر رہے ہو!“
 ”ایسا گھٹیا مذاق کرنے کی میری عادت نہیں ہے رخسار۔“
 ”اور میں..... میں کہاں ہوں تمہاری زندگی میں عرشان میں نے تم سے محبت کی ہے۔“
 ”کیا.....! رخسار تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ ہم اچھے دوست ہیں میں نے کبھی تم سے ایسی بات نہیں کی جو
 تمہیں محبت کی راہوں تک لے جائے۔ میرا مقصد میرا کیرئیر صرف میری پڑھائی رہا ہے محبت جیسی الجھنوں
 میں میں کبھی نہیں پڑا۔“
 ”ہاں کیوں کہ نیلما سے نکاح ایک حادثہ تھا کسی کی عزت و آبرو بچانا تھا کسی کی مجبوری تھی..... بس اگر
 سے آگے اور میں کچھ نہیں کہہ سکتا اور نہ ہی تمہارے سوالوں کے جواب دے سکتا ہوں مگر ہاں آج شاید صرف
 R۔ تمہاری وجہ سے میں ایک سچا اور مخلص دوست گنوا دوں گا۔“ اور پھر عرشان وہاں رکا نہیں اس کے گھر سے نکلتے
 چلا گیا تھا۔

”رخسار.....“ دروازے کے اوٹ میں چھپی ساری یہ جوان دونوں کے درمیان ہونے والی ساری گفتگو کو
 چکی تھی عرشان کے جانے کے بعد رخسار کے پاس آئی تھی۔
 ”ساری یہ آئی..... میری محبت ہار گئی..... آج میں ہار گئی۔“ رخسار اس کے گلے سے لگی پھوٹ پھوٹ کے
 رو دی تھی۔
 عرشان رات گیارہ بجے گھر آیا تھا۔ ہال میں عائکہ ملک اس کا ویٹ کر رہی تھیں۔

”مما آپ جاگ رہی ہیں۔“
 ”تمہیں لگتا ہے اتنے بڑے انکشافات سننے کے بعد مجھے سونا چاہیے..... میں نے کبھی تم پر یا شبیر
 زبردستی نہیں کی زبردستی اپنا فیصلہ نہیں تھا یا شبیر نے ساریہ کو پسند کیا میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا تم کو
 اگر نیلما کو پسند کرتے تھے تو مجھے بتادیتے میں منع تو نہیں کرتی بلکہ خود جا کر اس پچی کو دھوم دھام سے دہن بنا کر
 لاتی۔ اس طرح وہ بھی چھپ چھپاتے کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی اور اس پر تین ماہ تک بے وقوف بگم
 بناتے رہے۔“ عائکہ ملک سخت کبیدہ تھیں نالاں تھیں۔

”آئی ایم سوری ممما.....!“ وہ عائکہ کے گلے کا ہار بنا اور پھر جو کچھ لاہور میں ہوا وہ سب بتاتا چلا گیا۔
 ”یہ تو اچھی بات ہے کہ کسی لڑکی کی عزت بچانے کے لیے تم نے یہ قدم اٹھایا مگر چھپایا کیوں؟“
 ”ڈیڈ وکوسب علم ہے۔“
 ”شاباش اس کا مطلب ہے تم باپ بیٹے نے خوب مجھے بے وقوف بنایا۔“ عائکہ ملک نے شانے پر رک

”ان کے بازو پر ہولے سے چپت لگائی۔“

”ایپو کئی ماہیں رزلٹ کا ویٹ کر رہا تھا پھر خود ہی بتا دیتا سب کچھ۔“ وہ سر کھجکا کے رہ گیا تھا۔

”اچھا یہ بتائیں آپ کو آپ کی بہو پسند تو آئی تا۔“

”بہت پیاری انویسٹ ہے بالکل نیلی نیلی آنکھوں والی مومی گڑیا۔“ عرشان کی کاہی آنکھوں میں اس کا
 ارا ہائس جھللائے لگا تھا۔

”ارے ہاں آج بے چاری گم گئی پاؤں میں موج آئی ہے۔“

”واٹ مگر کیسے؟“ عرشان نے عائکہ ملک کے شانے سے بازو ہٹا لیا چہرے پر پریشانی کے واضح رنگ

اے تھے۔ عائکہ ملک دھیرے سے مسکرا دیں اس کی دیوانگی پر۔

”بتائیں کیا سوچ رہی مگر جلدی سے ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ ابھی اسنے روم میں آرام سے سو رہی ہے۔“

عائکہ ملک کو عرشان کی پریشانی اور فکر بندی اچھی لگی تھی۔ وہ سختی اور زبردستی کی قائل نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے

دواں بیڈوں کی تربیت بہت اچھی کی تھی۔ بالکل دوستوں کی طرح رہی تھیں۔

”میں ایک نظر دیکھ لوں ذرا۔“ اسی دوران عائکہ ملک کا سیل فون بجنے لگا۔

”لو تمہارے ڈیڈ وک کال آگئی ہے تم جاؤ میں ذرا رحمان صاحب سے دودھ ہاتھ کر لوں۔“ وہ مسکراتی ہوئی

اپنے بیڈ روم میں چلی آئیں۔

عرشان بے مہمی سے آگے بڑھا دروازے کھولا تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا تھا۔ اندر کا منظر دیکھ کر وہ

نہایت سا ہو کر رہ گیا تھا۔

ish

نیلما فینک کے ریڈ اینڈ بلیوسٹ میں بغیر دوپٹے کے کھڑی تھی۔ کمر سے نیچے تک گولڈن شیز ہال کسی

انبار کی طرح پشت پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی نیلی بڑی آنکھوں میں وحشت ہی وحشت تھی۔ شاید درو کی سرخی

بہت اور آنکھوں میں کھلی ہوئی تھی۔ عرشان بے خود سا آگے بڑھا تھا۔ نظروں کا یہ تصادم نیلما کی جان نکال رہا

تھا۔ آج صبح سے ہی اس کا دل بو جھل بو جھل اداس سا ہو رہا تھا۔ گھر والے اپنی بہن دوست دوست ہمارا ستارا

رو رہ کر شدت سے یاد آ رہی تھی۔ سوچیں اتنی گہری ہو گئی تھیں کہ پتا ہی نہیں چلا کہ وہ کسی شے سے نگرانی ہے

اور پاؤں میں موج بھی آگئی تھی۔ اسی درد و تکلیف کی وجہ سے اس کو بخار بھی ہو گیا تھا۔ غڑ حال ہی بہت کمزوری

وہیں کر رہی تھی خود کو۔ اس وقت بھی دل جانے کیوں گھبرا رہا تھا تو وہ بیڈ سے نیچے اتر ہی ابھی دو قدم ہی آگے

ہی گئی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز پر اس نے نیلما کیل اوپر کی جانب اٹھائے تھے۔ وہاں عرشان کو

لہا پایا تو دل دہشت سے دھڑکنے لگا تھا۔ خنڈا گرم مزاج والا عرشان اس کی جان نکالنے لگا تھا۔ وہ بالکل

مات و جادہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ عرشان آگے بڑھا تھا۔ نیلما نے ہمت کر کے قدم اٹھایا ہی تھا مگر وہ اتنا

ماری اور وزنی لگ رہا تھا کہ لڑکھائی وہ عرشان کے وسیع سینے سے لگی تھی اس کی ہمت ٹوٹ گئی تھی بخار سے

احال کمزور وہ کیا اپنا دفاع کرتی بے بسی ہی بے بسی۔ اس نے اپنا سر عرشان کے سینے پر جھکا دیا اور با آواز آنسو

اس کا کربان بھگوتے طے گئے تھے۔

عرشان نے اس کے گرد اپنے مضبوط ہاتھ بازوؤں کا گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ اس کو خود میں سمیٹ کر اس کا

ار۔ جو اپنے بازوؤں میں بھر لیا تھا۔

نیلما کو بازوؤں میں بھرے وہ بیڈ تک لے آیا اور نہایت احتیاط سے بیڈ پر لیٹا دیا تھا۔ خود بھی اس کے پاس

بیٹھ گیا اور بغور اس چہرے کو دیکھنے لگا جو شدت غم سے سرخ ہو رہا تھا۔

”بہت درد ہو رہا ہے۔“ وہ اس کے چہرے پر جھکا پوچھ رہا تھا اس کے بالوں کو سہارا ہاتھ۔

نیلمہ نے چہرے کا رخ پھیرنا چاہا مگر عثمان نے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھ دیا۔

”محبت کے رنگ کیا ہوتے ہیں تمہیں دیکھ کر جانا پہچانتا ہے۔ دل پیار میں کیسے دھڑکتا ہے۔ احساس کی شدت روح کی تشنگی یہ سب صرف تم نے ہی تو سیکھا ہے ورنہ یہ دل تو ایک بیچارہ تھا جو ناجان تھا جس کی زمین پر پیار و چاہت کے بارش کی ایک بوند بھی نہیں پڑی جہاں کلیاں نہیں کھلیں وہاں اب پھولوں کا کھلنا ان کا خوشبو بکھیرنا مہکتا یہ سب تمہاری ہی مہربان منت سے نکلی۔“

عثمان نے اس کے سرخ رخسار پر اپنی ہتھیلی پھیری تھی۔

”تمہاری فرقت، قربت تمہارا ساتھ ہی میری زندگی ہے جو زندگی مجھے کل تک روکھی پھینکی لگتی تھی اب تمہاری موجودگی سے خوشنما لگتی اور خوب صورت لگتی ہے۔ یہ نکاح کے دو بول کا ہی اثر تھا کہ میرا دل خود بخود تمہاری طرف کھینچتا تھا یہ آنکھیں تمہیں ہی دیکھنا چاہتی تھیں۔ یہ لب تم سے پیار کرنا چاہتے تھے۔“ عثمان نے اس کی صاف و شفاف گردن سے بال ہٹائے اور وہاں ایک کہانی اپنی محبت کی رقم کردی۔ مقابل کی غیر ہوتی حالت کی پرواہ کیے بغیر وہ صرف اور صرف اپنی حکایات دل سنار ہاتھ۔ اپنے پیار کا اظہار عملی کر رہا تھا اور نیلمہ..... اس کی زبان تو جیسے تالو سے جاچکی ہو۔ ان نیلے جھیل کاچ کو اس نے نہایت خفی سے میچ لیے تھے۔ اس کا دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا کہ عثمان اس پر جھکا باسانی وہ آواز سن سکتا تھا۔ عثمان نے اپنا چہرہ R-ا پر اٹھایا تو وہاں کا منظر کوئی اور ہی کہانی سنار ہاتھ۔ اس چہرے پر شرم و حیا کے رنگ نہیں کھیل رہے تھے بلکہ خوفزدگی کے آثار تھے ورنہ وہ بدست بھی اس چہرے پر۔

”نیل!“

عثمان نے اس کی لرزتی پلکیں ہولے سے چھوئی تھیں۔ نیلمہ نے آہستہ سے لرزتی پلکیں واکی تھیں۔

”کیوں خوف زدہ ہو، مجھ سے کیوں ڈر رہی ہو، میری محبت کا یقین نہیں ہے۔ بولو نیلی کچھ تو بولو۔“

”مجھے آپ کی باتوں آپ کے حرف باحرف پر یقین ہے لیکن اس سچائی کو مجھے قبول کرنے کے لیے تمہارا وقت دے دیجیے میں اپنے دل کو آپ کے دل کی طرح یقین دلانا چاہتی ہوں کہ میں کسی خواب سراب کے پیچھے نہیں بھاگ رہی تھی۔ کھلی آنکھوں کا آپ کوئی سنا نہیں ہیں۔ بلکہ ایک خوب صورت تعبیر ہیں جو صرف میری ہے..... پلیز عثمان پلیز.....!“

ان نیلے کاچ سے دھوئی ٹوٹ کر پلکیں کے گوشوں سے گرے اور نیچے میں جذب ہوتے چلے گئے تھے۔ عثمان جو بغور اس کا چہرہ تک رہا تھا جس کی آنکھوں میں حیرانگیوں کا ایک جہاں آباد تھا۔ اس کی سوچوں کی رسائی بھی نیلمہ کی سوچوں تک گئی ہی نہیں اس کو یہ گمان تھا کہ وہ بڑھے گا، ہاتھ بڑھائے گا اور نیلمہ بنا کسی تاویل بنا کسی درخواست کے اس کا ہاتھ تھام لے گی اس کی محبت کو قبول کر لے گی اپنا سب کچھ مان لے گی مگر عثمان کی ساری خوش فہمیاں ڈھیر ہو گئیں۔

”ٹھیک ہے میں تمہیں وقت دے رہا ہوں مگر یاد رکھنا اس عید پر ہمارا دلیمہ ہے کل سے میں پورا رمضان اعتکاف میں بیٹھ کر سچے دل سے خشوع و خضوع سے عبادت میں لگ جاؤں گا۔ میرا رب مجھے میری عبادتوں ریاضتوں کا صلہ ان نیکیوں کا اجر ضرور دے گا اور رمضان کے بعد جو عید آئے گی اس عید پر مجھے تمہاری طرف

سے عیدی چاہیے اور تم جانتی ہو کہ مجھے تمہاری طرف سے کون سی عیدی چاہیے اس لیے خود کو مکمل طور پر تیار کر لے میرے پاس آنا کیونکہ اس وقت کسی صبر، برداشت، ناک کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی، اوکے۔“

نیلمہ اس کا مطلب اچھی طرح جانتی تھی۔ اس لیے ہولے سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ عثمان یہ پیارا سا نظر پیار سے دیکھتے ہوئے اس کے چہرے پر جھکا اور ان ہند پگھلوں پر اپنے دکتے لب رکھ دیئے تھے۔

”مگھ نہایت!“

عثمان مسکراتا ہوا وہاں سے نکل گیا۔ دروازہ بند کرنے کی آواز پر نیلمہ نے آنکھیں کھول کر بند دروازہ دیکھا تھا۔ پھر کروٹ لے کر آنکھیں موندھ لیں ان بند آنکھوں کی پتلیوں پر عثمان کا چہرہ جھلما رہا تھا۔ دل میں

”بھانکا جہاں عثمان پورے طمطراق سے کھڑا ہے ہی پیار و چاہت بھری نظروں سے تنک رہا تھا۔

☆.....☆

”اماں!“ فخر عالم بہت سے فردس، کھجلا، بھینٹی، دودھ، دہی کے شاپر ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوا تھا۔

”ارے فخر آگئے۔“ سیدہ جو مغرب کی نماز ادا کرنے جا رہی تھیں رک کر اس کو دیکھنے لگیں۔

”جی اماں! یس میں ایک ہفتے کا کھری اور انظار کی کا سامان لے آیا ہوں۔ سارے شاپر نیل پر رکھے اور

سیدہ کا ہاتھ تھام کر نرم و ملائم صوف پر بیٹھ گیا۔

”عثمان کا فون آیا تھا۔ میری ان کی ماسے بھی بات ہوئی ہے۔ وہ لوگ بہت اچھے ہیں اس پہلی عید پر

عثمان اور نیلمہ کا دلیمہ ہے۔“

نیلمہ کے ذکر پر سیدہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

”جو ہوادہ بھول جائیں شاید اس میں کوئی بھلائی کوئی بہتری ہی تھی رب تعالیٰ کی۔“ فخر عالم نے سیدہ کے

ہتہ آنسو صاف کیے۔

”میں نیلمہ کو دیکھنا چاہتی ہوں بات کرنا چاہتی ہوں بیٹا۔“

”بالکل بات کریں اور ہم سولہ رمضان سے عثمان کے گھر رکنے بھی جائیں گے۔ حالانکہ میں نے بہت منع

کیا امتزاض کیا مگر عثمان کی فیملی نہیں مانی یہ یس میں نمبر ملا کر دے رہا ہوں، نیلی اور اس کے سسرال والوں

سے بات کر لیں، میرا دل جیسے نیلی کی طرف پر سکون و مطمئن ہو گیا۔ آپ بھی پر سکون و مطمئن ہو جاؤ گی۔“ فخر

عالم نے اپنا فون جیب سے نکالا اور نمبر ملا کر سیدہ کو تھما دیا فرخندہ بھی وہیں چلی آئی تھیں۔

فخر عالم اپنے بیڈروم میں آگیا جہاں اس کی زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ بیڈروم میں داخل ہوا۔ ستارا

ناید مغرب کی نماز ادا کر کے بیٹھی تھی۔ آج رمضان کا چاند بھی نظر آگیا تھا۔

وہ چلتا ہوا آیا اور اس کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ ستارا کو اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا

بہا چہرہ اوپر نہیں اٹھایا تھا۔ فخر عالم نے اپنی چوڑی ہتھیلیوں میں اس کا پاکیزہ چہرہ بھر لیا تھا۔

”ناراض ہو؟“

بس اتنا کہنا تھا کہ ستارا کی ستاروں بھری آنکھوں سے بھل بھل آنسو بہنے لگے تھے۔ فخر عالم نے لبوں کو سختی

سے بچھ لیا تھا اور اس کو خود سے لگا لیا تھا اس کا پورا وجود جھنجکیوں کی زد میں تھا۔ فخر عالم نے اس کی پشت سہلائی

تھی۔

”مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کے اعتماد کا، اعتبار کا خون کیا ہے آپ کا بھروسے کا قتل کیا ہے۔ مجھے

معاف کر دیجیے۔ فخر میں نے آپ کو سمجھا نہیں۔ آپ کی محبت کو پہچانا نہیں۔“

”ستارا.....! میری طرف دیکھو!“

فخر عالم نے اس کو شانوں سے پکڑ کر اپنے مقابل کیا اور ٹیبل سے گلاس میں بھرا ٹھنڈا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے لبوں سے لگا یا تھا۔

”پہلے پانی پو۔“

دو گھونٹ لی کر گلاس ہٹا دیا۔ فخر عالم نے گلاس کا باقی بچا پانی خود پی لیا تھا اور خالی گلاس واپس ٹیبل پر رکھ دیا۔

”اب روٹا نہیں۔ جانتی ہو مجھے تمہارا روٹا بہت تکلیف دیتا ہے۔“

ستارا نے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

”جھوٹ، جھسی مجھے رلاتے رہے ہیں۔“

”ہاں تو غصہ بھی تو دلاتی تھیں، میں کتنا انتظار کرتا رہا تھا تمہارا کہ اب تم میرے پاس آؤ مجھے مناؤ گی مگر میرا انتظار، انتظار ہی رہ گیا۔ شادی کی رات اگر میں نے تم پر غصہ کیا تمہیں برا بھلا کہا تو تم خود سوچو وہ سب بجا تھا مگر جب میرا غصہ ٹھنڈا ہوا تو تمہاری راہ دیکھنے لگا کہ تم اب آؤ گی میرے پاس مگر تم نہ آئیں۔ تو کیا غصہ نہیں آئے گا۔“

غصے کے بادل آنکھوں سے چھپتے تو سارا منظر صاف و شاداب نظر آنے لگا۔ یہ جو سامنے شخص بیٹھا ہے وہ جو اس کو دیکھائی کی طرح چاہتا ہے وہ صرف اس کا ہے۔ تو کیوں مجھے پہلے فخر عالم کی محبت نظر نہیں آتی۔ کیوں R-1 میں ایک دھوکے کے پیچھے بھاگتی رہی۔“

”سوری۔“

ستارا نے اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھا وہ اپنے ناراض ناراض سیاں کو منانا چاہتی تھی۔ صرف سوری سے کام نہیں چلے گا مجھے اور بھی کچھ چاہیے فخر عالم نے چاہ سے ان ستاروں بھری آنکھوں میں جھانکا تھا۔

”مگر فی الحال تو ابھی میرے پاس کچھ نہیں ہے۔“ ستارا نے اپنے دونوں خالی ہاتھ پھیلائے۔

”بہت کچھ ہے بے وقوف لڑکی اگر سمجھو تو۔“ فخر عالم نے ستارا کے دونوں پھیلے ہاتھ تھام کر آہستگی سے اپنے قریب کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر اپنی محبت کی مہر ثبت کر دی تھی۔ ستارا کا تو جیسے جسم کا سارا خون چہرے پر آٹھمرا ہو۔ پلکوں کی گھنیری بازو دیکھتے سرخ عارض پر سجدہ رہیں ہو گئی تھیں۔

ان چار ماہ میں آج پہلی بار شرم و حیا کے وہ رنگ کھلے تھے اس کے چہرے پر جو گزرے ان چار ماہ میں نہیں دیکھے تھے۔ فخر عالم دھیرے سے ہنس دیا۔

”تمہیں پتا ہے تم کتنی پیاری لگ رہی ہو اس وقت۔“ فخر عالم کی شوخیاں بڑھنے لگی تھیں۔ اس کے شرارتوں پر شاید بندھ باندھنا مشکل تھا۔ اس لیے اس کا فی الحال کمرے سے جانا ہی بہتر تھا۔ میں جا رہی ہوں

سحری کی تیاری بھی کرنی ہے۔“

”چپ کر کے بیٹھی رہو۔“ فخر عالم نے اس کی نازک کلائی جو کھینچی تو وہ اس پر آ رہی۔ ”مجھے ابھی ڈھیر دور باتیں کرنی ہے تم سے۔“ وہ اس کے شرمائے چہرے پر جھکا تھا تو ستارا نے شکر ادا کر کے رب کا اور آسودہ ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

☆.....

میری مسکراہٹ دہرائی



دوستوں نے خوب رنگ بھایا تھا۔
 ”اماں! ہماری ہوزان کتنی پیاری لگ رہی ہے
 ناں۔“ سلیقہ بیگم نے بیٹی اور اس کی دوستوں کو چائے
 دی تھی اور دو گڑے میں رکھے تخت پر آن چلی تھیں
 تھیں اور دوستوں کی چھیڑ چھاڑ سے سرخ پڑتی بیٹی کو
 دیکھ دھیمے لہجے میں ساس کو مخاطب کر گئی تھیں۔

”پیارے کیوں نہ لگے گی آخر پونی کس کی ہے۔“
 وہ دل ہی دل میں ماشاء اللہ کہیں ایک فخر سے بولتی
 چائے کی چسکیاں بھرنے لگی تھیں سلیقہ بیگم نے آگے
 سے کچھ نہیں کہا تھا کہ وہ اختلاف کر رہی نہیں سکتی تھیں
 کہ یہ تو مسلم حقیقت تھی کہ ہوزان اپنی ماں پر نہیں اپنی
 دادی پر مبنی تھی سلیقہ بیگم ایک معمولی شکل و صورت کی
 حامل خاتون تھیں جبکہ نرگس بیگم خود نہ صرف حسین تھیں
 کافی حسن پرست بھی تھیں ان کا ایک ہی بیٹا تھا ولید
 جسے دور پرنے کی رشتے دار سلیقہ سے محبت ہو گئی تھی
 نرگس بیگم کو سلیقہ ایک آنکھ نہیں بھائی تھی وہ اپنے بے
 حد خود پر بیٹے کے لئے چاندی بھولانا چاہتی تھیں مگر وہ
 ماں کے قدموں میں آن بیٹھا تھا اس نے تمام عمر ماں
 کی فرمانبرداری کی تھی اور اپنی پسند کی شادی کے لئے
 ماں کے مد مقابل نہیں آیا تھا محبت سے منت کی تھی اور
 وہ بیٹے کی بات نال نہیں پاتی تھیں بیٹے کی محبت میر
 ایک ناپسندیدہ لڑکی کو اپنی بہو بنالیا تھا بہو کے ساتھ
 ان کا رویہ روایتی ساس کا ہی تھا سلیقہ کو ساس سے ڈر
 ہی لگتا تھا کہ وہ ہر وقت اس کی معمولی شکل و صورت پر
 اسے سنا ہی رہتی تھیں اور وہ اپنے نام کی طرح ایک
 سلیقہ مند خاتون تھیں اس نے گھر کو کچھ یوں سنبھالا

ڈھونک کی تھاپ پر سکھوں نے سہاگ کے
 گیت گانا شروع کئے تھے اور وہ تصور میں مبسام خان
 کا چہرہ پتلیوں پر رقص کرتا محسوس کرتی مسکرا دی تھی
 اس نے جو چاہا تھا جسے ہر ایک دعا میں مانگا تھا وہ
 اسے پانے جاری بھی تو مسرور کیوں نہ ہوتی اس کے
 لبوں پر رقصاں مسکراہٹ کو نوٹ کر لیا گیا تھا اور وہ
 سب اسے چھیڑنے لگی تھیں وہ یکدم ہی سرخ ہو گئی تھی
 اور نگاہ چراگنی تھی اس کی سکھیوں میں ایک نیا جوش بھر
 گیا تھا وہ بڑی تربک کے ساتھ گانے لگی تھیں گانے
 کے بول اور ڈھونک کی تھاپ کے ساتھ ساتھ گھومتے
 قہقہے فضا بھی گنگناٹے لگی تھی وہ ان سب کے ساتھ مل
 کر ہنس دی بھی بے فکری تھی جس میں پالنے کی خوشی کا
 احساس چھلک رہا تھا نرگس بیگم جو کچھ دور تخت پر
 بیٹھیں تھیں وہ پونی کے جھگڑتے چہرے کو دیکھ کر ماشاء
 اللہ کہتیں اس کے چہرے سے نظر ہٹا گئی تھیں مبادا
 اسے ان کی نظر نہ لگ جائے اندرون کی خوشی کیسے انسان
 کو خوشی کی بہار بنا دیتی ہے وہ زرد جوڑے میں مگلی
 جاری بھی اور وہ کیوں نہ مگلی جاتی اس کی برسوں کی
 آرزو پوری ہونے جاری بھی مبسام خان اس کا
 ہونے جا رہا تھا وہ مبسام خان کی ہونے جاری تھی
 اس کا دل خوشی سے ناچ رہا تھا شرم و حیا کا پاس تھا
 ورنہ اس کا بس چلتا تو وہ سکھیوں کے ساتھ مل کر
 تالیاں پیٹ پیٹ کر گانے لگاتی لڈی میں شریک ہوتی
 بھٹکڑے ڈالتی وہ نگاہ پر نارل بنیدہ ہی بیٹھی تھی مگر اس کا
 روم روم خوشی سے جموم رہا تھا مایوں کی تقریب بہت
 شاندار رہی تھی تقریب کے اختتام کے بعد اس کی

کہ وہ جہاں بہو کی کم صورتی کا اسے طعنہ دیتی تھیں وہیں اس کی سلیقہ مندی کی بھی معترف تھیں اور یہ بات سلیقہ کے لئے امید افزا بھی اسے ساس اتنی بری نہیں لگتی تھی اور اس دن تو سلیقہ نے ساس کو ماں کا درجہ دے دیا تھا جب کسی رشتے دار خاتون نے ان کی بہو کی عام صورت کو نشانہ بنا کر کہا تھا کہ ان کے بیٹے کو تو سلیقہ سے سوگنا اچھی لڑکی مل سکتی تھی سلیقہ کو یہی لگا تھا کہ اس کی ساس آگے سے اس عورت کی ہاں میں ہاں ملائے گی لیکن اس کی یہ سوچ باطل ہو گئی تھی انہوں نے اس عورت کو کافی سناتے ہوئے بہو کی تعریف میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی اور رات میں اس نے اپنے ساس سر کی گفتگو بھی سن لی تھی اس کے سرسریہ لہجے کا اظہار کر رہے تھے کہ کس طرح وہ بہو کی کم صورتی سے نالاں تھیں ان کے مزاجی خدا کو بھی یہی لگا تھا کہ وہ بہو کی برائی کریں گی مگر ہوا الٹ تھا اس لئے وہ حیرت کا اظہار کر گئے تھے جس کے جواب نے سلیقہ کے سارے گلے ہی مٹا ڈالے تھے اس دن کے بعد سے اس نے اپنی ساس کے ہر طعنے کو اپنی ماں کی پیار بھری بات سمجھ کر دل سے نہیں لگایا تھا مگر وہ بات بہت معمولی تھی مگر بہت بامعنی تھی۔

”ولید کے ابا! سلیقہ میری بہو ہے اس گھر کی عزت میں اپنی بہو کو طعنہ دوں اس کو ایک کی دس سناؤں یہ میرا حق ہے مگر میں باہر کے کسی بندے کو یہ حق نہیں دے سکتی کہ وہ میری بہو کو آدھا لفظ بھی کہے مجھے اپنی بہو کی کم صورتی کا گلہ ہے مگر یہ گلہ کسی اور کو کرنے کا میں حق نہیں دے سکتی میرے ولید کو کوئی آدمی بات نہیں کہہ سکتا تو میرے ولید کی عزت پر کیسے انگلی اٹھا سکتا ہے میری بہو میری بیٹی ہے میں اسے دس بار سناؤں گی مگر کسی اور کو ایسا کرنے نہیں دوں گی“۔ زنگس بیگم نے ثابت کیا تھا کہ ان کی تربیت نیک ہاتھوں میں ہوئی ہے انہوں نے بہو کو عزت دی تھی ہر آئے گئے کے سامنے اس کی تعریف کرتی تھیں

یہی وجہ تھی کہ ان کے پوتا اور پوتی بھی دادی کے لاڈ لے تھے یاسر بڑا تھا اور باب کی کاپی تھا وہی قد کاٹھ وہی گوری رنگت سلیقہ نے یاسر نے اپنے ابا کی طرح ڈاکٹریت کی ڈگری لی تھی اور ایک گورنمنٹ ہسپتال میں تعینات تھا جبکہ اس کے ابا ولید کا اپنا کلینک تھا جو وہ عمر رسیدگی کے وجہ اب تک چلا رہے تھے اللہ نے ان کے ہاتھ میں شفاء رکھی تھی یاسر سے چھوٹی ہوزان بھی جو اپنی دادی کی کاربن کاپی تھی دو دھیا سفید رنگت سیاہ چھیل سی آنکھیں لمبی سنواں ناک باریک عنابی لب متناسب سراپا ہوزان کو جو بھی دیکھتا تھا وہ یہی کہتا تھا کہ یہ تو بی بیانی دادی ہے زنگس بیگم نے خود پوتی کو دیکھ کر یہی کہا تھا اور اسے ہوزان نام دیا تھا جس کے معنی ہی زنگس بیسی کے تھے انہوں نے پوتی کو بچپن سے ہی بے حد عزیز رکھا تھا اور وہ بھی تو دادی پر جان چڑھتی تھی اس نے فرسٹ ایئر کے امتحانات دیئے تھے اور شادی طے ہو گئی زندگی میں بڑے نشیب و فراز آئے تھے اس کی خوبصورتی اس کے لئے مسئلہ بن گئی تھی مگر اس کی تربیت اتنی نیک تھی کہ اس کے قدم لڑکھڑائے نہیں تھے اور اس نے اپنوں کا بھرم ان کا اعتبار بھی نہیں توڑا تھا یہی وجہ تھی کہ آنے والی ہر مشکل کو اس کے گھر والوں نے اس تک پہنچنے سے قبل ہی دور کر ڈالا تھا اور اس کی شادی اس کے ماموں زاد مہسام خان سے ہو رہی تھی مہسام جو دو بہنوں کا لاڈلا بھائی تھا مہسام خان نے ایم اے کیا تھا اور ایک پرائیویٹ کالج میں اردو کا لیکچرار تھا وہ ہوزان سے کوئی آٹھ برس بڑا تھا اس نے اگر کسی کو چاہا تھا کسی کو بحیثیت شریک سفر اپنی ہر ایک دعا میں مانگا تھا وہ ہوزان بھی چاندنی سی چمکدار زندگی سی حسین ہوزان مہسام کے دل میں دھڑکن بن کر دھڑکتی تھی اس کی محبت ہی تھی کہ اس نے ہوزان کے کردار پر اٹھنے والی انگلیوں میں پھینکی جانے والی کالک میں اپنا مثبت حصہ ڈالا تھا جب سب لہجے طعن کر رہے تھے اس

وقت اس نے آگے بڑھ کر ہوزان کے کردار کی گواہی دی تھی اور اسے اپنا شریک سفر بنانے کا عندیہ دیا تھا ہوزان جو مرنے کے قریب بھی پاک دامن پر لگتی تھی جو اس کی سانس کو سینے میں گھونٹنے کا سبب بن گئی تھی اسے مہسام خان نے زندگی کی نوید دے ڈالی تھی وہ ساس بہو میں شادی کی تقریب کے حوالے سے بات کرنے لگی تھیں رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اس کی پیکھیاں اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں وہ یکاڑہ سال کی بھی جب اس کے والد کی وفات ہوئی تھی اور وہ تب سے ہی دادی کے کمرے میں ہو گئی تھی اس وقت بھی وہ دادی کے برابر بیٹھی تھی دادی کافی دیر اس سے باتیں کرتیں اسے نئی زندگی کے حوالے سے بتاتیں اسے سونے کی ہدایت کر کے سو گئی تھیں اور وہ دادی کی بات پر عمل کرتی آنکھیں موند گئی تھیں پگلوں پر مہسام خان کا عکس روشن ہو گیا تھا وہ اس خوبصورت انسان کو سوچتی، یکدم ماضی کی کنڈیوں کو بھی ذہن پر دستک دینے سے روک نہیں پاتی تھی وہ مہسام خان کے روشن ماس سے باتیں کرتی یکدم ماضی میں اترتی گئی۔

☆☆☆☆

ہوزان کراچی کے ایک پرائیویٹ اسکول سے میٹرک کر رہی تھی میٹرک میں ہی اس کی اٹھان اچھی تھی بڑھتی عمر کی لڑکیوں سے جوانی کی دلہیز پر قدم رکھتا سن منہ سے بولتا تھا ناگتھ میں بھی تب اس کا پہلا رشتہ آیا تھا کسی شادی کے بعد تو رشتوں کی بلا مالغہ ان لگ جاتی تھی میٹرک کی کلاسز کا آغاز ہونے کوئی تین ماہ گزر گئے تھے اسے کچھ عرصہ سے یوں محسوس ہوا تھا جیسے کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے اس کی تین دیباہیاں تھیں دو ہم جماعت تھیں اور اس کی گلی کی خیریت سڑک پر رہتی تھیں جبکہ عروسہ اس کی ہم جماعت اور بڑوں میں وہ چاروں اسکول ساتھ ہی آتی باقی تھیں وہ دونوں صبح میں انھیں گلی کے کونے پر مل جاتی تھیں جہاں سے وہ چاروں پیدل ہی اسکول

جاتی تھیں کہ اسکول ان کے گھر سے دس منٹ کی مسافت پر تھا عروسہ اور وہ ساتھ گلی تک آتی تھیں اور برابر برابر بنے اپنے گھر میں چلی جاتی تھیں یہ ان کی کوئی چھ سال پرانی روٹین تھی یکدم ہی ہوزان کو وہم ہو چلا تھا جس کا اس نے سب سے پہلے اپنی دوست عروسہ سے ہی ذکر کیا تھا جو اس کا دہم کہہ کر بات کو ٹال گئی تھی ہوزان نے بھی بات کو اپنا وہم ہی سمجھ لیا تھا پڑھائی بھی کافی لفٹ تھی جیسے جیسے امتحان قریب آ رہے تھے اسے پڑھائی کے علاوہ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا وہ ایک ذہین طالبہ تھی ہم جماعت میں اس کا اسے دن گریڈ آیا تھا وہ اب بھی سخت محنت کر رہی تھی عروسہ کی طبیعت خراب تھی اس نے اسکول سے چھٹی کی بھی ایسا جب بھی ہوتا تھا کہ عروسہ چھٹی کرتی تھی تو اس کا بھائی یاسر اسے گلی کے کونے تک چھوڑ دیتا تھا جہاں اس کی دونوں ہم جماعت دوستیں مل جاتی تھیں اور وہ تینوں ساتھ اسکول پہنچ جاتی تھیں اور واپسی میں وہ دونوں ہوزان کو گھر تک چھوڑ کر پھر اپنے گھر جاتی تھیں مگر آج جب وہ یاسر کے ساتھ گلی کے کونے تک پہنچی تو اس کی دوست امیرا اکیلے ہی اپنے ابو کے ساتھ کھڑی تھی جو برہنہ غائب تھی وہ دونوں ساتھ باتیں کرتیں اسکول پہنچ گئی تھیں مگر واپسی کے لئے مشکل تھی کہ کیا کریں تب وہ دونوں اللہ کا نام لے کر اکیلے اکیلے اپنی اپنی گلیوں کی طرف بڑھ گئی تھیں ہوزان جو آیت الکرسی کا دُر در کرنی کھر کی طرف بڑھ رہی تھی قدموں کی چاپ پر ٹھٹھک گئی تھی وہ جو کوئی بھی تھا ہوزان کے دیکھتے ہی اس نے اسٹائل پاس کی تھی اور اس کے ہم قدم ہو گیا تھا وہ جو پہلے اس کے اسٹائل پاس کرنے پر گڑ بڑاتی تھی اب وہی اس کے ہم قدم ہو جانے پر پوری ہو گئی تھی وہ ذر قدرے فاصلے پر ہوئی تھی اور ناگواری سے اسے دیکھا تھا جس نے خود ہی دانٹ نکالے تھے وہ اس پر گھوری ڈالتی آگے بڑھ گئی تھی مگر وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا اسے اپنی بے

قراری کی داستان سنانے لگا تھا وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ گزشتہ تین چار ماہ سے اس کے تعاقب میں تھا وہ ایکلی نہیں ہوتی تھی اس لئے آج سے پہلے وہ دور سے ہی اس کو دیکھ کر دیدار کی تنہا کو پورا کیا کرتا تھا بات کرنے کی آرزو آج پوری ہوئی تھی اس کے ساتھ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا کہ کوئی یوں اس سے بکواس کر رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے تھے اور اس نے اس لڑکے کو کچھ کہنے کے بجائے یکدم ہی دوڑ لگادی تھی وہ کہاں یہ امید رکھے ہوئے تھا کڑ بڑا کر اگلے قدم واپس ہولیا تھا اور ہوزان نے پیچھے مڑ کر ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا اور گھر کا دروازہ پیٹ ڈالا تھا دروازہ اس کی ماں نے کھولا تھا وہ جلدی سے دلہیز پار کر گئی تھی وہ کچھ پوچھ رہی تھیں مگر وہ اپنے کمرے سے نکلتیں نرگس بیگم کے سینے سے جا لگی تھی اور روتے ہوئے تمام واقعہ کہہ ڈالا تھا وہ دونوں ساس بہو پریشان ہو گئی تھیں مگر نرگس بیگم نے پوتی کو پچکار کر اس کے کمرے میں بھیج دیا تھا سلیقہ بیگم نہایت مضطرب ہو چکی تھیں اور ان دونوں خواتین نے فی الحال گھر کے مردوں کو یہ بات نہ بتانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس سب سے بچاؤ کا یہ طریقہ نکالا تھا کہ اگلے دن سے سلیقہ بیگم خود اسے چھوڑنے کا کام سرانجام دینے لگی تھیں اس کی دوستوں کو تشویش ہوئی تھی انہوں نے وجہ دریافت کی تھی مگر کسی کو بھی کچھ بھی بتانے سے اس کی دادی نے منہ کر دیا تھا اس لئے وہ دادی کا بتایا ہوا بہانہ ان سب کے سامنے رکھ گئی تھی۔

”اماں کا کوئی شردل بڑھ رہا ہے ڈاکٹر نے واک کے لئے کہا ہے اس لئے دادی نے یہ حل نکالا ہے کہ اماں مجھے اسکول لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھائیں۔“ وہ سب ہی کم عمر سیدھی سادی لڑکیاں تھیں فوراً ہی دوست کی بات پر یقین کر کے بیٹھ گئی تھیں اور یوں سلیقہ بیگم نے بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کی دوستوں کو بھی لانے لے جانے کی ذمہ داری اٹھائی تھی وہ لفٹ کا

جو اس کے پیچھے لگا تھا وہ سلیقہ بیگم کو دیکھ کر خائف ہو گیا تھا وہ عروس کی موجودگی میں ہی بات کرنے سے ڈرتا تھا اب کیسے ہوزان کی ماں کے سامنے کچھ کہتا اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ ہمت کر کے موقع ملے ہی اس کے سامنے جائے گا تو وہ ماں کے ساتھ آنے جانے لگے گی تین ماہ سلیقہ بیگم نے ذمہ داری اٹھائی تھی پھر اسکول کی چھٹیاں بڑھ گئی تھیں وہ کوچنگ وغیرہ تو جانی نہیں تھی زیادہ مشکل آتی تھی تو وہ یاسر سے مدد لیتی تھی اور یاسر مصروف ہوتا تھا تو اسی کا ماموں زاد مہسام خان اس کی ماں کے ایک کال پر آ جاتا تھا مہسام خان اس سے بڑا تھا وہ اسے بھائی مہسام کہتی تھی مہسام خوش شکل نو جوان تھا اس کے سمجھانے کا انداز بھی بہت اچھا تھا اس نے اپنے پیپر کی تیاری یاسر اور مہسام کی مدد سے ہی کی تھی اس کے پیپر کے بعد مہسام کی سب سے بڑی بہن آمنہ کی شادی شروع ہو گئی تھی یہ قرعہ ہی عزیزوں میں پہلی شادی تھی اس نے ہر ایک فنکشن کے لئے بڑے اچھے جوڑے اور ساتھ میچنگ کی چیزیں لی تھیں اس کا حسن تو خود بولتا تھا اوپر سے زرق برق کپڑوں اور بے فکرے پن نے چار چاند لگادیے تھے وہ محفل کی جان بنی ہوئی تھی اس کی شراپا اس کے بے فکرہ قبضے اس کو سب کی نظروں میں ممتاز کر رہے تھے آمنہ کی شادی کے بعد تو گویا رشتوں کی لائن ہی لگ گئی تھی۔

”اماں یوں آئے ہر ایک رشتہ کو انکار کرنا کفرانِ نعت ہوگا۔“ سلیقہ بیگم نے جب دیکھا کہ ساس ہر آئے رشتے کو منع کرنی جا رہی ہیں اور ان کے میار صاحب سارے فیصلے ماں کو دینے پر سکون سے بیٹھے ہیں تب وہ ڈرتے ڈرتے ساس کے سامنے لب کشائی کر گئی تھیں۔

”ہر چیز کا ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے بہو۔“ نرگس بیگم کے ترش لہجے نے ان پر یہ باور کروادیا تھا کہ ان کی ساس کو ان کی بات ذرا پسند نہیں آتی۔

”اماں! میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ۔“

”تمہاری بات بھی غلط نہیں ہے، اول تو ابھی تک مجھے ہوزان کے قابل ایک بھی رشتہ نہیں لگا۔“ نرگس بیگم کی سب سے بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسرے کی خوبی کو اس کی درست و اچھی بات کو نہ صرف تسلیم کر لیتی تھیں اظہار کرتے بھی نہیں چونکہ تھیں وہ ساس کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں جو پر پوز لڑ آئے ہوئے تھے ان میں کئی تو ایسے تھے کہ انکار کرتے دس ہزار بار سوچا جاتا اور وہ اتنے آرام سے کہہ رہی تھیں کہ کوئی بھی رشتہ ان کی پوتی کے قابل ہی نہیں انہوں نے ساس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ذہن و دل کی بات کہہ ڈالی تھی۔

”میں جلد بازی کرنا غیر مناسب سمجھتی ہوں، انٹر کے بعد بہتر رشتہ مل جائے گا، ہوزان کو اتنی کم عمری میں اس سارے جھنجھٹ میں ڈالنا ٹھیک نہیں۔“ نرگس بیگم اپنا موقف سامنے رکھ کر بات ہی اینڈ کر گئی تھیں۔

☆☆☆☆

ہوزان کا میٹرک کا رزلٹ آ گیا تھا اس نے میٹرک بورڈ میں تیسری پوزیشن لی تھی جس کی خوشی میں نرگس بیگم نے گھر میں میلاد اور قرآن خوانی رکھی تھی سفید رنگ کے پرل کی موتیوں کے کام کے سوٹ میں وہ آسمان سے آئی ہوئی کوئی پری لگ رہی تھی تقریب بے حد اچھی لگ رہی تھی رات کے اختتام تک ہوزان کو تیز بخار نے آ لیا تھا وہ لوگ اسے لے کر ہسپتال دوڑے تھے مگر اس کی جان تو جیسے لپوں پر آگئی تھی گیارہ دن ان سب کے لئے بے حد تکلیف تھے طبی علاج کے ساتھ اس کا روحانی علاج بھی ہوا تھا اسے شدید نظر لگ چکی تھی نرگس بیگم پہلے بھی معوذتین کا اہتمام رکھتی تھیں صبح و شام سورۃ الناس سورۃ الفلق اور آیہ الکرسی پڑھ کر ہوزان پر دم کرتی تھیں جس میں اب مزید شدت آگئی تھی وہ اٹھتے بیٹھتے قرآنی آیات کا ورد کرتیں پوتی پر دم کرتی رہتی تھیں وہ رو بہ صحت ہو گئی تھی اس کا شہر کے بہترین سرکاری کالج میں

داخلہ ہو گیا تھا اس لئے دین لگادی گئی تھی وہ لڑکا جو ایک دفعہ کے بعد غائب ہو گیا تھا وہ اسے اب بلا نامہ کالج کے گیٹ پر نظر آئے لگا تھا وہ بس دور سے اسے دیکھا کرتا تھا تقریباً تین ماہ بعد کی بات ہے وہ دوستوں کے ساتھ دین کے انتظار میں کھڑی تھی کہ وہی لڑکا اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا وہ چاروں ہی اس کو دیکھ کر حیران ہو گئی تھیں ان تینوں کو ایک اجنبی کے سامنے آنے پر حیرانگی تھی اور وہ اس سے اتنی انجان نہیں تھی کہ سال بھر سے وہ اس کا تعاقب میں تھا اس لئے وہ پریشان ہو گئی تھی امیران چاروں میں سب سے زیادہ با اعتماد دھمتی تھی اس نے کڑے تیوروں سے اس نووارد کو گھورتے ہوئے آمد کی وجہ دریافت کی تھی اور اس نے بڑے آرام سے وجہ کہہ ڈالی تھی ان چاروں کے ہی منہ حیرت سے کھل گئے تھے اور وہ تو مرنے کے قریب تھی جبکہ وہ نووارد بڑے جوش و خروش سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا وہ ابھی اپنی بے قرار یوں کی داستان کہہ رہی رہا تھا کہ ان کی دین آگئی تھی اور وہ سب سے پہلے لپک کر دین میں سوار ہو گئی تھی اس کی دوستوں کو ایک موضوع مل گیا تھا وہ اسے چھیڑ رہی تھیں وہ ان تینوں کو ڈپٹ گئی تھی مگر اب یہ سلسلہ رکنے والا نہیں تھا اس لڑکے کی ہمت بڑھ گئی تھی وہ روز اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا تھا اور اس کی دوستیں اسے تنگ کرنے لگتی تھیں اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مسئلہ سے کیسے نکلے وہ دادی اور ماں کو بتانا چاہتی تھی مگر ڈر و جھجک کے مارے کہہ نہیں پار رہی تھی اس لڑکے کی بکواس سننا بھی اس کے بس کا روگ نہ تھا وہ جو پہلے کالج کے گیٹ پر رک کر دین کا انتظار کرتی تھی دین آنے تک وہ اب کالج سے باہر ہی نہیں نکلتی تھی اس نے اپنی دوستوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ایسے لڑکوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی نہ ہی اسے ان سڑک چھاپ لڑکوں کی محبت کا یقین ہے نہ ہی وہ یقین کرنا چاہتی ہے جو یہ کہ وہ لڑکا اتنا

برائیں لگا تھا وہ اسے غور کرنے پر اکسار ہی تھی مگر ہوزان کا فیصلہ اٹل تھا وہ لڑکا اظہار محبت کے بعد اس کے پیچھے کئی ماہ خوار ہونے کے بعد بہت غصہ میں آچکا تھا اس کی نام نہادانا بلبل کر جاگ اٹھی تھی۔

”تمہیں اپنی پارسیا کا بڑا زعم ہے میں تمہارا سارا غرور خاک میں ملا دوں گا۔“ اس نے دین میں سوار ہوتی ہوزان کی پست کو گھورتے ہوئے نفرت سے سوچا تھا اس کے فرسٹ ایئر کے امتحانات چل رہے تھے آخری پیپر کی دوپہر وہ اس کے سامنے بھرا آیا تھا اور وہ اس کی باتوں پر توجہ دینے بغیر آگے بڑھ گئی تھی شام میں مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر وہ ماں کے ساتھ کاموں میں ہاتھ بٹانے لگی تھی وہ آج کئی دن بعد کو دو پرسکون محسوس کر رہی تھی مگر اگلے دن اس کا سارا سکون درہم برہم ہو کر رہ گیا تھا وہ محسن کی جھاڑو لگا رہی تھی کہ اس کے قدموں میں کاغذ کا گولہ آن گرا تھا اس نے حیرت کے ساتھ اس گول مول ہوئے مڑے مڑے کاغذ کو کھولا تھا اور اسے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ کیا کرے کہ اس محبت نامہ کو بڑے ہی کھلے ڈالے لفظوں میں قلمبند کیا گیا تھا خط میں مخاطب کرنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ اس کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

”میری جان ہوزان! فقط تمہارا عاشق نامدار عاشق حسین۔“ جج کا سارا متن وہ جذب کر گئی تھی کہ چند سطروں کو پڑھ کر ہی وہ سرخ پڑ چکی تھی اسی بل قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی تھی اور وہ ماں کو دیکھ کر کاغذ کو فی الفور پھیلی میں چھپا گئی تھی وہ بیٹی کی حالوں سے انجان اسے صفائی کے بعد تیار ہو جانے کا کہہ رہی تھیں کہ ان کے کسی عزیز کے یاں بچے کی ولادت ہوئی تھی اور آج عقیقہ کی تقریب تھی جس میں ان سب نے ہی شریک ہونا تھا وہ جیسے تیسے جھاڑو پوری کر لی کمرے میں آئی تھی اس نے کاغذ کے پرزے پرزے کر کے کوڑے دان میں ڈال دیئے تھے وہ اس

لجھن میں تھی کہ یہ سب ماں سے کہے یا نہ تقریب میں بھی اس کا حال برابری رہا تھا چند دن عافیت سے گزرے تھے کہ چھت پر سے کپڑے اتارتے ہوئے ایک رتھ اور اس کے قدموں میں آن گرا تھا اس نے کچھ سوچ کر اس گول مول کاغذ کو کھولنے کی بجائے ساری بات ماں کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کیا تھا اور وہ دھڑکتے دل کے ساتھ ماں کے کمرے میں آ گئی تھی سلیقہ بیگم عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں وہ ان کے بستر پر بیٹھی ان کے فارغ ہوجانے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

☆☆☆☆

سلیقہ بیگم کے تو بیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی وہ بیٹی کو خفا نظروں سے دیکھنے لگی تھیں انہیں شکوہ تھا کہ وہ لڑکا اگر اسے پریشان کر رہا تھا تو اتنا عرصہ وہ چپ کیوں رہی وہ آٹکے سے کچھ نہیں بولی تھی ہر ایک بات سچائی کے ساتھ ماں کے گوش گزار کر گئی تھی اور اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا پچھلے رتھ کی بات بتاتے ہوئے تازہ خط ان کے سامنے کر دیا تھا جسے انہوں نے کھولا تھا اور ان کی کان کی لو میں تک تب اٹھی تھیں۔

”تم اپنے کمرے میں جاؤ یہ سب میں خود سنبھال لوں گی۔“ وہ غصہ ضبط کرتیں اس خط کو کھڑے کھڑے کرتیں ہدایت دے گئی تھیں وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ سلیقہ بیگم نے کچھ سوچ کر تمام بات ساس کے گوش گزار کر دی تھی۔

”اب بانی سرے اونچا ہو گیا ہے بھو! ولید کو سب بتانا ہوگا۔“ زمرس بیگم صورتحال سے آگاہی کے بعد پر سوچ انداز میں گویا ہوئی تھیں اور سلیقہ بیگم ڈر گئی تھیں۔

”اماں! یاسر کے اما کو بتانا مناسب نہیں ہوگا مرد ایسے معاملات میں عقل کو گردی رکھ دیتے ہیں۔“ سلیقہ بیگم نہایت خوفزدہ سی بولی تھیں۔

”بات تو تمہاری سولہ آنے درست ہے مگر اس سب کا مناسب حل نکالنا ہوگا وقت پر چل نہیں نکالا تو ہماری بچی کے حق میں یہ بات اچھی نہ ہوگی۔“ زمرس

بیگم دور تک کی سوچ رہی تھیں اور وہ اپنے تئیں سارا بیگم ساس کے سپرد کرتیں اپنے کمرے میں آگئی تھیں۔ زمرس بیگم نے بیٹے کو بتانے کا تہیہ کر لیا تھا مگر اب ایک ہی یاسر کے رشتے کی بات چل چکی تھی اس لئے ان کا فیصلہ کھٹائی میں پڑ گیا تھا زمرس بیگم کی ایک منہ بولی بہن تھیں جو کئی عرصہ سے بیمار تھیں وہ ان کی عیادت کو گئی تھیں وہاں ان کی نوای جو ناب شاہ میں خیم تھی اسے دیکھا تھا بے حد حسین اور نازک سی ایشمال انہیں پہلی نظر میں پوتے کے لئے ایک دم مناسب لگی تھی انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ لگے ہاتھ رشتہ ہی ڈال دیا اور گھر آ کر اپنے فیصلہ سے آگاہ کر دیا ولید تو تھے ہی ماں کے فرمانبردار بہونے بھی کسی قسم کا اعتراض نہیں کیا اور جس کی شادی کی بات چلائی گئی تھی وہ بھی دادی کے ہر فیصلے پر لبیک کہنے کو جان و دل سے راضی تھا یوں چٹ مٹکئی پٹ بیاہ والی بات ہوئی تھی آنا فارشتہ طے ہوا اور کشمال کی نانی کی طبیعت کے پیش نظر محض چند روزہ دن بعد کی شادی کی تاریخ بھی طے کر دی گئی تھی سلیقہ بیگم کو اتنی جلدی پر اعتراض ہوا تھا مگر زمرس بیگم بہو کے کسی ایک اعتراض کو خاطر میں نہ لائی تھیں گھر میں شادی کے ہنگامہ جاگ اٹھے تھے سلیقہ بیگم نے بڑی شاندار بری تیار کی تھی اور مایوں کا دن آن پہنچا تھا مایوں میں بس چند ایک رشتے داروں اور محلے کی چند لڑکیوں کو ہی مدعو کیا گیا تھا چونکہ زیادہ لوگ نہ تھے اس لئے خواتین کے لئے صحن میں اور مردوں کے لئے چھت پر انتظام کر دیا گیا تھا ہوزان بے حد خوش تھی اور بڑے لہک لہک کر بزمے کے گیت گار رہی تھی بزم رنگ کے اچیلے کرتے اور زرد باجامہ میں زرد و سبز چڑی کا پٹ پٹنے کھینچے لئے بالوں کو پراندے میں قید کئے وہ گاؤں کی خیال رنگ رہی تھی یاسر کی مایوں کی زم ہوئی تھی جس میں ہوزان پیش پیش تھی وہ عروسہ کے اشارے پر اس کی جانب بڑھی تھی کہ اس کے

قدموں میں کاغذ کا ایک گولہ آن گرا تھا وہ ہر اسال سی اٹھانے کو جھکی تھی کہ اس سے قبل ہی ایک رشتہ دار خاتون اس کو لے کر آچک گئی تھیں اور کاغذ سیدھا کر رہی تھیں کہ ہوزان کی جان لبوں کو آگئی تھی مانتے پر شہمی قطرے ابھرے لگے تھے خاتون اردو پڑھنا جانتی تھیں ان کی نظرس کاغذ پر پھیلی تھیں اور طوفان آ گیا تھا اچھی بھلی محفل خراب ہو گئی تھی پوری محفل ہوزان پر تھو تھو کر رہی تھی اور وہ بولے جوگی نہ رہی تھی سلیقہ بیگم اور زمرس بیگم بھی کہاں اس افتاد کے لئے تیار تھیں کوئی زمرس بیگم کو سنار ہا تھا تو کوئی سلیقہ بیگم کی تربیت پر انگلی اٹھا رہا تھا۔

”ادنبہ! صورت مومنہ حرکتیں کا فرماں۔“ ایک خاتون کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور وہ لپک کر دادی کا بازو دھام گئی تھی۔

”دادو! آپ جانتی ہیں ناں میں ایسی نہیں ہوں۔“ وہ سکی تھی اور جھگوٹیاں کئی گنا بڑھ گئی تھیں مرد بھی چھت سے اتر کر صحن میں چلے آئے تھے ولید صاحب کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی تھی۔

”ایسی کی ہے بیٹی کی پرورش کے عاشقوں کے خط گھر تک آتے ہیں۔“ محلہ کی ایک خاتون نے محل فشانائی کی تھی وہ ہوزان کی حسین صورت سے نفرت کرتی تھیں کہ وہ خود عام شکل و صورت کی تھیں اور دونوں پیشیاں بھی قبول صورت تھیں بڑی بیٹی کے رشتے کی بات چل رہی تھی اور عین موقع پر ہوزان کھیر کی پیالی لئے ان کے یاں پہنچ گئی تھی لڑکے والوں نے ان کی لڑکی تو پھر دیکھی بھی نہیں اور تمام توجہ ہوزان پر لگ گئی وہ تو اسی وقت کھٹک گئی تھیں اگلے دن رشتہ سے یہ کہہ کر کہ لڑکی کا رنگ بہت کالا ہے رشتہ سے انکار ہو گیا تھا اور اس کے اگلے ہی دن وہ لوگ ہوزان کا رشتہ لے کر پہنچ گئے تھے انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے لڑکے کی ماں کو ہوزان کے گھر کی دلیز پار کرتے دیکھا تھا تب سے ہی انہیں

ہوزان سے ایک طرح کا ہیر ہو چلا تھا اور اس نفرت کو نکالنے کا انہیں آج بہترین موقع تھا لگا تھا اس لئے وہ لگے ہاتھ بہتی لڑکیاں تھیں جو کئی کئی کچھ کہہ رہا تھا تو کسی کی زبان نہ ہر اکل رہی تھی۔

”آپ سب جب کر جائیں مجھے میری بیٹی پر پورا بھروسہ ہے یہ ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتی جس سے ہماری عزت پر آج آئے۔“ ولید صاحب دھیمے سے مگر سکون سے بولے تھے کیونکہ انہیں اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ تھا۔

”آج آنے کی بات کرتے ہو میاں تمہاری بیٹی تمہاری عزت خاک میں ملا چکی ہے اس کے عاشق نامدار کے خط کا بغور مطالعہ کر لو لگ جائے گا پتہ تمہاری بیٹی کتنی دودھ کی دھلی ہے۔“ خط ایک ہاتھ سے ہوتا دوسرے ہاتھ تک کا سفر کرتا چلا جا رہا تھا کہ احسن صاحب تک بھی پہنچ گیا تھا احسن صاحب ان کے محلے میں دے تھے ان کی اہلیہ وفات پا گئی تھیں ان کی اپنی پرچون کی دکان بھی جس کو اب میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کا بیٹا بھی ان کے ساتھ مل کر چلانے لگا تھا اور احسن صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے ہوزان کا رشتہ ڈالا تھا جس سے معذرت کر لی گئی تھی اور وہ اس بات کو گناہ بنا کر دل میں رکھے بیٹھے تھے اور اب بہتی لڑکیاں ہاتھ دھو رہے تھے ولید صاحب نے بس ایک تیز نظر ان پر ڈالی تھی اور ان کے ہاتھ سے وہ کاغذ چھپ لیا تھا۔

”اس کاغذ میں جا ہے کچھ بھی لکھا ہو آپ سب جا ہے کچھ بھی سوچیں سمجھیں مگر مجھے اپنی بیٹی پر پورا بھروسہ ہے۔“ وہ کاغذ ہوا میں لہرا کر چنچے تھے ان کی آواز اس قدر بلند تھی کہ یکدم ہی سکوت چھا گیا تھا۔

”جیسے اس خط پر یقین ہے وہ ابھی اسی وقت یہاں سے جا سکتا ہے مجھے ایسے کسی بھی انسان سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا جو میری بیٹی کے کردار پر انگلی اٹھائے تہمت لگائے۔“ ولید صاحب کا انداز بے لگ تھا۔

”تہمت کوئی نہیں لگا رہا صاف سامنے کی بات

ہے بیٹی کی پشت پناہی کرنے کے بجائے اس کی نیک تربیت کی ہوئی تو آج یوں رسوا نہ ہو رہے ہوتے۔“ احسن صاحب کی زبان پھر انگارے اٹھنے لگی تھی۔

”ابھی میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے مگر میری بیٹی پاکدامن ہے اس کی سوچ آئینہ کی طرح شفاف ہے اور یہ وقت ضرور ثابت کرے گا آپ سب لوگ جا سکتے ہیں۔“ ان کا دل کر رہا تھا کہ وہ احسن صاحب کا منہ توڑ دیں مگر مصلحت کا تقاضہ تھا کہ وہ چپ رہے اس لئے انہوں نے انہوں نے ملاستی نظر ان صاحب پر ڈالتے ہوئے انہیں جانے کا کہہ دیا تھا۔

”ہاں ہم جا رہے ہیں جس گھر کی لڑکی کو یوں بھری محفل میں گلابی عاشقانہ محبت نامہ ملے ہوں اس گھر کا پانی بھی ہم جیسے نرلیوں پر حرام ہے۔“ احسن صاحب باہر کی طرف بڑھے تھے۔

”کوئی تمہوے کا بھی نہیں اب تمہارے گھر پر جو کارنامہ تمہاری بیٹی سرانجام دے چکی ہے اس کے بعد تو تمہاری دلہیز پر ہی بوڑھی ہوگی کہ اس چلی لڑکیوں کو کوئی نہیں اپناتا۔“ وہی بوڑھن جو بیٹی کا رشتہ ختم ہو جانے پر خار کھائے بیٹھی تھیں نفرت سے پھٹکار تھیں باہر کی طرف بڑھی تھیں چند ایک اور قدم آگے بڑھے تھے کہ ایک ٹھہری مردانہ آواز نے ہر اٹھتے قدم کو جکڑ لیا تھا۔ حیرانگی سے گردنیں مڑی تھیں اور مبسم خان پر حیرت بھری نگاہیں ٹھہر گئی تھیں۔

”اس بھری محفل میں کوئی یہ ماننے نہ مانے کہ ہوزان ولید معصوم اور باکردار ہے میں مبسم خان اس بات کو نہ صرف تسلیم کرتا ہوں بلکہ ثبوت کے لئے میں ہوزان سے شادی کے لئے بھی تیار ہوں کوئی نہ اپنائے میں اپناؤں گا۔“ وہ ہر ایک پر اکتی ہوئی زبان کو یکدم خاموش کر دیا گیا تھا نرگس بیگم اور سلیمہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو ٹھہرنے لگے تھے یاسر اور ولید صاحب کو ایک دم لگا تھا جیسے وہ پھر سے سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

”ارے میاں تم تو باؤ لے ہو گئے ہو جوانی کا ہوش ہے سارا کہ ہوزان کی خوبصورتی کو دیکھتے ایسا فیصلہ کرنے چلے ہو جو تمہاری نسلوں کو تباہ کر دے گا تم ایک ایسی عورت جس کو سر محفل پر فتنے لیں اپنی نسلوں کا اتین بنانا چاہتے ہو شایاں ہے تم پر مگر اپنی ماں سے پوچھ لو وہ اس آوارہ بد چلن لڑکی کو ہو بنانے کے لئے راستی بھی ہیں یا نہیں۔“ کسی دور کی رشتہ دار خاتون نے زبان کے جوہر دکھائے تھے۔

”مجھے ہوزان پر اتنا ہی بھروسہ ہے جتنا اپنی بیٹی پر ہے۔“ مبسم خان کی ماں کی بات نے تمام فیصلہ کر دیا تھا مخالفین ناک بھوں چڑھاتے باہر نکل گئے تھے ہوزان نے بس ایک منہ ناک نگاہ مبسم خان پر ڈالی تھی اور وہاں سے نکل گئی تھی۔

ہوزان نہ جانے کب سے مبسم خان کو اپنے دل میں بسائے ہوئے تھی آج اس کا بھری محفل میں نکاسر ڈھانپ کر اس نے گویا محبت کی لاج رکھ لی تھی مبسم خان کو ہوزان سے محبت تھی مگر عمروں کا فرق اور مالی حیثیت کا فرق ایسا تھا کہ وہ محبت کو دل میں چھپائے بیٹھا تھا مگر ہوزان پر اٹھتیں انگلیاں ہر فرق کو بنائیں تھیں ولید صاحب نے مبسم خان اور اس کی ماں سے دوبارہ پوچھا تھا مگر وہ اسے فیصلے پر قائم تھے یہ نے والے تماشہ کے باعث یاسر کی شادی ختم ہو گئی تھی لڑکی والوں نے رشتہ سے صاف انکار کر دیا تھا اور جس ہال میں یاسر کا ولید ہوتا تھا اس میں ہوزان کی برات ہونا مقرر کر دی گئی تھی ہوزان کی دوستی جو یاسر کی مایوں میں شریک نہ ہوئی تھیں کہ بہت ہی مختصر اہم کو بلایا گیا تھا عروسہ البتہ اپنے کزن کی شادی میں حیدر آباد گئی ہوئی تھی واپسی پر اسے پتہ چلا تھا کہ ابہ اور جویریہ سے بھی کچھ چھپا نہیں رہا تھا ان بیٹیوں نے ہی ہوزان کی گواہی دی تھی دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو گیا تھا مبسم خان کی والدہ کے سامنے ان بیٹیوں نے ہر بات کہہ دی تھی مبسم خان شادی سے

پہلے ہی ہوزان کے بے گناہ ثابت ہو جانے پر مطمئن تھا اور اس نے اس آوارہ لڑکی کی تلاش شروع کر دی تھی جس کے باعث ہوزان کی زندگی بھری نیک نامی خاک میں مل گئی تھی مبسم خان کی ماں نے بڑی عجلت میں محض ڈھائی دن میں بیٹے کی بری تیار کر لی تھی وہ روایت کے مطابق سات دن مایوں نہیں بیٹھی تھی آج اس کی مایوں بھی اور صبح برات وہ ساری بات صاف ہو جانے اور محبت ملنے کی خوشی سے سرشار تھی مبسم خان بھی بے حد خوش و مطمئن تھا اس نے وقت پر ہوزان پر بھروسہ کر کے سب کا ہی نہیں ہوزان کا بھی دل جیت لیا تھا وہ ماضی سے نکلی تھی اور کھڑکی بند کرتی واپس بیٹ پر آ کر لیٹ گئی تھی اس کی آنکھوں میں مبسم خان کا چہرہ تھا وہ مسکراتی تھی اور اس نے آنکھیں موند لی تھیں جاگتی آنکھوں سے خواب سجاتی وہ خواب میں بھی بے حد خوش و مطمئن تھی۔

☆☆☆☆

مبسم خان قلیل وقت میں بھی بڑی دھوم دھام سے بڑی شان سے برات لے کر آیا تھا مبسم خان کی ماں اور بہنیں ہر دم میں پیش پیش تھیں مبسم خان وائٹ شیر وائی اور میروں کٹے میں اگر شہزادہ لگ رہا تھا تو ہوزان سرخ رنگ کے شرارے میں زیورات پہنے آسمان سے اتری ہوئی کوئی پری لگ رہی تھی سہاگ کے جوڑے نے اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا دیے تھے اوپر سے محبت کو پالنے کی خوشی سب کی نظروں میں سرخرو ہو جانے کا احساس اس کے لبوں پر الوہی مسکراہٹ سج گیا تھا ہوزان ولید نکاح کے مین بولوں کے ساتھ ہوزان مبسم بن گئی تھی نوٹیشن ہوا تھا اور رخصتی کے وقت وہ والدین سے مل کر بہت روٹی تھی دادی سے مل کر تو اس کی بچکیاں بندھ گئی تھیں یاسر نے ہی اسے سنبھالا تھا اور وہ مبسم خان کے ساتھ رخصت ہو گئی تھی مبسم خان کے والد تو خیر حیات نہیں تھے مگر اس کی والدہ شہناز

خان بخوبی بیٹے کے جذبات سے واقف تھیں، انہیں بھی ہوزان پسند تھی، جن حالات میں شادی ہوتی تھی اس کے باوجود انہوں نے بہو کے استقبال میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی ان کے چھوٹے سے گھر میں ہوزان کا شاندار استقبال ہوا تھا، مبسم خان نے اپنی محبت کی داستان حرف بہ حرف کہہ ڈالی تھی، ہوزان شرمائی رہی تھی اس کے منہ سے یہ نہیں نکل سکا تھا کہ وہ بھی مبسم خان سے بے حد محبت کرتی ہے، مبسم نے اسے منہ دکھائی میں سونے کی انگوٹھی دے دی تھی ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

مبسم خان کے کہنے پر اس نے اپنی تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کر دیا تھا اور سیکنڈ ایئر کی کلاسز کا آغاز ہوتے ہی وہ کالج جانا شروع ہو گئی تھی، اس کو کوئی اعتراض نہ تھا اور آگے بھی انہیں کوئی اعتراض نہ ہوا اس لئے وہ کالج جانے سے قبل سب کا ناشتہ بناتی تھی، اس کی ایک نند شادی شدہ تھی جبکہ دوسری چھوٹی نند عالیہ نے گریجویشن کیا تھا اور گھر پر ہی ہوتی تھی، دو پہر کے کھانے کی ذمہ داری کھانا بنانے سے کچن کی صفائی تک عالیہ کے سپرد تھی اور وہ رات کا کھانا اور ناشتہ بنایا کرتی تھی اور کوئی مہمان آجائے یا اس کی بڑی نند تمام تر ذمہ داری اس کے ہی سپرد تھی وہ کم عمری کے باوجود نیک تربیت کے ساتھ ہر ایک کی ذمہ داری کو احسن طریقے سے سرانجام دے رہی تھی اس کی ساس اور نند کو اس سے کوئی شکایت نہیں تھی، زندگی بڑے خوشگوار انداز میں آگے بڑھ رہی تھی، مبسم صبح کالج جاتا تھا اور شام میں اکیڈمی گھر کا نظام اچھے سے چل رہا تھا، رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہونے والا تھا اور ہوزان دوسرے جی سے بھی روزہ رکھ کر کالج جانا پھر محرمی و افطار کے ساتھ رات کے کھانے کی تیاری اس کی طبیعت کچھ بگڑ گئی تھی ڈاکٹر کی ہدایت پر اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی روزے چھوڑ

دیئے تھے وہ بستر کی بوکر رہ گئی تھی ایسے میں اس کی ساس اور نند کا منہ بنا ہوا تھا، بڑے مناس کو بہت کچھ سمجھا رہے تھے اور وہ حوصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی جتنی عبادت اس کے بس میں تھی وہ کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ گھر کو لے کر چل رہی تھی جمعہ کا روزہ بھی رکھ لیتی تھی، بیوی کی حالت پھر اس پر اتنے کام، مبسم کو بہت کچھ نظر آ رہا تھا مگر وہ مصلحتاً خاموش تھا کہ ماں سے کیا کہنا، بہن کو ایک بار بھابھی کا ہاتھ بٹانے کا کہہ گیا تھا اس کا بی افسانہ بن گیا تھا اور وہ اب چپلی لگا کر بیٹھ گیا تھا، رمضان کا مہینہ بخیر و عافیت گزر گیا تھا، عید پر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ تھا اس کی بی بی عید بھی مگر وہ آج عید کا تیسرا دن ہونے کو آیا تھا اپنے میکے نہیں گئی تھی مبسم کو سب نظر آ رہا تھا مگر وہ یہ ماں سے کہتا تو کیا، بیوی کو ہی صبر کی تلقین کرتا عید کے تیسرے دن کوئی سات بجے کے بعد اسے میکے لے کر آیا تھا، اس کی رنگت کلائی تھی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے نرم گینگم تو پوتی کو دیکھ کر ہی تڑپ اٹھی تھیں، انہوں نے مبسم کو بڑی شکوہ کناں نگاہ سے دیکھا تھا اور وہ شرمندہ ہو گیا تھا، 9 ماہ جیسے تیسے گزر ہی گئے تھے ہوزان نے ایک بے حد خوبصورت بچی کو جنم دیا تھا، مبسم اور ہوزان بے حد خوش تھے مگر اس کی ساس کا منہ بنا ہوا تھا وہ برائے گئے کے سامنے پوتا نہ ہونے کا شکوہ لے کر بیٹھ جاتیں تھیں اور ہوزان تو بس شہناز کے ہرون کے ساتھ بدلتے روہیے پر ہی حیران تھی وہ نجیثیت ماما ایک شفیق خاتون تھیں اور شادی کے بعد ساس بھی اچھی ثابت ہوئی تھیں اس کی نند بھی اچھی تھی مگر دیکھتے دیکھتے ان کے رویے بدل گئے تھے وہ وجہ سمجھنے سے قاصر تھی اس کی نند کی عمر تیس برس ہو گئی تھی اور اب تک شادی نہیں ہوئی تھی رشتے آتے تھے اور دیکھ کر چلے جاتے تھے اور وہ جو یہ سوچ کر حیران و پریشان ہوتی تھی کہ شہناز خان اتنی بادل کیسے گئیں یہ معر بھی حل ہو گیا تھا، عالیہ کو دیکھتے کچھ لوگ آ رہے

تھے اور انہوں نے ہوزان کو میکے جانے کا کہہ دیا تھا، اس کے بعد اس پر کچھ تھا کہ عالیہ کے لئے جو بھی رشتہ آتا تھا وہ ہوزان کو دیکھ کر مایوسی سے پلٹ جاتا تھا، اس کی خوبصورتی جو پہلے اس کے لئے عذاب ہوئی تھی اب اس کی نند کے رشتوں کی راہ میں حائل ہوئی اس کے لئے مشکلات پیدا کر گئی تھیں وہ ساس کو پتہ کہنے کے بجائے میکے چلی آئی تھی اور پھر یہی سلسلہ چل پڑا تھا عالیہ کے لئے کوئی رشتہ آتا تو وہ میکے سدھار جاتی، اسے اپنی ساس کا رویہ اب اتنی تکلیف نہیں دیتا تھا کہ اسے اپنی ساس کی بجوری کا احساس ہو گیا تھا وہ جو ہر آئے گئے کے سامنے عالیہ کے گن گانے لگی تھی، اس نے خود کتنے ہی لوگوں کو رشتہ کے لئے کہا ہوا تھا اور ماہ و سال کی کوشش کے بعد چوبیس برس کی عمر میں عالیہ اپنے گھر کی ہو گئی تھی عالیہ کی ساس نندیں اچھے بیٹھے اسے سنایا کرتی تھیں۔

”لوگوں کی اتنی حسین چاندی بھابھیاں ہوتی ہیں ایک ہمارے بھائی کی قسمت کہ سانولی سلونی سی لڑکی پلے بندھ گئی۔“ عالیہ کی شادی کے بعد ہوزان کو انا تھا کہ اب عالیہ کا رویہ ٹھیک ہو جائے گا مگر چنداں تبدیلی نہ آئی تھی بلکہ کچھ اور بگاڑ پیدا ہو گیا تھا ساس الگ اکھڑی اکھڑی رہتی تھیں۔ تین سال گزر گئے تھے اس کی بی بی پری دس دو سال کی ہو گئی تھی، آج کل وہ پھر امید سے تیسرا مہینہ چل رہا تھا کہ اچانک ہی مبسم خان کی جاب ختم ہو گئی تھی اس پر طلبہ کے مارکس کے حوالے سے دیا ہوا رانیوٹ کالج تھا ہر بائبل کا طالب علم کالج میں زیر تعلیم تھا، دولڑکے ہائی سکول سے تعلق رکھتے تھے پڑھنے میں ناکارہ اور آوارگی میں نہروں مبسم خان نے ان دونوں کو ان کے پیپر کو مد نظر رکھ کر ان کی محنت کے عین مطابق مارکس دیئے تھے جو ان دونوں کو ہی پسند نہیں آئے تھے اس پر مارکس بوہانے کا دیا ہوا تھا اور اس کے انکار کا نتیجہ بالآخر یہ نکلا تھا کہ اسے نوکری سے برخاست

کر دیا گیا تھا اس کی ایمانداری اس کی زندگی کو کھنسن بنا گئی تھی جو کچھ جمع ہوئی تھی وہ عالیہ کی شادی پر خرچ ہو گئی تھی عید تہوار بہنوں کے گھر عید الگ پہنچانی جاتی تھی ان کے میکے آنے اور قیام کرنے کا الگ خرچہ تھا، بیوی اور بیٹی کی ذمہ داری الگ تھی بیٹی کے اسکول کی فیس اور ماں کی دوائیوں کا خرچہ کیس بجلی کے بل اور مہینے بھر کے راشن کی فکر سب بڑے آرام و سہولت سے چل رہا تھا کہ نوکری ختم ہوئی تھی کہ زندگی ٹھن ہو چلی تھی، اکیڈمی سے ملنے والی سیکریٹری کا بھی مبسم خان دوڑ دھوپ میں لگا تھا مگر جاب بھی کمرل کر نہیں دے رہی تھی اوپر سے بیوی تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی تھی گھر کے حالات انتہائی خراب ہو چکے تھے ہوزان جس نے انٹر ریگولر کرنے کے بعد گزشتہ سالوں میں پرائیویٹ کرپوٹ کر لیا تھا اس نے گھر کے حالات کو دیکھتے ہوئے گھر کے نزدیکی اسکول میں ٹچنگ اسٹارٹ کر دی تھی حالات وہی تھے کہ پرائیویٹ اسکول والے اتنی سیکریٹری تو دیتے نہیں کہ اس کے دن یکدم خوشحالی میں بدل جاتے مبسم کے لئے یہ سب تکلیف دہ تھا مگر حالات نے اسے جب رہنے پر مجبور کر دیا تھا، اس نے کئی ایک جگہ اپلائی کیا ہوا تھا مگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا، اس نے ٹیکسٹری میں کام کرنا شروع کر دیا تھا جس کی مائمنگ صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک کی تھی، سیکریٹری مناسب بھی اس لئے اس نے اکیڈمی کی جاب چھوڑ دی تھی، وقت گزر رہا تھا اس نے بیوی کو کہہ دیا تھا کہ وہ جاب چھوڑ دے مگر مبسم کی اتنی مشقت طلب جاب کے باوجود سیکریٹری پہلے جتنی نہ تھی اس لئے اس نے جاب جاری رکھی تھی ساس کا رویہ اب کافی بہتر تھا وہ گھر کے کاموں میں اس کی مدد بھی کر دیا کرتی تھیں اور پری دس تو اب زیادہ رہتی ہی دادی کے پاس بھی وقت تیزی سے گزر رہا تھا اس کی ڈیپری کا آخری مادہ تھا مبسم زور ڈال رہا تھا کہ وہ اسکول کو خیر باد کہہ دے

مگر اس نے مبہم کو راضی کر لیا تھا اس نے ایک بہت پیارے گول منول سے بچے کو جنم دیا تھا اس کی ساس بہت خوش تھیں انہوں نے قلم درشت داروں میں مٹھائی بانی تھی سو امینے کے بعد اس نے اسکول پھر سے جوائن کر لیا تھا مبہم اپنی دادی کے پاس رہتا تھا جبکہ پری دس اسکول چلی جاتی تھی رمضان المبارک کی آمد آمد تھی اس نے اپنی سلیری جو اتنے دن جمع کر کے رکھی ہوئی تھی مبہم کے ہاتھ پر رکھ دی تھی اور وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا تھا۔

”آپ کہتے تھے ناں کہ جاب چھوڑ دو تو میں اس لئے نہیں چھوڑ رہی تھی کہ بڑھتی ہوئی مہنگائی میں قلیل آمدن کے ساتھ روزمرہ کی ضروریات پوری ہو جانی ہیں یہی بہت ہے کہ عید کی تیاری اور پر سے بہنوں کی عیدی کا انتظام ہو جائے۔“ اس نے میسے دینے کی وجہ بتائی تھی مبہم کی غیرت پر چوٹ تو تھی مگر حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ خاموشی سے وہ رقم لے گیا اور ماں کو دے دی تھی رمضان سے پہلے پہلے ہی شہناز خان نے بیٹیوں اور نواسیوں کے لئے کپڑے جوئے خرید کر عیدی کا انتظام کر لیا تھا رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو گیا تھا وہ گھر جاب اور عبادات سب کو ساتھ ساتھ لے کر چل رہی تھی اس کے لئے مشکل تھا مگر رب نے اسے ہمت عطا کر دی تھی آخری عشرہ سے قبل مبہم کو بھی نہیں ہوزان کو بھی سلیری مل گئی تھی اس نے شوہر کی سلیری تو اٹھا کر بیش کی طرح ساس کے حوالے کر دی تھی کہ اب تک وہی گھر کا نظام چلا رہی تھیں اپنی سلیری سے اس نے دونوں بچوں اور ساس کے لئے عید کے کپڑے بنائے تھے اب اس کے ہاتھ میں اتنی بھی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنے مبہم کے لئے عید کے کپڑے بنائیں مگر وہ مطمئن تھی اس نے بھی بھی حالات کا ردنا رد کر رب کی ناشکری نہیں کی تھی وہ ہر حال میں رب کا شکر ادا کرنے والی ایک صابر شاکر عورت تھی اس نے مبہم کو کبھی کسی بھی بات کے لئے

پریشان نہیں کیا تھا ساس مند کے برے رویے کی کبھی شکایت نہیں کی تھی اور برے حالات میں اس کی ڈھال بن کر کھڑی ہوئی تھی وہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں طاق راتوں میں قیام و عبادت کا خصوصی اہتمام کر رہی تھی سلیقہ بیگم اپنی بہو کے ساتھ اس کی عیدی لے کر آئی تھیں نرگس بیگم بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ بڑھاپا اور پر سے بیماری وہ نہیں آنے جانے سے قاصر تھیں سیال بھر پہلے یاسر کی شادی ہوئی تھی نذر ایک اچھی لڑکی تھی بڑوں کا احترام کرنے والی ایک منسا گھر پلو لڑکی جیسے اس گھر کی بیٹی ایک اچھی بہو ثابت ہوئی تھی ویسے ہی ان کی بہو اچھی بہو سے بڑھ کر ایک بیٹی ثابت ہو رہی تھی کہ جو خود غلوں و جاہت کی روشنی نکھیرتے ہیں ان کی زندگی میں بھی اندھیرے نہیں آتے رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ فیوض و برکات سے ان کی زندگی منور کرتا اختتام کی جانب بڑھ رہا تھا الوداع کا جمعہ تھا اس نے بچوں کو نہلا کر تیار کیا تھا آج اس کی آنکھ بار بار پڑھ رہی تھی اسے اپنے میکے کی یاد آ رہی تھی اسے میکے میں گزارے رمضان کے دن اور جمعہ الوداع کا خوبصورت دن شدت سے یاد آ رہا تھا اس کی دادی سالہا سال کپڑے نہیں بناتی تھیں وہ رمضان کے ہر جمعہ کے چار جوڑے اور عید کا ایک جوڑا بناتی تھیں اور یہ پانچ جوڑے ان کے پورے سال چلتے تھے سلیقہ بیگم پر پابندی نہیں تھی وہ سالہا سال جب بھی موقع بے موقع دل کرتا کپڑے بنالیا کرتی تھیں مگر ان کے بھی یہ پانچ جوڑے لازمی تھے جو نرگس بیگم خود ہو کر بنا کر دیتی تھیں اور آج وہ بچوں کو تیار کرتے ہوئے جب خود وہی پرانا سوٹ پہن کر کھڑی ہوئی تھی تو آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے رمضان کے چار جوڑے پہننے والی نے گزشتہ دو سال سے ایک نیا جوڑا نہیں بنایا تھا رمضان کے تین جمعہ بھی یوٹی گزر گئے تھے الوداع کے جمعہ پر اس کا دل بھر بھر آیا تھا اس کی بے حد

ناہوشی کو شہناز خان نے ہی نہیں مبہم نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر وہ بس کرنا لگتی تھی مگر مبہم خان بھند نہ آیا تھا اور اس نے کہہ دیا تھا کہ دادی یاد آ رہی ہیں اور اسے میکے لے جانے کے لئے تیار ہو گیا تھا اس کا دل تو کیا تھا کہ وہ اڑ کر میکے پہنچ جائے اپنی دادی ماں اور باپ کے پاس لیکن وہ ایسا نہیں کر پاتی تھی۔

”پھر کبھی چلیں گے مبہم! آج طبیعت کچھ اچھی نہیں ہے۔“ وہ فکر مند ہوتے شوہر کو دیکھتے

”کیا میرا اتنا جتن حق نہیں ہے کہ میں تمہاری اسی کا سبب جان سکوں۔“ وہ بیوی کا ہاتھ تھامتے ”سارے حق آپ کے ہی تو ہیں مبہم! آپ پریشان نہ ہوں سچ میں کوئی بات نہیں ہے بس آج میکے کی بہت یاد آ رہی تھی جمعہ الوداع کے دن دادو بہت اہتمام کرتی تھیں افطاری محلہ میں بڑھائی تھیں رمضان المبارک کے جمعہ الوداع کی ظہر کی نماز سے قبل صلوٰۃ الخیر کا اہتمام کرتی تھیں دادو بلند آواز سے پڑھتی تھیں اور میں اور اماں ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے تھے دادو طبیعت نادر و نکوالتی تھیں آج دادو بہت یاد آ رہی ہیں۔“ وہ شوہر کو دیکھتے دیکھ کر نرگس سے بولتی چلی گئی تھی اور وہ کم گو زبان کی اتنی طویل گفتگو خاموشی سے سن رہا تھا۔

”میں تو کہہ رہا ہوں چلیو دادو سے مل آتے ہیں تم ہی منع کر رہی ہو۔“ وہ کچھ دیر قبل ہی تو عشاء کی نماز اور تراویح سے فراغت کے بعد گھر آیا تھا وہ بیوی کے نامصورت چہرے کو محبت سے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

”وقت زیادہ ہو گیا ہے سحری میں اٹھنا بھی ہوتا ہے ہم بھی پریشان ہوں گے اور دادو وغیرہ بھی اس لئے چلیں گے۔“ وہ بڑی سہولت سے ٹال گئی تھی وہ بولنے کے باوجود جانتا نہیں جانتی تھی کہ وہ آج اپنے کپڑے پہن کر اپنے گھر جا کر اپنے شوہر کی بے عزتی نہیں کروانا چاہتی تھی نہ ہی وہ میکے والوں کو

پریشان کرنا چاہتی تھی اس لئے وہ جاہت کو دل میں دبائے مسکرائی تھی مگر جانے کیا بات تھی کہ آج صبح سے ہی نرگس بیگم بہت یاد آ رہی تھیں مبہم اس کے منع کرنے پر اس سے پرانی باتیں سن رہا تھا کہ اس کا سلیقہ مٹھانے لگا تھا رات کے دس بجے یاسر کی کال دیکھ کر اسے پریشانی ہوئی تھی اور اس نے کال ریسیو کی تھی اور جو کچھ یاسر نے کہا تھا اسے تڑپا کر رکھ دیا گیا تھا ہوزان نے یکدم بہت پریشان ہو جانے والے مبہم کو دیکھا تھا اور اس نے بیوی کا ہاتھ تھام کر اسے دل دکھا دینے والی خبر سنائی تھی۔

”دادو! اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔“ ہوزان کو یقین ہی نہیں آیا تھا وہ تڑپ اٹھی تھی اسے سنبھالنا مبہم کے لئے مشکل ہو گیا تھا ہوزان کو کہاں اندازہ تھا کہ آج صبح سحری کے وقت سے اسے جو دادی بات بے بات یاد آ رہی تھیں تو اس لئے کہ وہ اب زندگی میں ان سے مل ہی نہیں پائے گی نرگس بیگم کی موت کا صدمہ ان سب کے لئے جان لیوا تھا باقی روزے اداسی کے ساتھ گزرے تھے چاند رات کو مبہم نے اسے مہندی اور چوڑیوں کے لئے مارکیٹ چلنے کا کہا تھا اور تو وہ رونے لگی تھی۔

”دادو کی موت کا دکھ ہمیشہ تازہ رہنے والا ہے ہوزان مگر جانے والوں کے ساتھ مرا تو نہیں جاتا۔“ وہ بیوی کا سر کااندھے سے لگائے دکھ سے بولا تھا۔

”مبہم! اپنوں کو کھونے کا مکمل ایک لمحہ کا ہوتا ہے جو تمام عمر پر محیط ہو جاتا ہے صبر آتے آتے زمانے گزر جاتے ہیں۔“ وہ مبہم کے کااندھے پر سر رکھے سسک رہی تھی مبہم جانتا تھا کہ وہ دادی سے بہت زیادہ اونچ تھی اس لئے اسے اتنی جلدی صبر نہیں آنے والا تھا۔

”ہوزان کچھ خوشی کے لئے ایسے ہوتے ہیں جن میں پوری زندگی قید ہو جاتی ہے اور وہ خوشی کے لمحے بھولنے نہیں ہیں ہر مشکل گھڑی میں وہی چند خوشی کے بل زاوراہ ثابت ہوتے ہیں۔“ وہ بیوی کو مثبت سوچ

دے رہا تھا اسے دکھ اور فزیشن سے نکلنے کی راہ دکھا رہا تھا وہ اس سے کہہ رہا تھا کہ وہ دادی کے ساتھ گزارے اچھے دنوں کو یاد رکھے اور ان کی مغفرت کی دعا کرے اس نے اپنے جیون ساتھی کو دیکھا تھا اسے دادی کی بات یاد آئی تھی جو انہوں نے اس سے مسامحہ سے اچانک رشتہ طے ہو جانے کے بعد کہی تھی۔

”مسام! بے شک تم سے عمر میں بڑا ہے اس کے گھر غربت ہے مگر تم اس کے ساتھ ایک خوشگوار زندگی گزارو گی کہ مرد اگر عورت کو عزت دیتا جانتا ہو تو عورت کی زندگی بڑی سہل ہو جاتی ہے۔“ اس نے مسکرا کر مسام کو دیکھا تھا اور دادی کی بات دہرائی تھی۔

”مجھے تم سے محبت تھی ہوزان اور میری آخری سانس تک مجھے تم سے محبت رہے گی تم میری زندگی ہو۔“ وہ ہوزان کا ہاتھ تمام کر محبت سے بولا تھا وہ اپنے رویے کے ساتھ ساتھ لفظی اظہار کرتے بھی کبھی نہیں چوکتا تھا وہ بے حد سرخ پڑ گئی تھی ہوزان کو یاد تھا کہ شادی کے تین ماہ بعد جب وہ ایک دن اپنے میکے آئی تھی وہاں ہی پر اس کی نگاہ اسی شخص پر پڑ گئی تھی جو اس کا نام نہاد عاشق تھا جس کے سبب اس کی زندگی میں طوفان آ گیا تھا اس نے کچھ کہا نہیں تھا مسام کو اشارہ کیا تھا اور وہ سب سمجھ گیا تھا اور مسام نے بھی اس نوجوان کو پہچان لیا تھا وہ ہوزان کی گلی کی پچھلی روڈ پر بنے مکانوں میں سے ایک میں رہتا تھا اور کافی بدنام تھا اس کا بیبی کام تھا وہ لڑکیوں کو اپنے چال میں محبت کو مہرہ بنا کر پھنساتا تھا اور جب وہ اس کی چال بازی میں آ جاتی تھیں تو پھر وہ انہیں بلک میل کرتا تھا ان سے رقم بڑا رتا زریعہ معاش کوئی تھا نہیں اسی طرح وہ زندگی گزار رہا تھا مسام نے اسے کچھ نہیں کہا تھا کہ ایسے لوگوں کو کچھ کہنا فضول ہوتا ہے اس کے دل میں اگر کوئی پھانس تھی تو وہ نکل گئی تھی۔

”شرابی ہوئی بے حد اچھی لگتی ہو۔“ وہ شرارت سے بولا تھا اس کی پلٹیں عارضوں کو سجدہ کرنے لگی

تھیں۔ مسام نے اسے مارکیٹ لے جا کر چوڑیاں اور عید کا جوڑا دلویا تھا اور وہ مہندی لگوا کر گھر آئے تھے صبح عید بے حد اس بھی دادی کی دغالت کا غم تھا مگر وہ سب کے ساتھ مل کر خوش ہو رہی تھی اپنے بچوں کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

”اکیلے اکیلے کیوں مسکرایا جا رہے۔“ وہ جو بیٹی کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی وہ منظر سے بھائی کا ہاتھ تھا غائب ہو گئی تھی اور مسام اس کے سامنے آن ٹھہرا تھا۔ ”آپ بھی مسکرائیں میں نے منع تو نہیں کیا۔“ وہ شرارت سے بولی تھی۔

”میری مسکراہٹ تو تم ہو۔“ وہ زریعہ لب مسکراتے ہوئے ہوا سے اڑتی اس کی درازت کو پہنچ کر بولا تھا اور وہ ایک دم کلکھلا رہی تھی عید کا دن تو خوشی کا پیامبر بن کر آیا تھا اس نے اپنے شوہر کو دیکھا تھا مسام اپنے نام کی طرح تھا ہر وقت مسکراتے والا وہ مسکراہٹ کی چھایا میں چھپا لینے والا اس نے مسکراتے ہوئے شوہر کے سامنے عیدی کے لئے ہاتھ پھیلائے تھا مہندی سے نجی پھل مسام حیدر کے سامنے پھیلی تھی۔

”اللہ نے تمہاری پھیلی پر میری تقدیر لکھ دی تھی تم میری شریک حیات، میری مسکراہٹ ہو تم۔“ وہ اس کے پھلے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ رہا تھا ہوزان کو یقین تھا کہ آئے بھی زندگی میں اگر بھی کوئی آزمائش آئے گی تو وہ مسام خان کے ساتھ اس کی مسکراہٹ تلے آرام سے اس آزمائش سے نکل آئے گی کہ جب جیون ساتھی ساتھ نبھائے والا ہو تو زندگی بہت خوبصورت گزرتی ہے دقتی پریشانیاں دکھ معنی ہی نہیں رکھتے۔

”اور میری ہر خوشی میری مسکراہٹ آپ سے ہے مسام!“ وہ ہنر نگ کی پشواڑ میں شرمائی شرمائی سی اس کے سامنے کھڑی لب چاتے ہوئے بولی تھی ”فضا میں مسام خان کا قہقہہ بھر گیا تھا ہوزان کو لگا تھا اسے اس کی عیدی ملی تھی وہ بھی مسکرا دی تھی۔

☆.....☆.....☆

دروازہ کا کئی ہمسر

اس جانب ہی آرہی تھی بچہ اب بھی مگلا بھاڑ رہا تھا خاتون کے ڈانٹنے کی آواز میں بھی مسلسل آرہی تھیں۔ ”سنو یہ غبارہ بھائی کو دے دو وہ رو رہا ہے ناں۔“ وہ دروازے پر کھڑی بچی کو غبارہ پکڑا کر آگے بڑھ گئی بچی بے یقینی سے اس انجینی لڑکی کو دیکھنے لگی لڑکی گلی کے آخری سرے میں جا کر دائیں جانب مڑ گئی جبکہ بچی پر مسرت انداز میں گھر کے اندر بھاگی تھی گھر کا دروازہ کھل گیا تھا اور عین اس لمحے اس کے دل کے دروازے پر گئے فاصل بھی کھل گئے تھے۔

☆☆☆☆

”جزاک اللہ امی“ وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی نے فوراً اسے پانی کا گلاس بھر کے دیا تھا وہ پانی پینے کے بعد ان کی شکر گزار تھی۔

”آج تو بہت گرمی ہے سورج تو باہر آگ پر سا رہا ہوگا۔“ وہ عیبیا کا اسکارف سر سے اتارتے گویا تھی دھوپ کی حد سے رخسار سرخ ہو رہے تھے۔

”کیا پکا نا ہے مجھے بتائیں۔“ وہ عیبیا اتار کر جگہ پر کھتی گویا تھی۔

”تم کچھ دیر آرام کرو میں پکالوں گی۔“ سعیدہ بیگم نے کہا تھا۔

”نہیں امی آرام کیا کرنا ہے آپ بتائیں میں جلدی سے کھانا بنا لیتی ہوں۔“ وہ کہتی ہوئی کمرے کی جانب بڑھ گئی منہ ہاتھ دھو کر وہ قدرے پرسکون ہو چکی تھی اور اب کچن میں کھانا بنانے کے لیے جت گئی تھی سعیدہ بیگم نے بغور اسے دیکھا تھا سبحان صاحب کے انتقال کے بعد وہ اپنے بھائی بہنوں کے لیے کیا

”اف کیا مصیبت ہے۔“ گاڑی میں بیٹھا بارن پہ بارن دیئے جا رہا تھا مگر گھر میں موجود نفوس کے کانوں میں شاید جوں تک نہ پہنچی تھی وہ سخت بیزار ہوا تھا سخت دھوپ دیکھ کر اس کی بہت نہ ہوئی کے اسے ہی کی ٹھنڈک کو چھوڑ کر باہر نکلے اور دروازے پر دستک دے۔

”شیر کے سارے ٹیلر زمر تھے ہیں جو بھائی نے ان خاتون کو پکڑے سینے کے لیے دیئے ہیں۔“ وہ اکٹا گیا تھا کافی انتظار کے باوجود دروازہ نہ کھلا تو مرنے کا کیا مکر تا کے مصداق وہ گاڑی سے نکل آیا اور دروازہ بجائے لگا اسکاٹی بیونی ٹرٹ بلیو جینز پہنے اسکاٹی بلیو سن گلاسز آنکھوں پر چڑھا لئے وہ بے حد ہنسنے لگا رہا تھا وہ بدستور دروازے پر کھڑا تھا جب گلی میں ایک غبارے والے کا گزر ہوا سامنے گھر سے ایک چھوٹا بچہ کھٹ سے دروازہ کھول کر غبارے والے کے پیچھے بھاگا اسے پکڑنے کی نیت سے ایک بچی اس کے پیچھے دوڑی تھی اور کھینچ تان کر اسے واپس لے کر گئی تھی دروازے پر کھڑی بچوں کی والدہ بچے کو زبردستی گھر کے اندر کھینچ چکی تھیں احتجاجاً بچہ ڈھانڈا اس کے رونے لگا تھا غبارے والا گلی کے کنارے پر کھڑا تھا اس نے کوفت سے تمام مناظر دیکھے تھے بچے کے رونے کی آواز اس کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح لگنے لگی تھی اس نے ایک زوردار دستک دی تھی اب ایک لڑکی غبارے والے سے غبارے خرید رہی تھی اس نے لڑکی کو دیکھا اسے اس لڑکی کی ذہنی حالت پر رشہ ہوا تھا سیاہ اسکارف کے بالے میں اس کی گلابی کھلی سفید بے داغ رنگت کو اس نے بغور دیکھا تھا وہ غبارہ پکڑے



کیا جن کرتی تھی اس بات کا انہیں بخوبی علم تھا دو پلاٹ پر بنا چھ کمروں کا مکان چار نفوس کے لیے کافی تھا اس لیے مکان کا ایک حصہ کرائے پر چڑھا دیا گیا تھا سجان صاحب نے ایک دکان بھی خریدی تھی اس کا کرایہ بھی ہر ماہ مل جاتا تھا یوں سجان صاحب کی غیر موجودگی میں زندگی کا پسہ بچھ جان کر چل رہا تھا کھر اور دوکان کے کرائے سے گھر کے اخراجات پورے نہیں پڑتے تھے اس لیے سید سجان گھر سے فریب و کیشل سینٹر میں لڑکیوں کو سلائی کڑھائی سکھایا کرتی تھی جس کے عوض اسے مینے کے آخر میں ایک مقول رقم مل جایا کرتی تھی شام کو بچے ٹیوشن پڑھنے آیا کرتے تھے ان پیسوں سے اچھے خاصے خرچے نکل جایا کرتے تھے سید سجان اپنے بھائی بہن کی خوشیوں کے لیے ہر وقت کوشش کیا کرتی تھی گریجویشن کے بعد اس نے اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اپنے بہن بھائی کی بہتر تعلیم کے لیے وہ دن رات محنت کیا کرتی تھی اپنی ادھوری خوشیوں کے باوجود وہ اپنے پیاروں کو مکمل خوشیاں فراہم کرنا چاہتی تھی۔

☆☆☆☆

”لے آئے میرے کپڑے؟“ روحان کو دیکھتے ہی فرحین نے استفسار کیا تھا۔

”جی آپ کے اس جوڑے نے بہت تھکا پاگل سے آج تک میں ان آئی کے گھر کے کتنے ہی چکر لگا چکا ہوں جو بولتی زیادہ اور سستی کم ہیں۔“ وہ ہیزی سے کہتے صوفے پر ڈھکے گئے۔

”پانی۔“ ارم نے مسکراتے ہوئے پانی کا گلاس اسے تھمایا تھا۔

”پانی کیوں بچے کو جوس بنا کر دو۔“ جمیلہ بیگم نے بیٹی کو پانی دینے پر کہا۔

جمیلہ روحان کی والدہ کی دور پرے کی رشتہ داروں میں تھیں مگر جب روحان پاکستان آیا کرتا تو وہ زیادہ تر ان کے ہی گھر میں پانی جاتی تھیں۔

”نہیں آپ سب ریڈی ہو جائیں ہم پہلے ہی لیٹ ہو چکے ہیں۔“ اس نے کلائی میں بندھی گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے کہا ارم خاصہ بن سنور کے آئی تھی مگر وہ دانستہ اس کی جانب دیکھنے سے اجتناب برت رہا تھا ارم کو اس کا انداز بری طرح کھلنے لگا اس کے پاکستان آنے کے بعد وہ کئی بار اس سے مل چکی تھی ہر بار روحان اس سے خوشی سے ملا تھا اور بہت پر شوق نظروں سے اسے دیکھا کرتا تھا اسے لگا وہ روحان کو اپنا گرویدہ بنا چکی ہے جمیلہ بیگم بھی بیٹی کی اس کامیابی پر خوش تھیں اور روحان پر واری صدتے ہو رہی تھیں مگر اب روحان کے انداز ان دونوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرنے لگے تھے۔

☆☆☆☆

”یہ کیا کر رہی ہو بیٹا۔“ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر وہ سلائی مشین نکالنے لگی تھی جب انہوں نے استفسار کیا۔

”کپڑے سینے ہیں امی۔“ اس نے دھاگہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں۔“ سعیدہ بیگم اس کے برابر بیٹھے گویا تھیں۔

”عید آنے والی ہے امی آپ کو تو پتا ہے فریحہ کو سننے کپڑوں کا کتنا شوق ہے وہ عید کس اہتمام سے منانے کی عادی ہے اس لیے میں نے اپنے اسٹوڈنٹس کو کہا تھا کہ اگر کوئی کپڑے سلوانا چاہے تو مجھے دے دے میں ٹیلر سے کم پیسوں میں سی دوں گی۔“

”آج ایک اسٹوڈنٹ نے چار جوڑے دیے ہیں ابھی تو رمضان شروع ہونے میں دو ہفتے باقی ہیں میں چاہ رہی ہوں رمضان تک اضافی رقم کا انتظام کر لوں تاکہ فریحہ اور سیر کی شاپنگ اچھی طرح ہو جائے۔“ وہ فیوزنگ پر گلے کا نشان بناتے گویا تھی۔

”اتنا مت تھکاؤ خود کو بیٹا فریحہ اور سیر بچے نہیں رہے وہ بھی گھر کے حالات سے واقف ہیں۔“ اس کی

باتوں کے جواب میں سعیدہ بیگم نے اسے سمجھانے کی سعی کی۔

”مگر میں نہیں چاہتی امی کے میرے بھائی بہن چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو ترسیں۔“ وہ سلائی کرتے مصروف انداز میں گویا تھی۔

”کیا کر رہی ہیں آپ؟“ فریحہ آنکھیں ملتی محن میں آئی تھی۔

”سلائی کر رہی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے آنکھیں کیوں سو جی ہوئی ہیں؟“ فریحہ سعیدہ بیگم کی گود میں سر رکھے لیٹ گئی تھی سیدہ نے بغور اسے دیکھتے سوال کیا۔

”سر میں بہت درد ہے۔“ اس نے جواب دیا اچھا! میں چائے بنا دیتی ہوں انشا اللہ آرام آجائے گا اگر شام تک طبیعت ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“ وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اس لڑکی کو اپنے علاوہ ہر کسی کی فکر ہے۔“ سعیدہ بیگم نے اسے کہن میں جاتے دیکھ کر کہا۔

”آپ بہت اچھی ہیں امی۔“ فریحہ کے لہجے میں بہن کے لیے محبت تھی۔

”ہاں بس اللہ اس بچی کے نصیب اچھے کرے۔“ سعیدہ بیگم نے دل کی گہرائیوں سے اسے دعا دی تھی۔

☆☆☆☆

”کیا ہوا تم پانی میں کیوں نہیں اترے؟“ بلیوز جینز وایت شرٹ میں ملبوس آنکھوں پر اسکاٹی بلیوسن گلاسز چڑھائے خوبصورت ہنسنے والی سلائی کے ساتھ ایک بڑے پتھر پر اسٹائل سے بیٹھے وہ کوئی ماڈل لگ رہا تھا اسے الگ تھلک بیٹھا دیکھ کر ارم اس کے پاس چلی آئی۔

”یونہی۔“ کولڈ ڈرنک کا شلیوں سے لگائے وہ بے نیازی سے گویا تھا۔

”چلو تا بہت مزہ آرہا ہے۔“ ٹائٹ ٹراؤزر اور بے حد فنگ کی میض بھجک جانے کی وجہ سے اس کے جسم سے مزید چمک گئی تھی دوپٹہ گیلیا ہو جانے کی وجہ سے رسی بن چکا تھا جسے پھیلانے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی گئی تھی وہ اس کے سراپے سے بے اختیار نظر چرا رہا تھا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا آپ جا کر مزے کرو۔“ اس کی دعوت پر صاف انکار کر کے وہ اٹھ گیا آنکھوں میں سیاہ اسکارف کے ہالے میں ایک خوبصورت چہرہ آن بسا پھر جیسے ہر شے ہر منظر نے دلکشی کھودی اسے اپنا آپ بھولنے لگا یاد رہا تو بس ایک پر نور چہرہ۔

☆☆☆☆

”طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی؟“ وہ جوڑا ملے کر کے اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی جب فریحہ کو بیڈ پر براجمان دیکھ کر استفسار کیا۔

”نہیں۔“ لہجے میں بے چارگی تھی۔

”میڈیسن کھالی ہے نا؟“ وہ اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بخار چیک کرتے ہوئے گویا تھی۔

”جی۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”آؤ میں آئل لگا کر مساج کر دوں۔“ وہ تیل کی شیشی کے ہمراہ اس کے برابر براجمان ہو گئی اور سر کی مالش کرنے لگی۔

”آپ مجھے اپنا فیر بدلنا ہے آپ مجھے نئی سم لے دیں۔“ اس نے آنکھیں سے کہا۔

”کیوں؟“ اس کے مساج کرتے ہاتھ تھم گئے اس نے پریشانی سے فریحہ کی پشت کو دیکھا تھا۔

”آپ ایک رانگ نمبر سے مجھے میج آتے ہیں وہ پتہ نہیں کون ہے جو میرا نام بھی جانتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے میں بہت پریشان ہوں۔“ اس نے اپنا مسئلہ بتایا تھا۔

”اچھا یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟“ سنجیدگی سے گویا تھا۔

سے سوال کیا۔ ”پچھلے ایک ہفتے سے“ اس نے رخ تسبیہ کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”اچھا۔ انداز پر سوچ تھا۔“
”میں اپنا نمبر بدل لوں گی۔“ فریج نے لب کشائی کی۔

”پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تم اس نمبر کو بلیک لسٹ پر لگا دو ایسے عاشق ہر گلی، محلے میں پائے جاتے ہیں جو کسی طرح نمبر حاصل کر کے لڑکیوں کو بے وقوف بناتے ہیں تم کمیشن نہ لو جواب نہ ملنے پر جلد ہی اکتا کر کسی اور طرف چل پڑے گا ف بھنورا صفت لوگوں کی سرشت میں گلی گلی منڈلانا ہی ہوتا ہے۔“

”اس نے فریج کو سمجھایا۔“
”لیکن آپ اپنی نمبر بدل لوں گی تو زیادہ بہتر ہوگا نا۔“ فریج نے اپنا نظریہ پیش کیا۔

”فریج خرابی کسی بھی چیز میں نہیں ہوتی بلکہ ہماری ذات کے اندر موجود ہوتی ہے جب تم اپنا ذہن صاف رکھو گی تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں خراب نہیں کر سکے گی تم نے سن رکھا ہوگا اکثر لوگ یہ کہتے ہیں کہ موبائل سے لڑکیاں خراب ہو رہی ہیں مگر میرا ماننا یہ ہے کہ لڑکیوں نے موبائل کا غلط استعمال کر کے لوگوں کو موقع دیا ہے لوگ موبائل کو خرابی کی وجہ سمجھیں چیزیں بھی بھی سچ یا غلط نہیں ہوتیں ہمارا استعمال اسے سچ یا غلط ثابت کر دیتا ہے اگر تمہاری ذات کے اندر خرابی نہ ہو تو تم اچھائی میں بھی برائی ڈھونڈ نکالو گی نمبر بدل لینا یا کسی بھی چیز کو تبدیل کر لینے سے اس وقت تک کچھ حاصل نہیں ہوتا جب تک ہم خود کو تبدیل لیں بے جان شے ہمیں غلط کام کرنے پر نہیں اکسایا کرتیں یہ ہمارا نفس ہے جو ہمیں برائی کی جانب دھکیلتا ہے بدلنا ہی چاہتی ہو تو اپنی سوچ کو بدلو کہ سچ کیا ہے یا غلط۔“ وہ کہہ کر ذرا دیر گور کی گئی۔

”آپ اپنی ایسا کوئی کام نہیں کروں گی جس سے آپ لوگوں کا سر شرمندگی سے جھک جائے۔“ فریج

نے یقین دلایا۔

”مجھے تم سے یہی امید ہے فریج اس لیے تم بے فکر ہو کر یہی نمبر استعمال کر دو کہ ہمیں یاد ہے فریج جب پاپا نے مجھے سیل فون لے کر دیا تھا تب امی کتنا خفا ہوئی تھیں لیکن جب میں نے موبائل کو صرف ضرورت کے تحت استعمال کیا تو امی نے خود تمہیں سیل فون دلا دیا تھا اگر ہم کوئی غلط کام کرتے ہیں نا تو اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی بہت سے دروازے بند کر دیتے ہیں اسی طرح ہمارا انتخاب مجھے کاموں کی جانب بڑھا ہوا قدم دوسروں کے لیے بھی راہیں ہموار کر دیا کرتا ہے ہمیشہ کوشش کرنا کہ تمہاری وجہ سے دوسروں کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی نہ ہو جائیں۔“ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے سمجھا رہی تھی اس نے قدرے پرسکون ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☆☆☆☆

”ویز آر یو بے بی، میں صبح سے تمہیں کال کر رہی ہوں تم نے جواب ہی نہیں دیا۔“ ایلا کی کال اینڈ کرتے ہی اس کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔

”آئی واس بڑی۔“ (میں مصروف تھا) مختصر جواب دیا انداز جان چھڑانے والا تھا۔

”مجھے ایک Text ہی کر دیتے۔“
”غلطی ہو گئی معاف کر دو۔“ اس کی باتوں کے جواب میں بیزار سی کہا۔

”کیا کر رہے ہو؟“ اس کا شاید تفصیلی بات کرنے کا دل تھا مگر جانے کیوں آج ایسے اس کی بناوٹی باتوں سے بہت دشت ہونے لگی تھی رہ رہ کر ایک چہرہ اس کے ذہن کے پردوں پر جھللا لگا اور دل یک دم برے سے اکتا گیا تھا ہر چیز سے اس کی دلچسپی ختم ہونے لگی ذہن دول عجیب کیفیت سے دوچار تھے کسی سے بات تک کرنے کا جی نہیں چاہ رہا تھا وہ تنہائی میں اس حسد کو سوچتا چلتا تھا۔

”میں باہر ہوں بعد میں بات کرتا ہوں۔“ اس

نے بیکر کال کاٹ دی اور سیل آف کر دیا۔

”کون بھی وہ لڑکی اور آخر اس نے ان بچوں کو کیا غبارے خرید کر دیئے کیا آج کے زمانے میں بی بی کوئی اتنا بے غرض ہو سکتا ہے؟ مطلب پرستی کی باتیں کیا کسی کے پاس اتنا خوبصورت دل آج بھی موجود ہے؟“ روحان فریدی جو پچھلے آٹھ سالوں سے امریکہ میں تھا اس کے آگے پچھلے لڑکیاں تیلیوں کی طرح منڈلاتی تھیں وہ جب بھی چٹشیاں مزار نے پاتاں آتا لڑکیاں تو لڑکیاں ان کی مامیں بھی اس کے آگے بچھ جائیں سب کی کوشش یہی ہوا کرتی کہ اس طرح روحان کا انتخاب نظر ان پر ٹھہر جائے مگر جان کے دل میں لڑکیوں کو دیکھ کر بھی یہ خیال نا آیا تھا کہ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرے کیوں کہ وہ ان لڑکیوں کی نیوتوں سے خوب واقف تھا وہ بہترین مشابہت کی خواہش میں اس کے آگے پیچھے پھیرا کرتی ہیں اس لیے وہ ان کے ساتھ محض وقت گزاری کرتا اور واپس لوٹ جاتا مگر آج اس انجان حسد نے باندھے کیسے اس کے دل تک رسائی حاصل کر لی اور دل کا دروازہ دھک دے بنا ہی کھل گیا اس کو دیکھ کر دل کی دنیا ہی بدلی ہوئی محسوس ہونے لگی دل جانے کی یہی خواہش کرنے لگا تھا گھر بیوی بچے ایک نہ تھا اور پرسکون زندگی وہ اپنی سوچ پر خود غور رہا تھا آج سے پہلے اس نے بھی شادی کے لیے سنجیدگی سے نہیں سوچا تھا مگر اس لمحے اسے شادی کی شدید خواہش ہونے لگی وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر چکا تھا اور اب کافی حد تک پرسکون ہو گیا مثال میں کچھ دیر قبل ہونے والی بے نامی بے چینی انسانان میں بدلنے لگی گامتی آنکھوں سے خواب دیکھتے اس کے لب مسلسل مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆☆

”بیٹا ہم اتنی جلدی شادی کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔“ اس فریج نے باتوں کے جواب میں

سعیدہ بیگم نے کہا۔

”آئی اللہ کا کرم ہے ہمارے بھائی کو کسی چیز کی ضرورت نہیں آپ بے فکر ہو کر دو دوڑے میں بی بی کو رخصت کر دیں۔“ اسفر نے کہا۔

”آپ بے فکر ہو کر رشتہ کر لیں آئی میرا دیور ماشا اللہ بہت محنت کرنے والا سب کا خیال رکھنے والا ہے آپ کی بی بی بہت خوش رہے گی۔“ فرمین نے اسفر کی تائید کی۔

”آپ دونوں کی بات تو ٹھیک ہے بیٹا مگر امریکہ بہت دور ہے میں اپنی بی بی کو اتنی دور کیسے بھیج دوں۔“ سعیدہ بیگم رنجیدہ ہوئیں۔

”آئی اب تو ٹیکنالوجی بہت فاسٹ ہو گئی ہے ایک منٹ بلک کر دو اور ویڈیو کال پر اپنا مطلوبہ بندہ آپ کے سامنے زندگی آسان ہو گئی اب دوریاں نہیں ہیں ٹیکنالوجی نے فاصلے سمیٹ لیے ہیں۔“ اسفر نے دلائل دے کر قائل کرنے کی سعی کی وہ خاموش ہو گئیں۔

”آپ تلی سے سوچ لیں آئی ہم کل پھر آئیں گے مگر جواب مثبت دیجئے گا پلیز ہم بہت آس لئے آپ کے پاس آئے ہیں سیدھے ہمیں بے حد اچھی لگی ہے۔“ اٹھتے ہوئے فرمین نے سعیدہ بیگم کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆☆

”ای یہ کیسے ممکن ہے؟“ وہ سعیدہ بیگم کی باتیں سن کر حق دق رہ گئی۔

”بیٹا اتنی جلدی یہ سب آسان تو نہیں مگر رشتہ ہر لحاظ سے اچھا ہے۔“

”اچھا نہیں امی بہترین کہیں اتنا چھارشتہ آپ کو کہیں نہیں ملے گا۔“ فریج نے کہا تھا۔

”ہاں آپ امی امریکہ گئیں تو پھر میں بھی وہاں آ جاؤں گا ورنہ ایسے تو ای مجھے بھی امریکہ نہیں جانے دیں گی۔“ میر بھی خوش تھا۔

”لیکن امی میں آپ سب کو چھوڑ کر کیسے چلی جاؤں؟ ابھی تو میرے بھائی بہن بھی چھوٹے ہیں۔“ وہ کسی طور بھی شادی کے لیے راضی نہ تھی۔

”بیٹا تمہارے بابا بھی تو چلے گئے ان کے بغیر بھی تو گزر رہی ہے زندگی اور بیٹیوں کو والدین کب تک اپنے گھر میں رکھ سکتے ہیں جلد یا دیر ان کو رخصت کرنا ہی پڑتا ہے تم ہماری فکر نہ کرو اللہ بہت بڑا ہے رشتہ بہت مناسب ہے اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔“ سعیدہ بیگم اسے قائل کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”لیکن امی میں.....“

”بس چپ ہو جاؤ میں اپنی ضرورتوں کے لیے تمہاری خوشیاں قربان نہیں کروں گی وہ لوگ آج پھر آئیں گے میں انہیں مثبت جواب دوں گی۔“ ان کا انداز دو ٹوک تھا۔

”امی.....“ اس نے کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے تھے۔

”آپی میرا BSC آئرز مکمل ہو گیا ہے اور اب میں پڑھائی سے بور ہو گئی ہوں توڑا گپ دینا چاہتی ہوں میری فریڈ کے والد کا اسکول ہے وہاں پھر کی ضرورت ہے میں نے اس سلسلے میں بات کی تھی اپنی CV بھی دے دی تھی انکل نے مجھے بطور ٹیچر اپائنٹ کر لیا ہے سلیری تنج بھی بہترین ہے اور میری کارکردگی دیکھ کر سلیری میں مزید اضافہ بھی ممکن ہے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔“ فریڈ نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کو تسلی کروائی۔

”اور آپی میں بھی انٹر کے پیپرز سے فارغ ہو چکا ہوں اور اب بچوں کو ہم ٹیوشن دینے کا ارادہ رکھتا ہوں اب میں اپنی پڑھائی کا خرچہ خود اٹھانا چاہتا ہوں آپ نے ہمیشہ ہماری خوشیوں کے لیے سوچا ہے آپی اب ہمیں آپ کی خوشیوں کے لیے کچھ کرنے

دیں۔“ میر نے کہا تھا۔

”تمہارے بہن بھائی اب چھوٹے نہیں رہے بیٹا“ سعیدہ بیگم نے سیمہ کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا وہ پھٹکی پٹکوں کے ساتھ مسکرا دی۔

☆☆☆☆

قسمت کی دیوی کس طرح مہربان ہوتی ہے کوئی روحان فریدی سے پوچھتا محبت اس کے دل میں جوں ہی دبے پاؤں داخل ہوتی تو خوش نصیبی نے اس کا خیر مقدم کیا دو دنوں کی جاسوسی کے بعد اس نے سیمہ کے گھر کا پتہ معلوم کیا اور اس کے متعلق تمام معلومات اکٹھی کر چکا تھا فرحین اور اس نے بھائی بھائی ہونے کا فرض بے حد خوش اسلوبی سے نبھایا تھا اور شادی کی تاریخ طے کر آئے تھے وہ خوبصورت دن بھی اس کی زیست میں جلد ہی آگیا جب سیمہ سجان، روحان فریدی کی دہن بن کر اس کی زندگی میں خوشیوں کے رنگ بھرنے آگئی۔

”شدید گری ہے۔“ اے سی کی کونگ بدھاتے ہوئے فرحین نے کہا تھا بھاری بھر کم جوڑے اور جیولری سے مزین دہن بنی سیمہ نے ماتھے سے پسینہ صاف کیا تھا۔

”تم ایزی ہو کر بیٹھو میں روحان کو بھیجتی ہوں تاکہ وہ ہماری بھر کم جیولری سے رہائی دلانے میں تمہاری مدد کر سکے۔“ فرحین شوخی سے گویا تھی۔

اس کے رخسار دھک اٹھے رخسار پر حیاء کی لالی بکھر گئی جسے دیکھ کر شرمین (فرحین کی بہن) کو آگ لگ گئی تھی۔

”تم بھی باہر آ جاؤ۔“ فرحین شرمین کو کہہ کر باہر نکل گئی جبکہ شرمین فرحین کی بات کو ان سنا کر کے سیمہ کے مقابلہ بر اجماع ہو گئی۔

”بہت شرماری ہو گیا بات ہے؟“ شرمین اسے بنو روہ کھینچتے گویا تھی۔

”ہاں بھئی شرمنا بھی چاہیے موصوف بھی جی بھر

لے رو مانگ ہیں۔“ اس نے ایک ادا سے کہا اس کی بے باکی پر سیمہ ششدر رہ گئی۔

”اتنا حیران کیوں ہو رہی ہو۔“ شرمین کا انداز اتہزائیہ تھا۔

”تمہارے شوہر کو ہر لڑکی کے ساتھ رو منس بنانے کا شوق ہے خاصے رملین مزاج ذاتی ہے۔“ وہ اس کے قریب ہو کر سرگوشی کے انداز میں گویا تھی سیمہ نے ناگواری سے اسے دیکھا اور ہنسنے لگی۔

”کمال ہے تمہارے شوہر نامدار تو میرے نزدیک آنے سے ذرا نہیں ہچکچاتے تھے اور تم ہو کے آئے۔“ وہ ڈھٹائی سے گویا تھی۔

”بکواس بند کرو تم۔“ اس کا ضبط جواب دے دیا پہلے تو وہ اس کی باتوں کا مفہوم ہی نہ سمجھ سکی مگر اب اس کے لفظوں کا پس منظر جان گئی تو اس کا خون ٹھول اٹھا۔

”مجھ پر کیوں چلا رہی ہو بہت ہے تو اپنے میاں کو سنبالو۔“ جولیا شرمین نے اس کی جان جلادی۔

”میں کیسے مان لوں کے تم بچے بول رہی ہو؟“ اس کے چہرے پر نظر گاڑیں وہ گویا تھی۔

”میرے پاس یادگار ٹکوں کی کچھ یادیں موجود ہیں۔“ اپنا موبائل اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا تھا اس نے ایک نظر دیکھ کر منہ پھیر لیا اپنے شریک سفر کو کسی اور کے ساتھ دیکھنے کا یا راند تھا۔

”منہ کیوں پھیر لیا؟ عادت ڈال لو بے بی اب تو ایسی پپوشن کا آئے دن سامنا کرنا پڑے گا آخر موصوف عرصہ دراز سے امریکہ میں مقیم ہیں۔“ وہ لہجہ کر بیڈ سے اٹھ گئی تھی۔

”تم تو امریکہ میں نہیں رہیں پھر کیوں کرتی رہیں یہ سب؟“ وہ زخمی شیرنی کی طرح شرمین پر چبھتی تھی اس کے بالوں کو بھی میں جکڑ کر وہ بے دری نہ بچ رہی تھی شرمین کو اس حملے کی توقع نہ تھی وہ

برای طرح ہے اس کے شکنجے میں پھنسی تھی اور درد سے کراہ رہی تھی۔

”میں تم جیسی گھٹیا عورتوں کی جان لے لوں گی چند بیسوں کے عوض اپنی سوانیت کو تار تار کرتی ہیں۔“ اس نے اپنے ناخنوں کو اس کے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔

”چھوڑ مجھے۔“ وہ اپنے بالوں کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی سعی کرنے لگی۔

”اتنی بھی کیا جلدی ہے ذرا میرے شوہر نامدار کے ساتھ وقت گزاری کا خراج تو وصول کراؤ۔“ وہ اس کے گالوں پر پتھروں کی بارش کرتے گویا ہوئی اس بر تو گویا خون سوار تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی تکیہ پونی کر دے۔

”سیمہ.....“ روحان کمرے میں داخل ہوا تھا اور اندر کی صورتحال دیکھ کر اس کا دماغ جھک سے اڑ گیا وہ آگے بڑھا تھا سیمہ کو اپنی طرف کھینچ کر اس نے شرمین کو پرے دھکیلا تھا وہ فرش پر جا گری۔

”یو بچ۔“ شرمین کہہ کر کمرے سے نکل گئی جب کے سیمہ اب روحان کو گھور رہی تھی تیور خطرناک تھے۔

”کون ہے یہ لڑکی اور کیا بکواس کر رہی تھی؟“ وہ خاموش رہا کے اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا۔

”میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے؟“ اس کی خاموشی پردہ مزید کھول اٹھی۔

”جو کچھ وہ کہہ رہی تھی کیا وہ سب سچ ہے؟“ اس نے ایک بار پھر سوال کیا اس کا سر شرمین کی طرف جھک گیا اس کی خاموشی اسے مجرم بناد رہی تھی سیمہ کو سمجھنے میں لمحہ نہ لگا۔

”جب آپ اس طرح کی چپ حرکتیں کرنے کے عادی تھے تو آپ کو اپنے ہی ٹائپ کی کسی لڑکی کا انتخاب کرنا چاہیے تھا مجھے کیوں چنا آپ نے۔“ وہ

ہاتھوں سے چوڑیاں اتار کر پھینکتے ہوئے گویا تھی
کانوں کے اوپر سے اتار کر اس نے روحان کو دے
مارے۔

”خود جو مرضی کرتے پھر میں مگر بیوی پاک
صاف ہونی چاہیے اپنے جذبے غیروں پر لٹاتے یہ
خیال نہیں آتا کہ اس ”پاکیزہ“ لڑکی کے بھی کچھ
ارمان ہوں گے اس کی بھی خواہش ہوگی کہ اس کے
نزدیک سفر پر صرف اس کا ہی حق ہو اپنے جذبوں کو
سمیٹ کر رکھنے والی لڑکی کیوں کر برداشت کرے گی
کہ اس کا سفر اس کا حق ہر کسی کو بانٹنا پھرے صرف
لڑکیوں پر ہی یہ پابندی کیوں عائد کی جاتی ہے کہ وہ
اپنی حدود میں رہیں اپنی حد سے تجاوز نہ کریں خود کو
زمانے کی گندگی سے بچا کر رکھیں تو لڑکوں پر یہ قانون
لاگو کیوں نہیں ہوتا؟ کہ وہ بھی اپنے جذبات اور دلوں پر
نہ لٹائیں خود کو زمانے کی غلاقت سے دور رکھیں میں
نے خود کو اس لئے سنبھال کر نہیں رکھا تھا کہ آپ جیسا
شخص میرا مقدر رہے اس لئے مجھ سے دور رہیں میں
آپ کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔“ وہ تمام زیورات
اتار کر چھینک چکی تھی اور الماری سے اپنے لئے جوڑا
نکال کر وائش روم میں بند ہو گئی وہ بے جان قدموں
سے کمرے سے نکل آیا۔ تسبیح کے سوالوں کے جواب
اس کے پاس تو نہ تھے مگر ان سوالوں نے سوچ کے کئی
دروا کر دیئے تھے جب لڑکے اپنی شریک سفر کے لئے
اتنے حساس ہوتے ہیں تو پھر لڑکے یہ کیوں نہیں
سوچتے کہ لڑکیوں کے بھی اپنے شریک سفر کے حوالے
سے کچھ خواب ہوں گے ان کی بھی کوئی خواہش ہوگی
اسے اپنے وجود سے کراہیت ہونے لگی تھی اس نے
ایک نرم و نازک جذبات رکھنے والی لڑکی کے ارمانوں
کا خون کیا تھا یہ احساس اذیت دینے لگا تھا جس ہستی
کو اس نے بہت چاہا ہے اپنی زیت میں شامل کیا تھا
اس لڑکی سے جانے کیوں اسے حد درجہ محبت بھی جانے
کیوں وہ اس کو بے حد چاہنے لگا تھا وہ اس کی نفرت

سننے کی ہمت کہاں سے لاسکے گا سوچ سوچ کر اس کا
ذہن ماؤف ہونے لگا اس پر پچھتاوے بھی اسے
گھیرے ہوئے تھے۔

☆☆☆☆

”تم نے یہ سب کیوں کیا تمہیں ذرا شرم نہ
آئی؟“ شرمین کی ایسی حالت دیکھ کر اسے سخت
صدمہ ہوا تھا اور جب اسے تمام صورتحال کا پتہ لگا تو
وہ ششدر رہ گئی۔

”تم جانتی ہو اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں؟“
فرحین غم غشت کی کیفیت میں تھی۔
”نتائج جو بھی ہوں مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“
بے نیازی سے کہا تو فرحین اسے گھورنے لگی۔

”مگر مجھے فرق پڑتا ہے اسفر کی چند ہزار کی خواہ
میں کسی طور پر گزارہ ممکن نہیں اگر روحان ہمیں ہر
مہینے رقم نہ بھیجے تو ہم کبھی اتنی عیاشی سے زندگی
نہیں گزار سکتے اس نے ہمیشہ بھائی کو سپورٹ کیا
ہے اسفر کو جب پیسوں کی ضرورت ہو ان کی ایک
کال پر وہ پیسے بھجوا دیا کرتا ہے اگر آج میں اس گھر
میں عیش کر رہی ہوں تو صرف اور صرف روحان کی
وجہ سے۔“ فرحین نے اسے روحان کے احسان
گنوائے جو اس نے کئے تھے۔
”تم عیش کر رہی ہو میں تو نہیں۔“ شرمین نے
ڈھٹائی سے کہا تھا۔

”صبح ہوتے ہی تم دفعہ ہو جانا میں مزید تمہاری
موجودگی برداشت نہیں کر سکتی روحان مجھے بھائیوں کی
طرح عزیز ہے اگر اس کی زندگی میں کچھ بھی غلط ہوا تو
میں تمہارا حشر کر دوں گی۔“ فرحین سختی سے کہہ کر
کمرے میں جا چکی تھی وہ دل سے دعا گو تھی کہ تسبیح
روحان کی سابقہ غلطیوں کو معاف کر دے۔

☆☆☆☆

فرحین نے تسبیح کا ناشتہ بنا دیا تھا وہ خاموشی سے
ناشتہ کرنے لگی جس پر فرحین نے شکر کا کلمہ ادا کیا وہ

نار خاموش تھی فرحین اس کی خاموشی پر پرسکون تھی
بہار روحان کو اس کی خاموشی چسب رہی تھی وہ اسے
اجلا ہی کہہ دیتی سخت سنا دیتی تو اس کے دل کو قرار
آ جاتا مگر وہ خاموش تھی۔ روحان نے اسے مخاطب
کرنے کی کوشش کی تو وہ انہی کی کڑی محبوب ہستی کی
بارانہی اسے بہت بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ وہ
بے حد دلگرفتہ تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا“ روحان تسبیح ایک
بندہ لڑکی ہے۔ اس کی دلگرفتگی کو دیکھ کر فرحین گویا
تھی وہ اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔
”بے کے بعد بھی ان کے درمیان سرد مہری کی دیوار
مائل تھی جو تسبیح نے کھڑی کی تھی اور روحان کی
کوششوں کے باوجود اس نے سرد مہری کی دیوار
کرائی نہیں تھی۔

”اگر تم اس رشتے سے خوش نہیں تو تمہیں مزید
اذیت نہیں دوں گا“ انجانے میں میں پہلے ہی نہیں
تکلیف پہنچا چکا ہوں اب میں تمہیں قیدی بنا کر نہیں
رکھنا چاہتا یہ رشتہ اگر تمہارے لئے بوجھ ہے تو میں
تمہیں جلد اس رشتے سے آزاد کر دوں گا۔“ شادی
کے پہلے بعد بھی ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی
دیوار قائم تھی ان دونوں وہ مسکراتا ہی بھول چکی تھی وہ
اسے دھکی نہیں دیکھ سکتا تھا اس لئے اس نے بہت
سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا وہ مزید اس کے لئے
اذیت کا باعث نہیں بنے گا وہ اس کی باتوں کے
جواب میں خاموشی سے چند جوڑے اپنے بیگ
میں ڈالنے لگی تھی یہ دیکھ کر روحان کی آنکھیں نمکین
پانیوں سے بھر گئیں دل میں بسنے والی اس کا گھر
چوڑ کر جا رہی تھی۔

☆☆☆☆

رمضان کا چاند نظر آچکا تھا سب بے حد پر جوش
تھے اس پر تسبیح کی آمد نے ان کو مزید خوشی دی تھی
فرحین اور سمیرا اس کے ساتھ بیٹھے خوش گپوں میں

مصروف تھے اور امی کچن میں اس کے لئے جانے کیا
کچھ بنا رہی تھیں۔
”کیوں کر رہی ہیں اتنا میں کوئی مہمان ہوں۔“
وہ کچن میں چلی آئی۔

”اب مہمان ہی ہو بیٹا شادی کے بعد تو بیٹی پرانی
ہو جاتی ہے۔“ سعیدہ بیگم کی آنکھیں جھجک گئیں۔
”مگر ابھی تو میں یہیں ہوں امی۔“ اس نے کٹی کرائی۔
”بے شک یہاں ہو مگر لوٹنا تو اپنے ہی گھر ہے نا
بیٹیاں اپنے گھروں میں ہی بھلی لگتی ہیں۔“ امی نے کہا
تو وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

☆☆☆☆

رمضان کا چاند نظر آ جانے کی خبر سن کر جانے
کتنے سال بعد وہ مسجد آیا تھا مسجد میں قدم رکھتے اس
کے پیر لڑنے لگے گناہوں سے تسخیر اور جو اللہ کے
سامنے کھڑا ہونے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا اسے
لگا اس کو اللہ پاک مسجد میں داخل ہونے ہی نادیں
گمے وہ لڑتے قدموں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گیا
اور نماز کی نیت کرنے کے بعد نماز ادا کرنے لگا دل
میں ہزار سو سے آئے تھے کئی خدشے تھے سر سجدے
میں جھکائے وہ روٹا رہا تھا اللہ نے اس کے پیروں
سے زمین نہیں کھینچی تھی کہ وہ اس تک نہ پہنچ سکے وہ
اس کرم پر بے طرح خوش تھا وہ دل سے شکر گزار تھا
کہ اللہ اپنے بندوں کے لئے کبھی اپنے دروازے بند
نہیں کرتا وہ کبھی اپنے بندوں کو نہیں دھتکارتا وہ کبھی
اپنے بندوں کے گناہوں پر اس سے باز پرس کر کے
شرمندہ نہیں کرتا کبھی طے نہ بھی دیتا اس احساس
کے تحت اس کی آنکھیں برستی رہیں دل کا درد
آنسوؤں کے ذریعے بہنے لگا وہ اپنے گناہوں پر
شرمندہ اپنے رب سے معافی کا طلب گار تھا نفس کی
غلامی کر کے اس نے اپنی ذات پر بھی ظلم ڈھائے تھے
اس کے گناہوں نے اس کی زیت کی خوشیوں کو نگل
لیا تھا وہ مان گیا تھا کہ رب کی نافرمانی کر کے انسان

کسی کا کچھ نہیں بگاڑنا اپنی جان پر ہی ظلم کرتا ہے اپنی ذات پر اس نے جو ظلم کئے تھے وہ اس ظلم سے دہائی کے لئے اپنے رب سے دعا گو تھا اپنے رب سے معافی کا طلب کر رہا تھا جو اس کی بے پناہ نافرمانیوں کے باوجود اس کی التجا بخور سن رہا تھا اس کے رب نے گناہ سے تسخیر و وجود کو دھکا نہیں تھا اس کے پکارنے پر وہ اس کی فریاد سن رہا تھا پوری دنیا اس سے خفا ہو سکتی تھی اس کی حرکتوں پر اسے لعن طعن کر سکتی تھی مگر وہ تو رب تھا جس نے اسے ایک لفظ کہہ کر شرمندہ نہ کیا وہ تو اس کا منتظر تھا کہ وہ کب گناہوں سے اکتائے اور اس کے پاس لوٹ آئے اور وہ رحم کرنے والی ذات اپنی رحمتوں سے اس کے گناہوں کو بخش دے اپنے رب کے آگے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگ لیتے کے بعد اس کے دل میں سکون اور طمانیت کا احساس بھرنے لگا وہ اب باقاعدگی سے نماز ادا کرنے لگا تھا اب نماز پڑھتے ہوئے اس کے دل میں اپنے رب کے لئے محبت محسوس ہونے لگی گناہوں کے باوجود اس کے رب نے اس کی جانب سے منہ نہیں موڑا اس کو قطعاً بھی نہیں دیا دھکا راہی نہیں بلکہ سکون اور اطمینان اس کے حوالے کروا رہا تھا وہ کیوں اس رب سے محبت نہ کرتا گناہوں سے دور ہوتے ہی وہ رب سے بے حد قریب ہو گیا تھا۔

☆☆☆☆

”آپ اپنی عید ہمارے ساتھ ہی کر سکی؟“ وہ ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کر کے فارغ ہوئی تھی اور سلامی مٹین لگا لئے لگی تھی۔ ”ہاں کیوں؟“ وہ دھا کہہ پڑتے گویا تھی۔ ”آپ پھر تو اس بار عید پر کچھ خاص ہونا چاہئے۔“ میری بھانجی کا شاپرچن میں رکھتے گویا تھا۔ ”خاص کیسے؟“ مصروف انداز میں سوال کیا۔ ”ہر سال عید میں ہم بہت بور ہوتے ہیں اس بار عید پر آؤنگ ہوئی چاہئے۔“ میری نے کہا۔

”مگر جائے کہاں؟“ اس نے سوال کیا۔ ”اتنی ساری جگہیں ہیں گھومنے کی۔“ میری نے بتایا تھا۔ ”تم لوگوں کی فرمائش کبھی ختم نہیں ہوں گی“ میرے کہنے پر سعیدہ بیگم نے کہا۔ ”کہا ہے ای آپ کو چند ماہ میں روحان بھائی امریکا بلوالیں گے پھر جانے آپ کی کب آئیں ہم اس عید کو یادگار بنانا چاہتے ہیں۔“ فریج کی بات پر تیزی سے سلامی کرتے ہاتھ ہم گئے تھے۔ ”ہاں بیٹا تم کب تک امریکا جاؤ گی بات ہوئی روحان سے وہ ہمیں ساتھ لے کر جائے گا یا اکیلے واپس جائے گا؟“ سعیدہ بیگم کے سوال پر وہ چپ سی ہو گئی۔

”کیا بات ہے بیٹا میں دیکھ رہی ہوں تم اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرتیں تم اتنے دنوں سے یہاں ہوا ایک بار بھی روحان گھر نہیں آیا سب ٹھیک تو ہے؟“ سعیدہ بیگم کے سوال پر ماحول میں یکدم سنجیدگی طاری ہوئی فریج اور میری کو بھی صورتحال کی سنگینی کا احساس ہونے لگا اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے سعیدہ بیگم بخور اسے دیکھ رہی تھیں وہ کچھ کہنے کے لئے لب واکرنے لگی تھی جب اس کا موبائل بج اٹھا۔

”السلام علیکم!“ ہیل فون کان سے لگاتے ہی کہا تھا۔ ”کیا بات ہے تسبیح تم تو ہمیں بھول ہی گئی ہو۔“

دوسری طرف فرحین کی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے بھابی۔“ اس نے کہا۔

”رہنے دو تمہیں تو ہماری یاد ہی نہیں آتی۔“

فرحین کا شکوہ بجا تھا۔

”آپ کیسی ہیں؟“ اس نے بات بدل دی۔

”میں تو ٹھیک ہوں مگر روحان کی طبیعت کچھ

ٹھیک نہیں اسے بخار ہے تسبیح تم میری چھوٹی بہن کی

طرح ہو میں مانتی ہوں روحان کی کچھ عادتیں بری

تھیں مگر وہ فطرتاً ہی انسان نہیں بس غلط صحبت کی وجہ

۔۔۔ بگڑ گیا تھا کم عمری میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا کوئی تھا نہیں جو اسے اچھے برے کی تمیز سکھاتا اور جی سارا دن جاب پر ہوتے تھے پھر روحان نے امریکا کے رہنے کے لئے اپلائی کر دیا اور چھوٹی عمر میں ہی امریکا جیسے ملک میں رہنے لگا جس کی وجہ سے اس نے صحیح اور غلط میں فرق محسوس کرنا ہی چھوڑ دیا مگر اب اسے اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے وہ اپنے کئے پر شرمسار ہے تسبیح ہو سکے تو اسے معاف کر دو غلطیاں تو انسانوں سے ہی سرزد ہوا کرتی ہیں اس نے نادانی میں غلطیاں کیں اب تم دوسری بات نہ کرو معاف کر دو اسے اور لوٹ آؤ اپنے گھر ہم منتظر ہیں۔“ فرحین نے کہا تھا۔

”میں بہت جلد آؤں گی۔“ اس نے لمحے میں فیصلہ کر لیا تھا جب وہ اپنے کئے پر شرمندہ تھا تو وہ یوں نہ اسے معاف کرتی کہ اپنی غلطیوں پر معافی مانگنے پر اللہ بھی اپنے بندوں کو معاف کر دیا کرتا ہے۔ ”ج؟“ فرحین کی چیخ بے ساختہ تھی۔

”جی مگر آپ یہ خبر اپنے تک ہی رکھئے گا۔“ زیر لب مسکراتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

سعیدہ بیگم کے دل میں سراپا اترتے دوسرے اس کی بات کے اختتام پر دم توڑ گئے تھے انہوں نے مزید کریدنا مناسب نہ سمجھا ان کے لئے یہ کافی تھا کہ وہ خوشی اپنے گھر جانے کے لئے تیار تھی۔

☆☆☆☆

انظار میں وقت نے حد کم رہ گیا تھا وہ عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد آرام کی غرض سے بیڈ پر لیٹا تھا اور اب نیند نے اس کو اپنی آغوش میں لے لیا اسے خبر ہی نہ ہوئی اس کی آنکھ کسی شور کی آواز سے کھلی تھی کمزری پر نظر دوڑائی تو مغرب کی اذان میں کچھ ہی وقت باقی تھا وہ آنکھ کرینٹھ گیا چوڑیوں کا شور اس کی پشت پر ایک ہار پھر بلند ہوا اس نے رخ موڑ کر دیکھا تھا وہ جیسے پتھر کا ہو گیا اس کی سانسیں رکنے لگیں وہ

دشمن جاں سرخ جوڑے میں ملبوس سرخ چوڑیاں کلائی میں سجائے وارڈروب میں جانے کیا تلاش کر رہی تھی روحان کے حیرانی سے دیکھنے پر تسبیح نے سکرمانی نظر اس پر ڈالی تھی اسے اپنی بصارت پر یقین نہ آیا وہ اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

”اتنی بے یقینی؟“ وہ اس کے مقابل کھڑی مسکراتے ہوئے گویا تھی۔

”تم یہاں؟“ وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ اچانک کیسے آ گئی۔

”میرا گھر ہے مجھے تو یہیں ہونا چاہئے تھا نا؟“

اس نے الٹا سوال کیا۔

”بالکل یہ تمہارا اپنا گھر ہے تسبیح۔“ اس کے

سوال پر اس نے بے حد اطمینان سے کہا تھا۔

”اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے آپ بھی

صرف میرے ہیں نا؟“ وہ بخور اس کا جائزہ لیتے گویا

تھی بڑھی ہوئی شیو اور بکھرے بالوں پر نظریں مرکوز

کئے وہ جواب کی منتظر تھی۔

”تسبیح میں ایک بے حد برا انسان ہوں مگر میں

نے تمہیں بے حد چاہا ہے اور بہت چاہت سے اپنی

زیست میں شامل کیا ہے تم وہ پہلی لڑکی ہو جسے دیکھ کر

مجھے احساس ہوا کہ میں بھی ایک انسان ہوں مجھے بھی

شادی کرنی چاہئے اپنی ایک الگ دنیا بسائی چاہئے

اب تک میں خوشی زندگی گزارتا آیا ہوں جس میں

اپنے لئے میں نے کبھی کچھ سوچا ہی نہیں مگر تم کو دیکھ کر

احساس ہوا کہ زندگی خوبصورت ہے میں تمہارے

ساتھ اپنی پوری زندگی گزارنا چاہتا ہوں کیونکہ تم

اوروں سے بہت مختلف ہو تمہارا جو مقام ہے وہ کبھی

کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا میں نے بہت گناہ کئے مگر تم

سے ملنے کے بعد میرے دل میں برائی کا خیال تک

نہیں آیا مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے تسبیح میرے

لئے تم ہی سب کچھ ہو اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں

کہ میں صرف تمہارا ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ ہاتھوں

میں لئے گویا تھا وہ بخور اسے سن رہی تھی۔“ میں

ماضی میں کی گئی حرکتوں پر بے حد شرمندہ ہوں مجھے معاف کر دو۔“ اس نے دونوں ہاتھ اس کے آگے جوڑ دیئے۔

”آپ میرے نہیں اللہ کے مجرم تھے ان کی نافرمانی کی تھی جب آپ کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو گیا ہے اور آپ نے اللہ سے معافی مانگ لی تو پھر ایسا کیسے ممکن ہے کہ میں آپ کو معاف نہ کروں میں نے آپ کو معاف کیا روحان۔“ وہ اس کے آنسو شہادت کی انگلی سے صاف کرتے گویا تھی۔

”آئندہ خیال رکھئے گا یہ آنسو دوبارہ آپ کی آنکھوں میں نہ آئیں کیونکہ میں آپ کو دکھ دینے کے لئے نہیں آئی۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے گویا تھی۔

”تم تو میرے لئے خوشیوں کا جہان ہو؟“ اس کے ہاتھوں کو لبوں سے لگاتے اس نے کہا تھا مغرب کی اذان کی آواز نفا میں گونجنے لگی تھی۔
 ”چلیں روزہ کھول لیں آج ہم دعا بھی نہیں مانگ سکتے۔“ وہ کمرے سے نکلتے گویا تھی۔
 ”اللہ نے تو بنا مانگے سب کچھ عطا کر دیا ہے۔“ وہ بھی اس کے پیچھے کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

نماز ادا کر کے گھر لوٹا تو چاند نظر آنے کا شور سنائی دیا اس نے گاڑی کا رخ مسجد کے گھر کی جانب موڑ دیا۔ سعیدہ بیگم کے انکار کے باوجود وہ ان لوگوں کو اپنے گھر لے آیا۔

”امی۔“ وہ روحان کے ہمراہ اپنے ماں بہن بھائی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی اس کو اپنے گھر والوں سے بے پناہ محبت تھی اور اس کا شریک سفر بناء کہے اس کے گھر والوں کی خوشیوں کا خیال کر رہا تھا اس کے دل میں روحان کے لئے عزت بڑھ گئی۔

”آج رات ہم ڈنر باہر کریں گے اور دیر رات تک باہر انجوائے کریں گے اور کل نماز کے بعد ہم

فارم ہاؤس کا رخ کریں گے۔“ وہ چائے کی ٹرے لئے لان میں آئی تھی جب روحان سیر اور فریج سے مخاطب تھا۔

”داؤ عید کے دن کیک؟“ سیر کی خوشی ویدنی تھی۔ فریج کے چرے پر بھی خوشی تھی امی بھی پرسکون انداز میں مسکرا رہی تھیں اسے پیاروں کو مسکراتا دیکھ کر ان کے رگ و جاں میں اطمینان سرایت کر گیا تھا روحان کے لئے محبت اس دل کی زمین سے پھوٹنے لگی اس نے بے حد محبت سے روحان کو دیکھا جو چائے کا گلابوں سے لگائے سیر کی کسی بات پر ہنستا ہوا دوستوں کی طرح اس کے ہاتھوں پر ہاتھ مار رہا تھا اسے صحیح معنوں میں کل عید کا گمان ہونے لگا۔ عید کا تعلق تو خوشیوں سے ہے اپنے پیاروں کی خوشیوں کی وجہ سے وہ عید کے لئے زندگی میں پہلی بار اس قدر پر جوش نظر آ رہی تھی۔

”چلو لڑکیوں جلدی سے تیار ہو جاؤ مہندی لگوانے پارلر جانا ہے پھر میں نماز پڑھنے جاؤں گا۔“ چائے کا گلاب رکھتے اس نے فریج اور تسبیح کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

”میں تو تیار ہوں۔“ فرحین فوراً اٹھ کر کھڑی ہوئی۔
 ”تم دونوں بھی ریڈی ہو جاؤ امی آپ بھی لگوا لیں مہندی۔“ اس کے لبوں سے امی کا لفظ سن کر اس کی مسرتوں میں مزید اضافہ ہوا تھا۔

”نہیں بیٹا پچاپچا لگوا آئیں۔“ اس کے امی کہنے پر سعیدہ بیگم بھی نہال ہوئیں فریج اور تسبیح ہی سر پر دوپٹہ جمائے اٹھ کھڑی ہوئیں تسبیح کے خوشی سے چمکتے چرے کو دیکھ کر روحان کے دل میں سکون اتر آیا وہ زندگی میں پہلی بار عید کا ہونے کے ساتھ اس ابتلاء کے ساتھ منانے جا رہا تھا اس مرتبہ صحیح معنوں میں دلوں کی عید ہونے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

☆.....☆

ہرے لہ

برف اٹھنی کرتے تھے گرمی کے مارے لوگ انسانیت اور ہمدردی میں روز برف بھی دیتے تھے کے چلو کی کا بھلا ہو جاتا ہے تو کیا برا ہے۔

☆☆☆☆

اس روز گرمی کی شدت معمول سے قدرے زیادہ تھی باقی رہی سہی کسر لوڈ شیڈنگ نے پوری کر دی سب گرمی سے بے حال بنی والوں کو کونے اور ہمسے فین جھپٹنے میں مصروف تھے۔ برف لینے والے بچوں نے ایک گھر کا دروازہ بجایا جہاں سے روز ایک امام جی بڑے پیار سے دو کٹورے برف دیتی تھیں دو تھیں بار کٹدی، بجانے پر اندر سے گرمی اور لوڈ شیڈنگ کا مارا رزم باہر نکلا جو چھٹی کی وجہ سے گھر پہ تھا۔

”برف ہے؟“ بچے نے بھرے بالوں وا۔ لڑکے سے پوچھا۔

”لائٹ بج سے بند ہے برف کیا پودوں پہ آگرم رہی ہے یا دھوپ میں بن رہی ہے؟“ جوابا رزم کاٹ کھانے والے انداز میں بچے سے سوال کیا بچے نے نظریں اس کے غصے بھرے چہرے کو دیکھا او منہ بناتا ادائے بے نیازی سے اگلے گھر کے دروازے کو بجانے لگا۔

”دماغ خراب کیا ہوا ہے سب نے۔“ وہ غصے سے دروازہ زور سے بند کر کے اندر چلا گیا۔ بلا آئینہ گھنٹے کے صبر آزمایا انتظار کے بعد لائٹ آئی مہینے سے شرابور جسم پر پچھنے کی ہوا بڑی ٹھنڈی لگ رہی تھی وہ سیدھا ہو کر لیٹ گیا دو تین منٹ ہی گزرے

جون کی چلچلاتی دوپہر میں کرما کا تپتا سورج آگ برساتا فلک یہ جلوہ افروز تھا اس کی دہشت ہی اتنی تھی کہ انسان، چرند پرند بھی اپنے اپنے ٹھکانوں تک محدود رہنے پر مجبور تھے، کاروبار زندگی شدت گرمی کے باعث قدرے ست پڑ گئے تھے ہر کوئی ٹھنڈی اور پرسکون جگہ چاہتا تھا رزم سر درد کی وجہ سے آفس سے جلدی گھر آ گیا تھا اور اب کونے والے قدرے کم گرم کمرے میں آرام کر رہا تھا جب کوئی زور دار دستک سے دروازہ ٹھوک کر اس کے آرام میں خلل ہوا تو اس نے بد مزہ ہو کر گھڑی کی طرف دیکھا۔

”اتنی گرمی میں کون آ گیا؟“ ڈھائی بج رہے تھے وہ بڑبڑاتا ہوا سیلپر میں پاؤں اڑستا باہر کی طرف بڑھالبا کھلا صحن آج سے پہلے بھی اتنا برا نہیں لگا تھا جتنا اب لگ رہا تھا جھپتی ہوئی دھوپ نے اسے مزید بے زار کر دیا۔

”کون ہے؟“ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

”برف ہے؟“ جوابا جو سوال ہوا اس نے اس کے تن بدن میں آگ بنی لگا دی۔

”نہیں ہے۔“ اس نے غصے سے جواب دیا اور تقریباً ہماگتا ہوا واپس کمرے تک آیا۔

”ساری نیند خراب کر دی آوارہ گردوں نے خود تو ان ڈھیلوں کو گرمی سردی اثر نہیں کرتی۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا دوبارہ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆☆

وہ چند مخصوص پشمان بچے تھے جو اس محلے سے

”اتنی گرمی ہے ان لوگوں کا بھی ٹھنڈا پانی پینے کو دل کرتا ہوگا۔“ ارزم اماں کی اس خدمت خلاق سے سخت چڑتا تھا۔

آج کل اماں خالہ کے گھر گئی ہوئی تھیں کہ خالہ کی

☆☆☆☆
 دودن بعد اماں آگئیں ارم نے انہیں نے
 بیوں کا بتایا تو وہ خود جا کر ان سے مل کے آئیں
 اپنی پر وہ بہت خوش تھیں نئی پڑوسن سیما آئی اماں
 لکے کے محلے کی ہمسائی نکلیں دونوں اسکول انٹرمی
 دہائی تیس پھر ان کی پڑھائی چھڑوا کر انہیں پیادلس

”اچھا تو بیٹا تم ہی کسی اسکول سے پڑھ کر دو؟“ وہ بے چاری کہاں خوار ہوئی رہیں گی۔“ اماں کے کہنے پر ارزم نے اگلے چند دنوں میں قریبی پرائیویٹ اسکول میں اسے جا ب دلاوادی 6000 تنخواہ ابھی سیسا آئی اسی پر بھی بہت خوش ہوئیں اور ارزم کا مفکر یہ ادا کرتے نہ تھیں، سیسا آئی کے کھر فرج نہیں تھا تو اماں روزانہ کو بڑا کنوڑا برف دیتی تھیں ارزم افس میں بڑی رہتا اس کے بعد اس کی سیسا آئی سے ملاقات نہ ہوئی۔

☆☆☆☆
 رمضان المبارک کی آمد کے ساتھ گرمی کی شدت میں اضافہ ہوا تو گھر سے ٹھنڈا مزید دو بجھ ہو گیا۔
 روزے میں پیاس کی شدت سے برا حال ہو جاتا۔
 ”آج تو بہت ہی گرمی ہے ارزوم! ویسے اس وقت تک تو روزہ توڑش کم ہو جاتی ہے۔“ اماں نے تبت

پر یلگی ہیٹ پاؤڈر چہرے اور گردن پر لگاتے ہوئے
کہا تو ارزم نے فائلوں سے سراٹھایا۔
”مگر اللہ کا شکر ہے کہ بجلی ہے ورنہ جب بھی
زیادہ گرمی ہوتی ہے بجلی والے بھی ناک میں دم
کر دیتے ہیں۔“ ارزم نے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں
نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا وہ دونوں یونہی باتیں کر رہے
تھے جب دروازے پر دستک ہوئی۔

”ان برف والوں کو تو روزوں میں بھی جین نہیں
ہے قسم سے اماں! بڑے ہی ڈھیٹ بچے ہیں۔“
ارزم فحش سے بولا تو اماں نے ایک نظر بیٹے کے فحش
بھبرے چہرے پر ڈالی آج تیسرا روز تھا ارزم کے
آفس کی ٹائمنگ کل ہی تبدیل ہوئی تھی اب وہ روز
اس ٹائم گھر ہوتا تھا۔

”تو کیا اب وہ بے چارے افطاری کے لئے
برف بھی جمع نہ کریں۔“ اماں نے ارزم کو جواب دیتے
ہوئے فریج سے برف کا ٹورا نکالا تو اس نے اماں کی
طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اماں کے ہاتھوں سے
برف لے کر شاہر میں ڈال کر دروازے کی طرف
بڑھا۔

”اتنی تھوڑی۔“ برف دیکھ کر بچے نے حیرت
سے آنکھیں پھیلالیں۔

”اور برف ہے؟“ دوسرے بچے نے سوال کیا تو
ارزم نے اسے گھورا۔

”نہیں اتنی ہی تھی اب جاؤ۔“ اس نے سختی سے
جواب دے کر دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر کی
طرف بڑھا پیچھے سے پھر دستک ہوئی۔

”بہت ہی ڈھیٹ ہیں یہ تو سیدھی زبان سمجھ نہیں
آتی انہیں۔“ ارزم غصے سے پلٹا۔

”اب کیا تکلیف ہے؟“ اس نے غصے سے
دروازہ کھول کر پوچھا تو سامنے کھڑی لڑکی گڑبڑا گئی

ارزم ایک مرتبہ پھر اپنی حرکت پر شرمندہ ہوا۔
”جی فرمائیے۔“ اس نے قدرے نرم لہجے میں

پوچھا۔

”وہ برف چاہئے۔“ لڑکی نے جھجکتے ہوئے بتایا۔
”سوری برف نہیں ہے۔“ اس نے جلدی سے
جواب دیتے ہوئے دروازے کی کھڑکی کی طرف
ہاتھ بڑھایا کہ اس سے پہلے مزید کوئی برف والا آئے
دروازہ بند کر لوں۔

”جی مگر.....“ آخری تو روز برف دیتی ہیں اماں
کو۔“ لڑکی کے سوال پر غور سے اسے دیکھا تو مزید
شرمندہ ہو گیا وہ ساتھ والی آخری کی بیٹی انوشے بھی
ارزم نے اسے پچھانا ہی نہ تھا کیونکہ آج وہ بچپلی
ملاقات سے قدرے مختلف حلقے میں تھی لان کے لیسن
کلر کے سوٹ میں نیوی بلیو بڑا دوپٹہ چہرے کے گرد
سلیقے سے لپیٹا ہوا تھا پھر ارزم سے ایک بار ہی تو
ملاقات ہوئی تھی۔

”اوہ آئی ایم سوری میں نے آپ کو پچھانا ہی
نہیں تھا۔“ ارزم نے معذرت کی تو وہ مسکرائی اسے
بھی سمجھا آگئی تھی۔

”ویسے روزوں میں برف؟“ ارزم نے سوال
کیا۔

”جی وہ افطاری کے لئے“ کچھ دیر پہلے ڈالیں تو
افطاری تک ٹھنڈا پانی ہوتا ہے۔“ جواباً اس نے
وضاحت دی تو وہ مسکرایا۔

”اچھا آپ ٹھہریں میں ابھی لے کے آتا
ہوں۔“ وہ تیزی سے بولتا اندر پلٹا۔ اندر اماں کے
پوچھنے پر اس نے بتایا تو اماں خفا ہوئیں۔

”بچی کو فیروں کی طرح دروازے پر کیوں روکا
ہوا ہے اندر لے آؤ اتنی گرمی ہے باہر۔“ لہذا ارزم
بھاگا دوڑا باہر گیا اور انوشے کو لے کر اندر آیا۔

”نیٹھو بیٹا نیٹھو! یہ ارزم بھی نا پکا ہے بالکل خواہ
مخو تمہیں اتنی گرمی میں باہر کھڑا کر دیا۔“ اماں نے
ارزم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو ارزم نے منہ بتایا
انوشے کی۔

”ارے تم یہیں کھڑے ہو جاؤ جا کے انوشے
لے لئے ٹھنڈا بنا کے لاؤ۔“ اماں نے اسے پیچھے
بٹ پڑے کھڑا دیکھ کر جلدی سے کہا تو تیزی سے
پلٹتے ہوئے رکا اور حیرت سے اماں کو دیکھا۔

”اماں! رمضان ہے۔“ ارزم نے اماں کو یاد
دلا تو اماں نے بے اختیار سر پر ہاتھ مارا انوشے نے
سٹراتے ہوئے منہ نیچے کر لیا ارزم بھی مسکرایا۔

”اس گرمی نے مت مازی ہوئی ہے مجھے تو یاد ہی
نہیں رہا تھا۔“ اماں گرمی کو کوستے ہوئے بولیں تو
ارزم جو برف تھامے کھڑا تھا برف کی ٹھنڈک مزید
برداشت نہ کرتے ہوئے فوراً آگے بڑھا اور برف
والا شاہر انوشے کے سامنے میز پر رکھ دیا انوشے نے
سراٹھا کر اسے دیکھا وہ کچن کی طرف بڑھا۔

”یہ میرا ارزم نامیرا بیٹا بھی ہے اور بیٹی بھی۔“
اماں نے پیار سے بتایا۔

”کھڑ بیٹی۔“ انوشے کے منہ سے بے اختیار نکلا
تو کچن میں کھڑے ارزم نے فوراً پلٹ کے اسے
دیکھا انوشے گھبرا کے فوراً کھڑی ہو گئی۔

”اچھا آخری میں چلتی ہوں اماں انتظار کر رہی
ہوں گی۔“ انوشے نے شاہر اٹھاتے ہوئے کہا تو اماں
نے سر ہلایا۔

”ارزم بیٹا! چھتری لے کے انوشے کو گھر تک
پہنچاؤ آؤ دھوپ بہت تیز ہے۔“ اماں نے اسے
پکارا۔

”بچی کو خود نہیں پتا کہ دھوپ تیز ہے آئی تو ایسے
ہی تھی۔“ ارزم فحش سے بڑبڑاتا ہوا باہر آیا اور اماں کو
دیکھ کر مسکراتے ہوئے چھتری اٹھائی ساتھ ہی ایک
اپنی نظر انوشے پر ڈالی۔

”نہیں آخری! میں چلی جاؤں گی چھتری کی
ضرورت نہیں ہے شکریہ۔“ انوشے اسے چھتری کھولنا
دیکھ کر جلدی سے بولی۔

”کیوں ضرورت نہیں ہے باہر اتنی گرمی ہے بیٹا“

گرمی میں احتیاط کرتے ہیں جاؤ ارزم۔“ اماں نے
انوشے کو سمجھاتے ہوئے ارزم کو باہر نکلنے کا کہا تو وہ
دونوں باہر آ گئے۔

”ارزم جی۔“ دروازے پر پہنچ کر انوشے نے
اسے پکارا تو ارزم نے حیرت سے اسے دیکھا۔

”سوری میں نے آپ کو کھڑ بیٹی کہا آپ کو برا
لگا۔“ انوشے کے شرمندہ انداز پر ارزم اسے دیکھتا ہی
رہ گیا، جھکی پکلیں شرمندہ لہجہ اسے خاموش پاکر
انوشے نے اسے دیکھا تو ارزم چونکا۔

”اُس اوکے۔“ وہ مسکرایا تھا اس معصوم معذرت
پر وہ اندر چلی گئی تو ارزم واپس آ گیا مگر کچھ خالی پن
سامحوس ہوا جیسے کچھ گھو گیا ہے۔

☆☆☆☆

ارزم کے دوست حسن کے ہاں ان سب
دوستوں کی افطار پارٹی تھی ارزم عصر کے بعد پہنچ گیا۔

”یار ایک کام کرو باہر سے برف تولے آؤ یہ کم
ہوگی اتنے میں باقی سامان میں ریڈی کرتا ہوں۔“ وہ
دونوں شربت بنا رہے تھے جب حسن نے کہا تو ارزم

برف لینے چلا گیا گلی کے کونے پر ہی اسے برف نظر
آگئی دو بیچے ایک دکان کے باہر دری بچھائے برف
بچ رہے تھے ارزم نے غور کیا تو حیران رہ گیا کہ یہ

دونوں لڑکے تو وہی برف والے تھے جنہوں نے اس
کی ناک میں دم کیا ہوا ہے روز دن میں دو بار محلے
میں برف مانگتے آتے ہیں۔

”یہ برف لے کے یہاں بیچتے ہیں۔“ ارزم کو
ناہنیں دیکھ کر غصہ آیا۔

”چلو کوئی بات نہیں ہماری مدد سے کسی کا بھلا
ہو جاتا ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“ ایک دم ہی اسے
اماں کی بات یاد آئی تو مسکرا کر سر جھٹکتا آگے بڑھ گیا

ان لڑکوں کی برف ارزم کے پیچھے تک بک گئی تھی اب
وہ دری اٹھا کر شاہر میں ڈال رہے تھے ارزم آگے نکل
گیا کہ کہیں اور سے پتہ کر لوں۔ کچھ دیر بعد وہ برف

☆☆☆☆

میں آنے سے ان کی عزت میں فرق آتا تھا چچا تم

”خیر تمہارا شادی کے بارے میں کیا خیال ہے؟
بھئی میں تو اس تنہائی سے بے زار ہو گئی ہوں۔“

”پہلے میں دروازہ کھول آؤں، پھر آپ کہیں گی کہ بچی کو غیروں کی طرح دروازے پر کھڑا کر رکھا

انوشے لہجہ کر تیزی سے بولتی دروازے کی طرف بڑھی۔
”ارے برف تو لیتی جائیں۔“ وہ پیچھے سے
پکارتا آگے آیا۔

”نہیں شکریہ..... آج..... گرم پانی سے ہی۔“
”بڑا ہی چھونڈا دل ہے آپ کا انوشے جی خود تو
آپ روز آ جالی ہیں آج ہم نے کچھ مانگا تو آپ نے
ارادہ ہی بدل لیا دس ازناٹ فیز۔“ ارزم نے انوشے
کے راستے میں آتے ہوئے شکوہ کیا تو اس نے چونک
کر اسے دیکھا وہ مسکرا کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

”چلیں جائیں کیا یاد کریں گی آج ہم خود
برف دینے آئیں گے بلکہ ایسا کریں کہ افطاری کی
اچھی سی تیاری بھی شروع کر دیں آج ہماری افطاری
آپ کی طرف ہے۔“ وہ شرارت سے بولتا ہوا مسکرا کر
سائیڈ پر ہوا تو وہ تیزی سے دروازہ پار کر گئی وہ اس کی
اس حرکت پر مسکرایا۔

صحن کے اختتام پر کمرے کے دروازے میں
کھڑی اماں نے مسکرا کر اپنے بیٹے کی خوشیوں کے
دائمی ہونے کی دعا کی انہیں اپنے بیٹے کی پسند پر فخر ہوا
جیسا وہ صاف دل اور پیارا تھا ویسی ہی اس کی پسند
بھی پیاری صاف دل اور سادہ سی مٹی اماں کو انوشے
شروع دن سے ہی اچھی لگتی تھی مگر وہ ان کے لاڈ لے کو
بھی اچھی لگتی ہے اس بات کا انہیں اندازہ نہیں تھا وہ
لوگ بھی ان کی طرح خونی رشتوں کے ڈسے تھے۔

”اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے نصیب میں
ایسی سعادت مند اور نیک اولاد لکھی بس میرے بچوں
کے نصیب بھی اچھے کرنا اور انہیں کسی کی نظر نہ لگے
آمین۔“ اماں نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دعا
کی۔ وہ اپنے پروردگار کی مشکور تھیں کہ جس نے ہمیشہ
انہیں نوازہ مشکلات میں مبرکھایا اور حوصلہ دیا بے شک
وہ ذات غفور و رحیم ہے جو اپنے بندے کا اس وقت بھی
ساتھ دیتی ہے جب سب ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

ہے اتنی گرمی میں۔“ ارزم نے شرارت بھرے لہجے
میں اماں کا کہا جملہ دہرایا تو اماں مسکرائیں اور پیار
سے بیٹے کو دیکھا۔

”اندر لے کے آؤں گا، ڈانٹنا ضرور ہے کہ برف
لیتے لیتے آپ کے اکلوتے بیٹے کا دل بھی لے گئی۔“
ارزم نے جاتے جاتے اماں کو تنبیہ کی تو وہ ہنسنے
لگیں۔ دروازے پر اسے کھڑا دیکھ کر ارزم کے لب
خوشی سے مسکرائے۔

”سوری کہ آپ کو گرمی میں ویت کرنا پڑا بٹ
آئی پراس آئندہ آپ کو انتظار نہیں کراؤں گا۔“
ارزم نے اس کے صحن چہرے کو نظروں کے حصار میں
لیتے ہوئے ذومعنی انداز میں کہا تو اس نے حیرت سے
اسے دیکھا وہ کافی خوش لگ رہا تھا ورنہ عموماً اس ناظم
وہ غصے میں ہی دروازہ کھولتا تھا۔

”جی وہ۔“ اس نے بولنا چاہا۔

”برف ہے آپ آئیں نا۔“ ارزم نے سائیڈ پر
ہوتے ہوئے اسے اندر آنے کی دعوت دی تو وہ
خاموشی سے اندر آ گئی۔

”انوشے۔“ صحن سے گزرتے ہوئے ارزم نے
اسے پکارا تو وہ چونک کر کھلی۔

”آپ روز ہم سے برف لیتی ہیں آج اگر میں
آپ سے کچھ مانگوں تو؟“ ارزم نے اس کی آنکھوں
میں جھانکتے ہوئے تمہیر لہجے میں سوال کیا۔

”بہن۔“ اس نے ارزم اور اس انداز پر نا سمجھنے
والے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

”آپ ہمیشہ کے لئے اس گھر میں آ جائیں نا
تاکہ میرے بجائے آپ کو روز دروازے تک آنا
پڑے میرے لئے دروازہ کھولنے۔“ وہ اسی انداز میں
کہہ رہا تھا انوشے نے شپٹا کر نظریں چرائیں۔

”برف دیتے دیتے نجانے کب میرا دل آپ کے
پاس چلا گیا مجھے یہ ہی ٹیکس چلا اس واردات کا۔“
”آ..... وہ..... میں جلتی ہوں۔“ ارزم بول رہا تھا

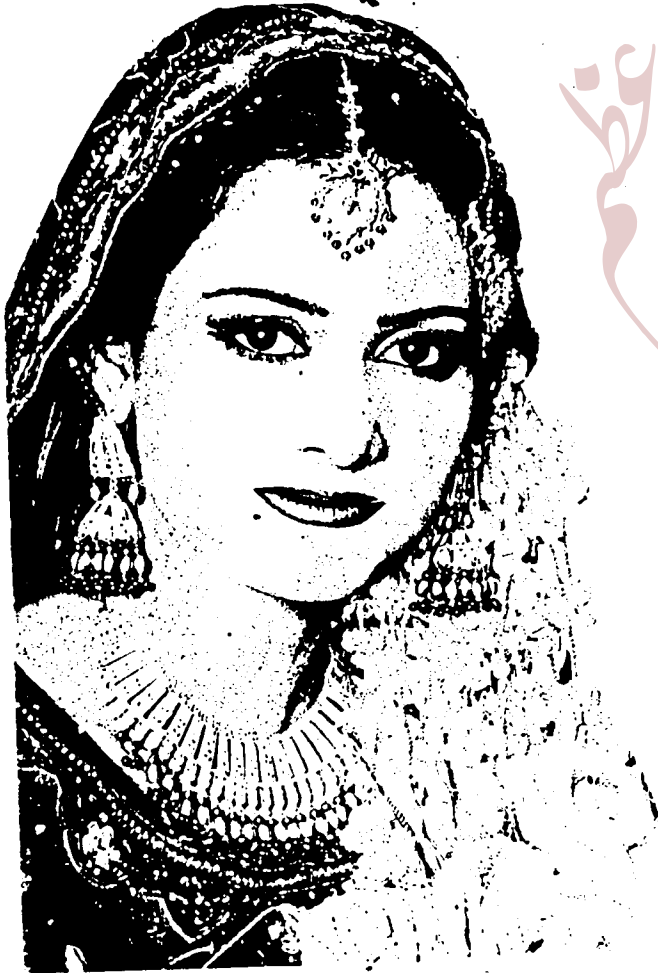
گنجینہ

پنکھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا دے رہا تھا۔ دن کی نسبت رات میں موسم کافی ٹھیک ہو گیا تھا۔ درندہ کی گرمی تو پینے میں ہی نہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ نجم، سعد اور کنیز نور تینوں بچے اپنے پاپا کا انتظار کرتے کرتے سو چکے تھے۔ آج ستائیسویں روزے کی شب تھی۔ اندازہ تھا کہ تین دن بعد عید ہو جائے گی۔

ایسا تینوں بچوں سمیت پنک پر لٹٹی ہوئی چھت پر لگے پچھلے کود کچھ رہی تھی۔ پچھلے کے گھومتے پروں کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی ویسے ہی گھوم رہی تھیں۔ اسے بے حد غصہ آ رہا تھا شیم عثانی پر۔ اسے لگتا تھا سوچ سوچ کر اس کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی مگر فی الحال اس کے پاس سوچنے کے علاوہ کرنے کو کوئی اور کام نہ تھا اور اگر کوئی کام ہوتا بھی تو وہ ابھی اس کنڈیشن میں بالکل بھی نہیں تھی کہ کچھ کام کرتی۔ ابھی وہ غصے سے بھرپور تھی اس کی آنکھیں غصے کے مارے سرخ ہو رہی تھیں۔ اتنا غصہ عام بات نہیں تھی۔ اسے پہلی بار اتنا غصہ آیا تھا اور وہ بھی شیم عثانی پر۔ پچھلے کے پروں سے ہی گھوم رہے تھے۔ اس نے اپنی نظروں کا مرکز بدلا۔ اس کی نگاہیں جا کر سوئی ہوئی معصوم کنیز نور پر جا شمریں۔ نور ہو بھوپا اپنے والد شاہ زین کی کافی تھی۔

”کتنّا خوش تھے ہم چاروں اپنے گھر میں۔ شاہ زین، کنیز نور میں اور میری امی۔“ اس نے دل میں سوچا آنکھوں کے کنارے کیلے ہو گئے۔

”نا اس رات شاہ زین امی کے ساتھ بائیک پر جاتے اور نا یہ سب کچھ ہوتا۔“ اس کے دل نے دہائی



دی اور آنسو جھلک پڑے۔

شن.....شن.....شن گھڑی نے تین بجائے رات کے تین۔ ٹھیک اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اسے پتا تھا وہی لوٹ کر آیا ہے۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر رابادری عبور کرتی صحن میں آگئی تھی۔ مین گیٹ کھول کر واپس رابادری کی طرف مڑی۔

”آپ نے اتنی دیر کیوں کر دی آنے میں؟ آپ نے کہا تھا بس دیکھ کر واپس آ جاؤں گا۔ آپ کو پتا تھا نور نے آج پہلا روزہ رکھا تھا اور اسے آنسکریم کھلانے کا وعدہ کرنے کے باوجود آپ اتالیٹ آئے ہیں کہ تینوں بچے سو گئے۔“ وہ تینوں بچوں پر آواز کو اونچا کر کے بولی۔ اس کا غصہ آج عروج پر تھا۔ اس سے پہلے اس نے بھی اتنا غصہ نہیں کیا تھا۔ شیم عثمانی پر۔ آج اسے اپنا شوہر بیٹا ہوا نظر آیا تھا۔

”خفصہ کا اپنڈکس کا آپریشن تھا۔ باپ ہونے کے ناتے میرا باپ رہنا ضروری تھا۔“ اسے اپنی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی سنا دی وہ مگر وہ کھڑا اسی کے سامنے تھا۔ ایک مجرم کی طرح جس کی کوئی معافی بھی نہ ہو اور نہ ہی نہ ہو۔ جو بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار تھا۔ نمرہ بٹ اور ایسیا سلوئی کی نظروں میں مجرم۔

وہ دونوں گھروں میں توازن برقرار نہیں رکھ پا رہا تھا۔ اس ندامت اور شرمندگی سے اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ایسیا سلوئی کے سامنے بھی اس کی احساس ندامت سے وہی حالت تھی اور کچھ دیر پہلے نمرہ کے سامنے بھی اس کی ویسی ہی حالت تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ نمرہ اسے کچھ نہ کہتی اور ایسیا اسے کچھ کہنے ہی نا ہوتی تھی۔

اگلے کافی لمحوں تک ایسیا اسے لعن طعن کرتی رہی مگر وہ کچھ سن ہی نا سکا۔

اگلی صبح جب وہ بغیر سحری کے اپنے کام پر جانے لگا تو اس وقت تک نور، نجم اسکول جا چکے تھے اور دو سالہ سعد لیہا کی گود میں بیٹھا کھیل رہا تھا۔ کل کا چاند ڈھل چکا تھا۔

آج نیا چاند طلوع ہوا تھا مگر ایسیا کے چہرے کے گہرے تیر جوں کے توں تھے۔ وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا گھر سے نکل گیا۔

شیم عثمانی کے جانے کے بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جولا دکل شب سے اس کے دل میں پک رہا تھا۔ آج کسی آتش فشاں کی طرح اس کی آنکھوں سے جاری ہو گیا۔ دو سالہ سعد اپنی ماں کو یوں روتے دیکھ کر خود بھی نا بکھی میں رونا شروع ہو گیا۔

وہ اور کبھی کیا سکتی تھی۔ صبر اور برداشت کے الفاظ اس نے اپنی زندگی کی کتاب سے نکال باہر کئے تھے۔ اتنی محرومیاں سہنے کے بعد اسے ان لفظوں سے ہی نفرت ہو گئی تھی تو بھلا کیسے یہ ساری صفات اس کی شخصیت میں موجود ہوتیں۔ اس نے شیم عثمانی سے نکاح کے بعد اپنی زندگی کا یہ اصول بنایا تھا کہ جو میرا ہے وہ میرا ہے اور جو نہیں ملتا اسے چھین لو۔

☆.....☆

شاہ زین اس کا پہلا شوہر تھا۔ اسی گھر میں کچھ سال پہلے تک وہ اس کا شوہر شاہ زین، اس کی بیٹی کینز نور اور اس کی امی رہا کرتے تھے۔ زندگی پرسکون گزر رہی تھی۔ شاہ زین سے اس کی شادی کو تین ہی سال ہوئے تھے۔ ان تین سالوں میں اس نے شاہ زین کے ساتھ بہت اچھا وقت گزارا۔ شاہ زین ہر ماہ تنخواہ لاکر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تھا۔ شہزادیوں کی طرح رکھا تھا اس نے ایسیا کو اور وہ خوشی سے نہال ہوئی جاتی۔

اس رات موسم اس کے ساتھ برائی کر رہا تھا۔ صبح سے ہی اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ غلطی ہو رہا تھا۔

بھی کھانا پکاتے ہوئے مصالحوں زیادہ پکانے سے جل گیا۔ صبح دودھ ابل پڑا۔ آفس جانے کے لیے شاہ زین کی فیورٹ شرٹ استری کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے جل گئی۔ دوپہر میں اس نے صحن کینز نور کو نہلانے کے لیے پانی گرم کیا تو برتن بالٹی میں انڈیلنے ہوئے آدھا گرم پانی اس کے پیروں پر آگرا۔ وہ

پنا کے رہ گئی۔ کچھ دیر بعد کھیتے کھیتے کینز نور نے ایسیا کا موبائل فون پانی میں گرادیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ موبائل فون نا کارہ ہو گیا۔

”میں کب سے فون کر رہا تھا تم فون کیوں ریو نہیں کر رہی تھیں؟“ شام میں جب شاہ زین آفس سے لوٹا تو ایسیا کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے پوچھا۔

”وہ دراصل کینز نور نے موبائل فون پانی میں گر دیا تھا اس لیے وہ خراب ہو گیا ہے۔“ اس نے وضاحت پیش کی تھی۔ چائے کا کپ لیتے ہوئے شاہ زین کی نظریں اس کے سوجے ہوئے پیروں پر پڑی۔

”تمہارے پیروں پر سوجن کیوں آرہی ہے۔“ اس کا لہجہ بے حد تشویش ناک تھا۔

”مگر مانی گر گیا تھا۔“ اس نے دوسری بار وضاحت پیش کی۔

”چلو ڈاکٹر کے پاس۔“ وہ بے حد حساس تھا۔ دوسروں کی تکلف پر خود تپ جاتا تھا۔

”نہیں پہلے آپ اسی کو ڈاکٹر کے پاس لے جائیں۔ صبح سے بخار میں تپ رہی ہیں۔ میں نے پیروں پر برنٹال لگایا تھا۔ کل چلوں گی ڈاکٹر کے پاس ابھی میری ہمت نہیں ہو رہی۔“ وہ صاف گوئی سے بولی۔ آج وہ بے حد تھک گئی تھی۔ اب آرام کرنا چاہتی تھی۔ امی اور شاہ زین کے جانے کے بعد وہ ایسا سوئی کہ گیٹ کے دھڑ دھڑپنے سے ٹھہری۔

☆.....☆

گیٹ کھولا تو باہر دو ایبویٹس تھیں۔ وہ کچھ نہ سمجھ پائی مگر اتنی نا سمجھ تو وہ بالکل نہیں تھی۔

دو لائیں اس کے گھر کے صحن میں رکھی گئیں۔ ایک اس کا شوہر شاہ زین اور دوسری اس کی امی۔

جائے وقوع پر موجود لوگوں نے بتایا کہ پارش کے باعث سڑک چٹنی ہو گئی تھی اور بائیک سلف ہو گئی۔ اس کی امی گر کر سر پر چوٹ لگنے کے باعث اسی وقت

انتقال کر گئیں۔ شاہ زین صبح سلامت تھا۔ وہ گرا تھا بائیک دور جا کر گئی تھی۔ وہ اٹھا اور دوسرا موبائل کے پاس گیا تھا ابی جس وقت حرکت سڑک پر پڑی تھیں۔ بے تحاشہ خون بہہ رہا تھا۔ شاہ زین جیسا حساس دل برداشت نہ کر سکا اور وہ چکرا کر اسی لمحے سڑک پر گر پڑا۔ اسی وقت جب کہ ایسیا سلوئی اور کینز نور پرسکون خیند کے مزے لے رہی تھیں۔ کینز نور خیم ایسیا سلوئی بیوہ ہو چکی تھی۔

شوہر کے مرنے کے بعد کینز نور کی بیوہ ماں کو شوہر کی حیثیت سے سہارا دینے والا شیم عثمانی پہلے سے شادی شدہ اور پانچ بیٹیوں کا باپ تھا۔ اسٹیٹ ایجنسی میں بروکر کا کام کرتا تھا۔

ایسیا سے اس کی ملاقات اس طرح سے ہوئی کہ وہ اپنے شوہر اور ماں کی وفات کے بعد اپنی دو سالہ بیٹی کے ہمراہ بالکل تنہا رہ گئی تھی۔ اور اپنے شوہر کا یہ گھر جس میں وہ چاروں خوش و خرم زندگی بسر کرتے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد اسے کاٹ کھانے کو دوڑنا تھا اور ویسے بھی اکیلے اس کا رہنا مناسب نہ تھا۔ اس لیے اس نے اس گھر کو کوچ کر کے فلاحی ادارے میں سکونت اختیار کرنے کا سوچ لیا تھا اور اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے گھر کی قریبی اسٹیٹ ایجنسی کا رخ کیا تاکہ گھر تک جائے۔

پھر ایسا ہوا کہ شیم عثمانی کو ایجنسی کے مالک نے گھر دیکھنے کے لیے بھیجتا تو اس کے کانوں میں ایسیا کی مجبوری کی بھنگ پڑی اور اس نے نیکی کی نیت سے اسے اور اس کی بیٹی کو سہارا دینے کی ٹھان لی کیونکہ اس کی بھی پانچ بیٹیاں تھیں اور نور بن باپ کی بیٹی تھی اس کی پرورش کرنے کا ارادہ کر لیا۔

وقت گزر چکا تھا اور اب کینز نور کے ساتھ ساتھ نجم اور سعد بھی ایسیا اور شیم عثمانی کی آنکھ کے تارے بن گئے تھے۔ ایسیا کی عاجزانہ طبیعت اب آہستہ آہستہ ناشکری کی حد دھچھونے لگی تھی۔

”نور..... نور..... دیکھو میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“ شام کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے شمیم عثمانی کے دونوں ہاتھ فروٹ اور ٹیک، نمکو سے بھرے ہوئے شاپر ز تھاے ہوئے تھے۔

باپ کی آواز پر نور دوڑی ہوئی آئی اور جلدی جلدی شاپر ز ان کے ہاتھ سے لے لے لے۔ کل ستائیسواں روزہ تھا اور اس نے پہلا روزہ رکھا تھا۔ حصہ کے اینڈکس کے آپریشن کی وجہ سے شمیم عثمانی افطاری کے وقت بھی ہسپتال میں تھا اس لیے کینز نور کے لیے وہ آج اہتمام کر رہا تھا۔

اتنے میں لیبیا بھی بچن کے کاموں سے فارغ ہو گئی اور دسترخوان بچھا دیا۔ مغرب کی اذان ہوئی تو دعا پڑھ کر روزہ افطار کیا۔ روز کی طرح آج بھی لیبیا اور شمیم نے ہی روزہ رکھا تھا۔ کل ستائیسواں روزہ تھا تو ضد کر کے کینز نور نے کل پہلا روزہ رکھا تھا مگر کل کی نسبت آج پورا دسترخوان پکڑوں، نمکو، ٹیک، فروٹ اور کسٹرز سے سجا ہوا تھا۔

”کھانا اب باہر چل کر کھائیں گے۔ تم بچوں کو تیار کر دو آج شاپنگ کروادو اور عید کی۔“ وہ لیبیا کو آگاہ کر کے مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ واپس آئے تو چاروں ان کے انتظار میں کھڑے گھر کے برآمدے میں ہی مل گئے۔

”ارے واہ آپ سب تو بالکل تیار ہیں۔“ شمیم نے بچوں کو پیار سے کہا۔

”جی ہاں اور ابو مجھے روزہ کسائی کا مفت جمی چاہیے ہوگا۔“ نور نے جبکتے ہوئے کہا۔

”ہاں ہاں دلا دوں گا پاپا کی پیاری مزیارانی۔“ شمیم عثمانی نے پیار سے جواب دیا اور سب گھر سے بازار کے لیے نکل پڑے۔

پچھلے چار سالوں کی طرح اس بار بھی یہ لوگ اٹھائیسویں روزے کی افطاری کے بعد شاپنگ

کر رہے تھے۔ تینوں بچے اور خود لیبیا کے لیے ریڈی میٹ کپڑے خریدے جارہے تھے۔ سینڈل پرس سے لے کر بال پن تک جس چیز پر نور نے ہاتھ رکھا لیبیا نے اگلے ہی بل وہ چیز اس کی ملکیت کر دی۔ لیبیا نے اپنے لیے اور اپنے دونوں بیٹوں کے لیے بھی شاندار خریداری کی تھی۔

چاروں جب شاپنگ سے فارغ ہو گئے تو لیبیا کو شمیم عثمانی کا خیال آیا اور وہ اسے اس کے لیے کپڑے پسند کرواتے ہوئے اس کی مرضی پوچھنے لگی مگر وہ تو اس شاپنگ میں شامل ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہ تھا۔ اس کا دھیان بار بار نضی حصہ پر جا رہا تھا جو گزشتہ شب درد سے تڑپ رہی تھی۔

ان پانچ بیٹیوں میں اور کینز نور میں کتنا زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ انتہائی مبر و شکر کرنے والی بیٹیاں جو بہو، بیوی یا ماں پر مگنی تھیں۔

انہوں نے تو ابھی تک اپنے لیے عید کا ایک جوڑا تک نہیں بنوایا تھا اور شاید پیٹ بھر کر ایک روزہ بھی افطار نہیں کیا تھا، تو وہ کیسے یہ عید منا سکتا تھا۔ اپنے لیے کچھ خرید سکتا تھا۔

وہ تو ماتم کرنا چاہتا تھا۔ اس دن کو کونا چاہتا تھا جس گھڑی اس نے لیبیا سلوی کو اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے سہارا دینے کا فیصلہ کیا تھا جس نے اس کی معصوم بچیوں اور صابر و شاکر شریک حیات کو اس سے دور کر دیا تھا۔ ان بچیوں سے اس کے باپ کی شفقت چھین لی تھی۔

”کتنی کم ظرف عورت ہے یہ۔ ایک بیٹی کی ماں ہوتے ہوئے بھی دوسری بیٹیوں کا دکھ نہیں سمجھ سکتی۔ یا اللہ! مجھے معاف کر دینا۔ میں کتنا مجبور ہے بس ہوں کہ میں اپنا فرض ادا نہیں کر سکتا۔“ اس نے خفی سے سوچا۔

”اما! مجھے کالج کے لاسٹ ایئر کے فنکشن کے

لیے دس ہزار روپے چاہئیں۔“ انیس سالہ کینز نور کے اخراجات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کافی وسیع ہو گئے تھے اور وہ بلا جھجک ہر دوسرے دن کوئی نہ کوئی بڑی فرمائش کر دیتی تھی۔ جیسے لیبیا روز اول کی طرح آج بھی لمبے بھرمیں پورا کر دیتی تھی۔

آج کھانے کے دوران جب کینز نور نے یہ انوکھی فرمائش کی تو شمیم عثمانی کا اپنی پلیٹ کی طرف بڑھتا :واہاتھ وہیں رک گیا اور وہ گن اکیوں سے لیبیا کی طرف دیکھنے لگے۔

”ہاں بیٹا! کل چاہیے ناں، دے دوں گی۔“ لیبیا نے محبت بھرے انداز میں نور سے کہا۔

”دس ہزار روپے وہ بھی کالج کے فنکشن کے لیے۔“ شمیم عثمانی سوچتے رہ گئے۔

”میری ابھی ماما! وہ کہہ کر پلیٹ آگے سرکا کر کھانا ادھورا چھوڑتی اٹھ کھڑی ہوئی اور خوشی کے مارے اپنی ماما سے لپٹ گئی اور اپنا موبائل فون اٹھاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

”ارے کھانا تو پورا کھا لو۔“ لیبیا نے جانی ہوئی کینز نور کو جلدی سے آواز لگائی جسے وہ اُن سا کر گئی۔

”نہو دودھ کا گلاس پی کر سونا۔“ انہوں نے دوبارہ آواز لگائی۔

”او کے ماما۔“ اس نے اپنے کمرے میں پہنچ کر وہاں سے تقریباً چلا تے ہوئے کہا تھا۔

شمیم عثمانی کڑھتے رہ گئے منہ پر تو فی الحال انہوں نے مصلحتاً قفل لگا لیا تھا مگر کانوں اور آنکھوں کا کیا کرتے۔ وہ سب دیکھ اور سن رہے تھے مگر فی الحال قفل کو توڑنا انہیں خاموش ہی رہے اور اسی خاموشی میں باقی چار نفوس ڈانٹنگ ٹیبل کے گرد بیٹھے رات کا کھانا کھاتے رہے۔

”دس ہزار روپے چاہئیں۔“ شمیم عثمانی نے تلخی کے ساتھ حلق سے آخری نوالہ اتارا۔

یہ گھر اب بارہ سال پہلے والا گھر نہیں رہا تھا۔ کام

میں ترقی ہونے کے بعد شمیم نے اپنا تمام اگلا پچھلا اثاثہ لگا کر اس دو سو گز کے دو کمروں اور ایک بڑے سے برآمدے والے مکان کو بنگلے نما گھر کی شکل دے دی تھی۔

وہ وہیں رہتے تھے۔ ان کے لیے ہی کھاتے تھے اور ان پر ہی خرچ کرتے تھے۔ ان لوگوں نے تو اس شخص سے نانا توڑ لیا تھا۔ چھ ماں بیٹیوں نے ایسے بے حس انسان کے بغیر عزت سے زندگی کی گاڑی چلانا سیکھ لیا تھا جو آدمی برے وقتوں میں ان کا ساتھ چھوڑ گیا تھا انہیں بھلا اب گھر میں سلائی کر کے اور اکیڈمی میں بیٹوں پڑھا کر خود بھی تعلیم یافتہ ہو جانے کے بعد ایسے شخص کی کیا ضرورت تھی۔ غمہ کی نظروں میں شمیم عثمانی اب محض ایک بے حس انسان رہ گیا تھا جسے اس کی بیٹیوں کو خیر مگر اس کی بیٹیوں کی بھی کوئی پرواہ اب نہیں رہی تھی۔

”کیا ضرورت ہے اسے اتنے سارے پیسوں کی۔“ کینز نور کے بعد نجم اور سعد بھی کھانے سے فارغ ہو کر اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو شمیم نے لیبیا سے پوچھا۔

”ارے کالج میں فنکشن ہے، اس کی تیاری کے لیے مانگ رہی تھی۔ سنا نہیں کیا آپ نے۔“

اس نے ٹیبل سے برتن اٹھاتے ہوئے لا پرواہی سے جواب دیا۔

”لاسٹ ایئر ہے ناں اب کالج کا، اب امتحان کے بعد یونیورسٹی میں داخلہ کروانا ہے۔“ وہ مزید بولی۔

”یونیورسٹی میں داخلہ ہو جائے گا تم فکر مت کرو مگر ابھی کے فنکشن میں دینے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ اگلے مہینے رمضان آ رہا ہے اس کے لیے بھی تو سوچو۔“ شمیم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

وہ ڈانٹنگ ٹیبل سے سارے برتن اٹھا چکی تھی اب میز پوش اٹھانے آئی تھی۔ یہ جواب سن کر وہیں

کری پر ہی بیٹھ گئی۔

”ہاں ہاں..... آپ تو ایسے ہی کہیں گے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے زار و دھڑا کرنا شروع کر دیا۔

”کے باپ تھوڑی ہیں آپ نور کے، اس شیم کا سگا باپ ہوتا تو ایسے اپنے پیسوں سے نہیں بلکہ اپنی اولاد سے پیار کرتا۔ تین لاکھ روپے کیش رکھے ہوئے ہیں میرے اس کے پاس۔ مگر مجال ہے جو بغیر پوچھے ایک روپیہ بھی اٹھایا ہو۔ آج پیسے چاہے تو مانگ لیے ناں اس نے مگر اپنی مرضی سے نہیں اٹھائے۔“ اس کا رونا اب شدید ہو گیا۔

شیم کو پتا تھا یہی ہونے والا ہے اس لیے انہوں نے نور، سعد اور نجم کی غیر موجودگی میں ہی اس ٹاپک پر بات کی۔

اس کا رونا اب اور تیز ہو گیا۔ وہ اس کے روز روز کے ڈرامے سے اکتا چکے تھے اس لیے وہاں سے اٹھ کھڑے ہو گئے۔

☆.....☆

دوسری صبح لیسا نے نور کو دس کے بجائے پندرہ ہزار روپے دیئے وہ بھی شیم عثمانی کو جلانے کے لیے ان کے سامنے۔

نور خوشی خوشی کانچ چلی گئی اور شیم اندر ہی اندر جلتے رہ گئی۔ دن کیسے گزر گئے پتا ہی نہ چلا۔ پھر سے رمضان کا اٹھائیسواں روزہ آ گیا اور یہ سب عید کی شاپنگ کے لیے نکل پڑے مگر اب تبدیلی یہ آچکی تھی کہ پہلے پانچوں ایک ساتھ جاتے تھے مگر اب کنیز نور اپنی کانچ کی دوستوں کے ساتھ نجم، سعد اپنی ماما کے ساتھ جاتے تھے۔ جب کہ شیم عثمانی گھر پر ہی رہتے تھے۔ اس دن کے بعد سے انہوں نے کوئی عید نہیں منائی تھی۔ وہ دن حصہ کے آپریشن کا دن تھا۔

تقریباً بارہ بجے تک سب شاپنگ کر کے واپس آ گئے تھے مگر نور کا کوئی اتاپتہ نہ تھا۔ فون کیا تو اس کا موبائل سوچ آف تھا۔ لیسا اور شیم پریشان ہو

رہے تھے کہ اب تک کیوں واپس نہ آئی۔ پہلے کبھی تو اتنی دیر نہیں لگائی تھی۔ لیسا دونوں ہاتھوں سے سر تھامے صوفے پر بیٹھی تھی اور شیم نگر کے مارے ہل رہے تھے۔ نجم اور سعد بھی پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔

پورے ایک گھنٹے بعد نور گھر کے مین گیٹ پر نمودار ہوئی۔ دریافت کرنے پر پتا چلا کہ میچنگ سینڈل نہیں مل رہی تھیں اور دوینڈ ڈانی کرنے کے لیے دیا ہے۔ چاند رات کو ملے گا اور آدھی شاپنگ ابھی باقی ہے۔ چاند رات کو مکمل ہوگی اور آج کی شاپنگ کا سامان اس کی کوئی دوست لے کر گئی ہے کہ سامان بہت وزنی تھا اور اکیلے لے کر آنے میں اس کے نازک ہاتھوں میں ہمت نہ تھی۔

اس نے سب مطمئن انداز میں بتایا پھر آج کی اس صورت حال پر سب نارل ہو گئے تھے۔ سوائے شیم عثمانی کے۔ مگر وہ کچھ بول ہی نہیں پا رہے تھے۔ ورنہ ان کو پھر سے سو تیلے باپ کا طعنہ مل جاتا اس لیے وہ آج پھر خاموش تھے۔

مگر یہ خاموشی کب تک، اس سنانے کے بعد ایک بہت بڑا طوفان لیسا سلوٹی کا منتظر تھا۔

اگلے دن چاند رات تھی۔ نور پھر سے دوستوں کے ساتھ شاپنگ کا پتا کر گھر سے نکل پڑی۔

رات کا ایک بج گیا وہ نہ آئی۔ گھڑی نے دو بج دیئے وہ پھر بھی نہ آئی۔ ابیا کرتے کرتے ڈھائی بج گئے۔

لیسا کی بے چینی بڑھتی گئی وہ بار بار دروازے تک جاتی اور واپس لوٹ آتی۔ اس کا موبائل فون گزشتہ شب کی طرح آج بھی سوچ آف تھا۔ اس لیے اس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ نجم اور شیم اس کے دوستوں کے گھر گئے اس کا پتا کرنے مگر اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔ سب دوست اس کے لاپتہ ہونے سے لاعلم تھے۔

لیسا تو جیسے پاگل ہو گئی ہو۔ وہ دونوں کی طرح بار بار ادھر تیسری بار اس کے کمرے میں گئی اچانک اس کی نظر اس کے بیڈ کے سائینڈ میل پر لیس کے نیچے رہے ہوئے ایک سفید کاغذ پر گئی۔ شیم کے مارے اس نے لپک کر اگلے ہی لمحے اس کاغذ کو اپنے ہاتھوں کی لرفت میں قید کر لیا تھا۔

دوسرے اور ایک انجانے خوف نے اس کے وجود پر لپٹی طاری کر دی تھی۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے اس تہ کیے ہوئے کاغذ کو کھولا جس پر اس کی لاڈلی آنکھوں کا ایسا طمانجہ بارا تھا کہ وہ جہاں کھڑی تھی وہیں جامد ہو گئی۔

کنیز نور..... اس کی جان سے پیاری بیٹی کنیز نور۔ جس پر اس نے بھی غصہ نہیں کیا تھا۔ ڈانٹا تو دور کی بات۔ نہ کبھی روک ٹوک کی، مکمل بھروسہ کیا۔ اسے نجم اور سعد پر فوقیت دی۔ اس کے لیے شیم عثمانی کو سو تیلے باپ کے طعنے دیئے۔ اپنی ہر خوشی جس کے لیے قربان کر دی۔

یاں وہی کنیز نور، اس کا سارا زور، پیسہ لے کر چلی گئی تھی۔ اپنا من پسند جیون سا بھی تلاش کر کے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور بہت دور چلی گئی تھی۔

”ابھی عمر کیا تھی اس کی جو اس نے ایسا قدم اٹھایا۔ کس چیز کی کی تھی اسے یہاں اگر وہ مجھے اپنی پسند سے آگاہ کرو جیتی تو کیا میں اس کی خواہش کا احترام نہ کرتی۔ خود باعزت طریقے سے اس کی شادی وہاں کرواتی۔ اس نے اپنی من مانی کیوں کی؟ کیا میں نے اس کی ہر ضد پوری کر کے اس کو اتنا خود سر بنا دیا تھا کہ اس نے ایسا قدم اٹھایا۔“

وہ سوچے جا رہی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہے جا رہا تھا۔ سچے آنسو جو آج بالکل رکنے والے نہیں تھے۔

☆.....☆

ہر روز شام کی روشنی مدھم ہو کر رات کی تاریکی میں

بدل جاتی مگر اس کے دل پر لگا گھاؤ تو اس سے بھی سیاہ تھا جو اس کی اپنی اولاد سے دے کر گئی تھی۔

شیم خاموشاں کے سنانے سے بھی گہرا سناٹا اسے اب کبھی کبھی ستانے لگا تھا۔ ڈرانے لگا تھا۔ ڈسنے لگا تھا۔ کسی ناگن کی طرح۔

روح بکھر کر کرچیاں کرچیاں ہو گئی تھی اسے اپنے زندہ رہنے تک اب ان کرچوں کو سمیٹ کر رکھنا تھا مگر ایک بار اعتماد ٹوٹ جائے اور اتنی بری طرح سے ٹوٹ جائے تو پھر روح کی بکھری کرچیاں سمیٹیں نہیں جاسکتیں بس جو حاصل وجود ہی زندہ نظر آتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد کتنی عیدیں گزر گئیں اب کیسی عید اور کس کی عید؟ وہ سوچتی۔

”یہ میرے ہی کیے کی سزا ہے، ان پانچ معصوموں کے دل سے نکلی آہ ہے۔ نمرہ بٹ کے دل سے نکلی بد دعا ہے جس طرح میں نے اس کی بیٹیوں کو ان کے باپ سے دور کیا اسی طرح میری بیٹی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔“

”اے کاش میں ایسا نہ کرتی۔ کاش وہ دن پھر سے لوٹ آئیں وہی رمضان کی ستائیسویں شب پھر سے لوٹ آئے۔ میں نمرہ بٹ کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لوں۔“

”یا اللہ! ایسی کوتاہیاں کوئی نہ کرے جو مجھ سے ہوئی ہیں۔ نور چلی گئی اس سے اچھا ہوتا نہ مر جاتی۔ کم از کم اس کی قبر دیکھ کر دل کو تسلی ہو جاتی۔“

اب آنسو ہی لیسا سلوٹی کا مقدر تھے۔ اس نے شاہ زین کو کھو کر شیم عثمانی کو پایا تھا مگر اس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے ضدی، خود سر اور ناشکری ہو گئی تھی اور نمرہ بٹ اور اس کی پانچ بیٹیوں کا حق بھی چھینا تھا۔

جس کی سزا قدرت کی طرف سے اسے ملنی ہی تھی۔

☆.....☆

دل کی بات



”مجھے سخت نفرت ہے۔ اس محبت نام کے لفظ سے۔“ فارہ کی کسی بات پر وہ غصے سے جھنجھلا کر بولی۔
”تمہیں ہونی جو نہیں اگر ہوتی تو ایسے نہ کہتیں۔“
فارہ اس کی بات پر مذاقاً بولی تھی، یہ جانے بغیر کہ وہ سیر نہیں تھی۔

”اچھا تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو کہ مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی؟“ وہ سختی سے بولی تو فارہ اس کے لہجے پر ہنسی۔

”میں پچھلے پانچ سالوں سے جانتی ہوں تمہیں اگر ایسا کچھ ہوتا تو مجھے پتا ہوتا۔“

”کچھ باتیں اور راز ایسے بھی ہوتے ہیں جو قریب رہنے والا شخص بھی نہیں جان سکتا۔ مجھے بھی سو کا لہ محبت ہوئی تھی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ طنزاً ہنسی تھی۔
جب کہ فارہ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا۔

”میں شانزے کمال بھی محبت کی داسی ہوئی تھی مگر محبت نے مجھے روگ دیا۔ بہت بڑا روگ ایسا روگ جو میرے پورے وجود کو لہو لہان کر گیا مجھے اس محبت نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔“ کاغج جیسی آنکھوں سے چند موٹی ٹپکے تھے۔ فارہ اب بھی حیرت کدے سے باہر نہ نکلی تھی۔

☆.....☆

شانزے کمال، کمال انڈسٹری کے اوپر کمال خاندانہ کی بیٹی تھی۔ حسن و جمال میں، تعلیمی میدان میں شانزے کمال پرفیکٹ تھی۔ پوری یونیورسٹی میں اس جیسا حسن کسی کے پاس نہ تھا۔ لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں بھی اس سے بات کرنے کے لیے مرنے لگی تھیں اور پھر ایک دن اس کی مگر روحان ملک سے ہوئی تھی۔ اونچا لمبا روحان پہلی نظر میں ہی شانزے کمال کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ وہ اسی دن اسے دل دے بیٹھی تھی۔ کسی کو لفت نہ کرانے والی، روحان ملک پر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھی تھی۔ روحان ملک بھی اسے پسند کرنے لگا تھا۔ محبت یکطرفہ نہ تھی۔ آگ دونوں

جانب برابر لگی ہوئی تھی۔
”میں اپنی اوقات سے کہیں بڑھ کر خواب دیکھ رہا ہوں شانزے۔“ وہ اداس سا بولا تو اس کی گھرے آنکھوں کی چمک ماند پڑی تھی۔
”کیا مطلب روحان؟“

”میں تمہارے اسٹینس کا نہیں ہوں شانزے۔“ وہ بولا تو شانزے سہمی تھی۔

”روحان اب بھلا محبت کب سے اسٹینس دیکھنے لگی۔“

”محبت نہ دیکھے پر دنیا تو دیکھتی ہے ناں۔“
”مجھے دنیا کی پرواہ نہیں۔“ وہ یکدم سخت سے لہجے میں بولی۔

”پر مجھے ہے شانزے مجھے اس معاشرے میں رہنا ہے۔“

”تو یعنی تمہیں مجھ سے زیادہ اس معاشرے کی پرواہ ہے۔“

”میں تم سے محبت کرتا ہوں شانزے! بے پناہ محبت مگر میں دنیا سے معاشرے سے کٹ کر نہیں رہ سکتا۔ میں محبت کو داغ دار نہیں کر سکتا۔ شانزے میرے بوڑھے ماں باپ اس عمر میں اس بدنامی کے قائل نہیں ہو سکیں گے۔“ وہ بولتا جا رہا تھا اور شانزے پتھر ہوئی جا رہی تھی۔

”بس روحان بس۔ اب ایک لفظ اور کوئی دلیل نہیں۔“ وہ یکدم غصے سے چلائی تھی۔

”میں نے اپنی زندگی میں تمہارے جیسے بزدل شخص سے محبت کر کے بہت بڑی غلطی کی تم محبت کے لائق ہی نہیں تھے۔ آج سے میرا اور تمہارا سب کچھ ختم۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ بھاگتی ہوئی اس سے دور سے دور تر ہوتی چلی گئی تھی۔ محبت کا اختتام یہیں ہوا جاتا تھا۔

☆.....☆

شام بھراں کا منظر قید کیا

میری آنکھوں میں
اب خوش رنگوں کا کیوں
پوچھتے ہو

”یہ بھی میری محبت کٹھا، اب بتاؤ کیسے اس محبت
سے نفرت نہ کروں جس سے میں نے بے پناہ پیار کیا۔
وہی مجھے بچ رہے پر چھوڑ کر چلا گیا۔“ ماضی کا درگھونٹے
ہوئے درد کی پر جھائیاں اس کے چہرے پر اڑ آئی
تھیں۔ فار یہ بھی اس کے درد پر بے پناہ دھبی ہوئی تھی۔
”شانزے! محبت تو ہم سب کرتے ہیں مگر محبت
کرنے والوں کے احساسات نہیں سمجھتے جہاں کوئی
مشکل آئی محبت کو الزام دے کر بری ہو گئے۔ شانزے
جی محبتیں ایسی تو نہیں ہوتیں۔ محبت تو ایک بہت انمول
جذبہ ہوتی ہے جو ہمیں کہیں دھوکہ نہیں دیتی ہاں ہم اسے
دھوکہ دیتے ہیں۔“ فار یہ بولی تو وہ اسے دیکھنے لگی۔
”روحان کی مجبوری کو سمجھا تم نے نہیں ناں پھر تم کیسے
اسے الزام دے سکتی ہو یہ جانتے ہوئے بھی جو اس نے کہا
وہ سب ٹھیک تھا۔ کیا تمہارے بابا تمہارا رشتہ خوشی روحان
سے کر دیتے نہیں ناں وہ کبھی بھی گلوں کی رانی کو جھوٹے
میں نہیں بیچتے۔ پھر بتاؤ روحان نے کیا غلط کیا؟“ فار یہ
نے اسے لا جواب کر دیا تھا۔ اس کی کالج کی نیلی آنکھیں
درد کے پیکر اس مسند پر کی مانند بہنے لگی تھیں۔

☆.....☆

دل کے کھلے گلاب محبت کی
سرزمین میں
عشق کرے کمال محبت کی
سرزمین میں
جاہت کا پانی دے کر
خوشیوں کی لگائی باڑ
محبت کی سرزمین میں

آج محبت کی تحمیل ہوئی تھی۔ محبت کے دو پاسی
ایک ہوئے تھے۔ آج شانزے کمال شانزے روحان
بنی تھی۔ اور وہ بے پناہ خوش تھی۔ فار یہ کی باتوں نے اس

کے دماغ کی زنگ آلود سوچوں کو ایک نئی تازگی بخشی
تھی۔ وہ سب سے پہلے اپنے بابا کے پاس گئی۔ ان سے
ان کی رضامندی حاصل کی پھر روحان کو ڈھونڈا اور
جب وہ ملا تو وہ حیران رہ گئی چھ سال میں کیا کچھ بدل گیا
تھا۔ وہ روحان تو رہا نہیں تھا۔ یہ روحان ملک انڈسٹری کا
اور تھا وہ خوشی کے مارے کنگ رہ گئی تھی۔ محبت کو جب
سب کی باہم رضامندی سے حاصل کیا جائے تو وہ
ہمارے حق میں ہمیشہ خوشیاں ہی کہنتی ہے۔

☆.....☆

روحان کا ساتھ پا کر وہ بے پناہ خوش تھی۔ من
چاہی خوشیاں جب میسر ہوں تو خوشیوں کا مزہ دو بالا
ہو جاتا ہے۔

”روحان! اب اٹھ بھی فلائٹ کا ٹائم نکل جائے
گا۔“ وہ اسے چومی بار جگانے لگی تھی کیونکہ آج انہیں
پیرس نئی مون پر جانا تھا۔

”روحان! اٹھتے ہو یا گراؤں پانی؟“ اس نے کبل
اتار کر کہینا چا اور اسے زوردار دھمکی دی۔ وہ فوراً ہڑ بڑا کر
اٹھ بیٹھا تھا۔

”اٹھ گیا اٹھ گیا شانزے روحان صاب۔“ وہ دکش
مسکراہٹ سے مسکرایا تھا۔ وہ پلٹی لیکن روحان نے اس کا
بازو پکڑ کر اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

”اب اٹھا دیا تو تیار بھی کر دو۔“ وہ اسے بازوؤں
کے حصار میں جکڑے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کی شرارت پر
مسکرائی تھی۔

”اچھا کرتی ہوں وہ دیکھو آئی۔“ یہ کہہ کر وہ اس
کے حصار سے نکل کر بھاگی تھی۔ روحان اس کی چالاک
پر ہاتھ پر ماکار کر رہ گیا۔

”آج تو بچ گئی آئندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ وہ دھمکی
دیتے بولا تھا اور وہ اس کی بے تاباں پڑہنتی ہی چلی گئی تھی۔

خوشگوار محبت کا اختتام پذیر ہوا تھا۔ خوشیوں،
بہاروں کی رنگینیوں کے ساتھ!!

☆.....☆

دل کی عید تہنیں اور شہوانی سنگ

آسمان پر گئے سیاہ بادل منڈلا رہے تھے۔ پر کیف و شغلی ہو ساری فضا میں رچی بسی تھی۔ موسم سرما کی آمد تھی۔ گئے سیاہ بادلوں نے دن میں شام کا سماں باندھ دیا تھا۔ سنہری دھوپ بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گئی تھی۔ گھر کی صفائی میں مصروف سارہ نے گھن میں جھاڑو لگاتے ہوئے آسمان پر نگاہ ڈالی دل یکدم باہر سیلیوں کے سنگ گھونٹے کو چاہنے لگا۔ ”اماں! میں فرحانہ کے گھر جا رہی ہوں۔“ سارہ کو موقع مل گیا تھا۔



فرحانہ اس کی گہری دوست اور اماں کی کزن کی بیٹی تھی۔ اماں اور خالہ صغراں میں بھی خوب جھگڑا تھا۔ غالباً انہی کی بات ان کی بیٹی میں بھی منتقل ہو گئی تھی۔ سارہ نے جھاڑو چھوڑ کر دوپٹہ سر پر اچھی طرح بٹایا اور زوردار ہانک لگاتے ہوئے اماں کا جواب سننے بھاگ کر باہر نکل آئی۔ وہ فی الحال اماں کا کوئی لپکھڑ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔ اماں اسے فراب موسم کا ڈراوا دے کر روکنے کی کوشش کرتیں اور دل کسی طور رکھنے پر آمادہ نہ تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں پر جھللا تا عکس اسے رکھنے نہ دے رہا تھا۔

سر سبز لہلہاتے کھیت اور ہرے باغ آنکھوں کو تڑاوت بخش رہے تھے۔ وہ گاؤں کی چھوٹی گلیاں عبور کر کے وسیع کھیت میں داخل ہو گئی۔ اس کے قدم تیزی سے کھیت کے آخری سرے پر موجود کچے گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ نئے بادل برسنے لگے تھے۔

مکمل ناول



”سارہ.....“ من مو بنے چہرے پر بھی دھیمی مسکان گہری ہو گئی تھی۔ اس کے تیزی سے اٹھتے قدم رک گئے۔ منزل سامنے آ گئی تھی۔ وہ آواز پر ہلٹی حیدر چھوٹی سی پگھلندی پر تیز تیز بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔

”تم کہاں جا رہی ہو؟“ اگلے لمحے دونوں ہم قدم تھے۔ ہلکی بوند باندی بے حد سبکی لگ رہی تھی بلکہ سارہ کو تو سارے موسم حیدر رنگ بھلے ہی لگتے تھے۔ حیدر نے مسکرائی نگاہ اس پر ڈالی۔

”میں فرحانہ سے ملنے جا رہی ہوں۔“ سارہ کا اتحادل تیزی سے دھک دھک کرنے لگا۔ اس نے سنجیدگی سے دھیمہ جواب دیا۔

”کیا صرف فرحانہ ہے؟“ حیدر نے برا سامنہ بنایا۔ وہ کچھ اور سننے کا متنی تھا۔ وہ کھیت میں فصلوں کو پانی دے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کام ختم کر کے جلدی سے اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”ہوں۔“ سارہ کو اس پر ٹوٹ کر پھار یا مگر اسے ستانے کا لطف ہی اُلگ تھا۔

”اماں اور فرحانہ تو رات سے ریحانہ آپا کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔“ گھر آ چکا تھا۔ حیدر نے دروازہ کھولتے ہوئے اندر داخل ہو کر اسے اطلاع دی۔

ریحانہ آپا کی طبیعت ہفتہ بھر سے خراب تھی۔ آپا کی شادی قرہی گاؤں میں ہوئی تھی۔ اماں روز بیابا بی بی سے ملنے کا ارادہ کرتیں اور روزانہ ہی گھر کا کوئی نہ کوئی کام نکل آتا اور وہ رک جاتیں وہ کل شام کو آپا کی طرف چلی گئی تھیں ارادہ دوروز دیں رہتا چاہتی تھیں۔ فرحانہ بھی ان کے ہمراہ تھی۔ گھر میں بابا اور حیدر اکیلے تھے۔ بابا کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے۔

”چلو تم تو ہونا گھر میں۔“ سارہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ بکھری تھی۔ انھوں میں دل کا بھید کھوٹی شر پر چمک تھی جو مد مقابل کو بولنے پر اکساتی تھی۔

”سارہ کی بچی۔“ حیدر اس کی شرارت سمجھ کر اس کے پیچھے لپکا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر تیزی سے کمرے میں چلی گئی۔ آسمان پر چمائے بادل مزید گہرے ہو گئے تھے۔ حیدر کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سر جھٹکتا منہ ہاتھ دھوئے کے لیے کچن کے کونے میں گھٹن لکی طرف بڑھ گیا۔

☆.....☆

کھڑکی کے پار تو اتر سے بارش جاری تھی۔ صبح سے برقی بوند باندی نے تیز بارش کا روپ دھار لیا تھا۔ لان میں گئے پودے دھل کر نکھر گئے تھے۔ اس نے جھٹکے سے کھڑکی کی کھول دی۔ تیز بوجھاڑنے اسے ایک لمحے میں بھگو دیا۔ سرما کی آمد تھی۔ بارش میں رچی ٹھنڈ اور نمی نے اسے بے ساختہ تیز جھرجھری لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کھڑکی بند کرنے کے بجائے وارڈ روپ سے شال نکال لائی۔ اس نے شال اپنے کندھوں کے گرد اوڑھتے ہوئے کھڑکی میں بازو لگا کر سر باہر نکالا۔

بارش اسے تیزی سے بھگونے لگی۔ ہلکی خشکی نے اس پر ہلکی سی کپکپاہٹ طاری کر دی تھی مگر اسے بارش میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔

”ایمان! کیا کرتی ہو بیٹا تم بیمار پڑ جاؤ گی۔“ وہ لان میں دھلے پودے اور آسمان سے تیزی سے برقی بارش دیکھنے میں مجبوری کر داد دکرے میں داخل ہوئیں۔ وہ اسے بیٹھنا دیکھ کر تیزی سے آگے بڑھیں اور اسے سختی سے ڈانٹتے ہوئے کھڑکی بند کرنے لگیں۔

”دادو پلیز۔“ ایمان لاڈ سے بولی۔ اسے سہانا موسم بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اسے دادو کی مداخلت قدرے گراں گزرتی تھی۔

”کوئی پلیز ولیز نہیں۔ پھر ساری رات ہائے کرتی رہو گی۔“ وہ بے حد نازک مزاج واقع ہوئی تھی۔ اس سے

م کی ذرا سی بھی سختی برداشت نہ تھی۔ وہ بیمار پڑ جاتی تو اس کی تیمارداری اکیلی بوڑھی دادو کو کرنا پڑتی اور ان کی بوڑھی بڑبیوں میں اتحاد ختم نہ رہتا تھا کہ وہ اس کے سر ہانے پیٹھ کمرات بھر جا گئیں اور اس کی دیکھ بھال کرتیں۔ دادو نے کھڑکی بند کی اور اسے بیڈ پر بٹھا کر اس کی گیلی شال اتارنے لگیں۔

”لو بھلا کر لو بات۔“ تمہیں اپنی ذرا سی بھی فکر نہیں ہے۔ اب تم بچی نہیں رہی ہو ایمان۔“ صد شکر اس کے کپڑے نہ بہتے تھے۔ وہ تویہ لے آئیں اور اس کے بال تویہ سے خشک کرنے لگیں۔ وہ بالکل کسی بچے کی طرح اسے ٹریٹ کر رہی تھیں اور ایمان بھی بچہ بنی مصوویت سے آکھیں پیچناتی ان کے جسم و کرم پر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دادو کے کام میں ذرا سی بھی مداخلت شامت اقبال بلوانے کے مترادف ہے اور وہ فی الحال ان کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کے موڈ میں نہ تھی۔

اس کے بال خشک کرتے ہوئے دادو زیر لب بڑبڑاتے جا رہی تھی۔

”دادو میں بچی نہیں رہی ہوں۔“ دادو کی انمول محبت اس کی زندگی کا قیمتی سرمایہ تھی۔ اس نے والدین کی موجودگی میں بھی ان کی عدم توجہ سہی تھی۔ ایسے میں صرف دادو تھیں جو گھر میں اس کا مکمل خیال رکھتی تھیں۔ وہ اس کے لیے فکر مند دوری تھیں۔ ایمان نے محبت سے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

”اگر تم بچی نہیں رہی ہو تو تم بچوں جیسے کام کیوں کرتی ہو؟“ دادو کی تشویش کسی طور کم ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ انہوں نے خشکی سے اسے تھانوا تھا۔ ان کا محبت بھرا دل پوتی کی بیماری کا تصور کر کے ہی سہا جا رہا تھا۔

”دادو! چلیں میں آپ کو اپنے ہاتھ کی بنی کر مگر ما گم چائے پلائی ہوں۔“ دادو اس کے بال خشک کر کے تویہ لیرس میں پھیلا کر آئیں تو ایمان نے انہیں محبت سے کندھوں سے تھام لیا۔

”ٹھیک ہے۔“ ان دونوں کی محبت و دوستی میں ایک ان کہا سمجھتا شامل تھا۔ وہ دونوں نہ تو ایک دوسرے سے ناراض ہوتی تھیں اور نہ ہی کبھی لڑتیں تھیں۔ اس نے محبت سے دادو کے گرد بائیں مائل کیں تو وہ با آسانی مان گئیں۔ ایمان مسکراتی ہوئی چائے بنانے کے لیے کچن کی طرف بڑھ گئی۔ جب کہ دادو ہیں صوفے پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ دل میں تشکر تھیں کہ انہوں نے بروقت ایمان کو بارش میں بھٹکتا دیکھ لیا تھا۔

☆.....☆

”ریحانہ کی طبیعت کیسی ہے؟“ رحمت خالد دوروز بیٹی کے ہاں رہ کر آ گئی تھیں۔ سارہ نے اماں کو ریحانہ آپا کی تاسازی طبیعت کا بتا دیا تھا تو وہ ان سے ملنے چلی آئیں۔ رحمت خالد اور اماں میں مثالی محبت و دوستی تھی۔ رحمت خالد نے تو اشاروں کنایوں میں کئی بار اماں سے حیدر اور سارہ کے رشتے کی بات بھی کی تھی۔ اماں بیٹی کی پڑھائی کا بہانہ بنا کر خالد کو ٹال چکی تھیں۔ انہیں بھی حیدر پسند تھا مگر وہ بیٹی کی پڑھائی مکمل ہونے تک اس کی کہنیں بات طے کرنے کے حق میں نہ تھیں۔ البتہ اماں نے رحمت خالد اور سلیم چاچا کو ہاں کرتے ہوئے سارہ کی پڑھائی مکمل ہونے کے بعد رسم کرنے کا کہا تھا۔ ان کا فیصلہ ان دونوں نے بخوشی مان لیا تھا۔ گاؤں کا ہائی اسکول کالج بن چکا تھا۔ گاؤں میں لڑکیوں کو تعلیم دلوانے کا خاص رواج نہ تھا۔ فرحانہ اور سارہ کو تعلیم حاصل کا بے حد شوق تھا اور ان کے شوق میں کسی نے کوئی رکاوٹ نہ ڈالی تھی۔ وہ دونوں ایف اے کر رہی تھیں۔ گاؤں میں کوئی ڈگری کالج نہ تھا۔ اماں کا ارادہ بیٹی کو تعلیم کے لیے شہر بھیجنے کا تھا۔ انہوں نے دے لفظوں میں رحمت خالد کو رسم کرنے کا کہہ دیا تھا۔ ابابھی اکلوتی اولاد کے فرض سے جلد سبکدوش ہونا چاہتے تھے۔ فرحانہ ان کے لیے جلدی سے چائے بنالائی تھی۔ اماں نے خالد استفسار کیا۔

”اللہ کا لاکھ شکر ہے وہ اب بھلی چٹکی ہے۔“ ریحانہ کو چند روز سے بخار تھا اور اب اسے افادہ تھا۔

”تو کسے ڈھونڈ رہی ہے۔“ اماں اور خالد باتوں میں مگن تھیں۔ فرحانہ اسے اپنے ساتھ کمرے میں لے آئی

تھی۔ سارہ نے سٹلاش لگا ہیں چاروں طرف دوڑائیں تو فرحانہ نے متبسم سر پر لہجہ میں اسے چھیڑا تھا۔
 ”ریحانہ آپا کیسی ہیں۔ ان کے دونوں بیٹے تو بہت تنگ کرتے ہوں گے۔“ ریحانہ کے دو بیٹے تھے۔ ان کا دھیان ہر وقت شرارتوں میں لگا رہتا تھا۔ ریحانہ آپا اکلوتی بیوہ تھیں ان کی ساس کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہیں بیماری میں بچوں نے خاصا تنگ کر رکھا تھا۔ فرحانہ نے سارہ کو گھیرنا چاہا تو اس نے موضوع گفتگو بدل ڈالا۔
 ”ایسا دیا۔ وہ دونوں تو آپا کو ایک منٹ بھی آرام نہیں کرنے دیتے ہیں۔“ فرحانہ حسب عادت شروع ہو چکی تھی۔
 سارہ سر ہنسنی اس کی بات سننے لگی۔

”السلام علیکم خالہ!“ وہ باتوں میں جوتھی کہ محن میں ابھرتی آواز نے اس کی تمام حیات متوجہ کر لیں۔ اس نے کن آنکھوں سے محن میں بھانکا۔ وہ کچے محن میں پھیل کے نیچے بچھی چار پائی پر اماں کے قریب بیٹھ گیا تھا۔ سارہ کے لبوں پر دلکش مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔

☆.....☆

”دادو پلیز گر مارگر سمو سے بنا دیں۔“ ایمان کا بی ایس سی کے فائنل ایگزامز کا لاسٹ پیپر تھا۔ وہ ربیعہ کو اپنے ساتھ گھر لے آئی تھی۔ ربیعہ کا ان کے ہاں کافی آنا جانا تھا۔ وہ اکثر دن بھر ادھر رہتی تھی۔ دادو کو ربیعہ بھی بے حد عزیز تھی۔ وہ دونوں آتے ہی کھانا کھا کر سوئیں تو شام کو جاگیں۔ وہ فریش ہو کر لان میں آگئیں۔ دادو ان کے لیے چائے بنا کر لے آئیں۔ ربیعہ نے لوازمات کے بغیر چائے دیکھ کر بلا تکلف فرمائش کر ڈالی تھی۔

”سعیدہ بیٹا! تم سمو سے لے آؤ۔“ دادو اس کی پسند سے آگاہ تھیں۔ ربیعہ کو خالی چائے پسند نہ تھی۔ وہ ہمیشہ چائے کے ساتھ کچھ ناکچھ لیتی تھی۔ دادو نے اس کے لیے ایکٹیشنی سمو سے بنائے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ کے بنے سموں کی بے حد شوقین تھی۔ دادو نے با آواز بلند بچن میں مصروف ملازمہ کو پکارا تھا۔

”جی دادو جان!“ وہ گھر بھری دادو تھیں۔ ملازمہ کی مودب آواز ابھری اور وہ چند ثانیوں بعد گر مارگر سمو سے لیے حاضر ہو گئی۔

”یہ بی بی بی جی۔“ سعیدہ نے ان کے سامنے ٹیبل پر سمو سے لاکر رکھ دیے۔ ربیعہ سموں سے انصاف کرنے لگی۔
 ”تمہارے پچھڑے کیسے ہوئے ہیں بیٹا؟“ دادو نے اپنے مخصوص مشفق لہجہ میں محبت سے استفسار کیا۔ ایمان گھر میں ربیعہ کا رنگ ہر وقت الایاتی رہتی تھی۔ ان دونوں کا ارادہ کیمسٹری میں ماسٹر کرنے کا تھا۔ ربیعہ کا فیملی بیک گراؤنڈ مضبوط نہ تھا۔ وہ ماسٹرز کے بعد اپنے معاشی حالات سدھارنے کے لیے جاب کرنا چاہتی تھی۔

”دادو! آپ میرے اچھے مارکس کے لیے دعا کریں۔“ ربیعہ نے گول مول سا جواب دیا تھا۔ اس کے تمام پیچرز بہترین ہوئے تھے۔

”بیٹا! اللہ محنت رائیگاں نہیں کرتا ہے۔ تمہارے پیچرز اچھے ہوئے ہیں تو تمہارے مارکس بھی اچھے آئیں گے۔“ دادو نے لگاوت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔ ربیعہ کے فادر اسکول ٹیچر تھے۔ وہ جا رہن بھائی تھے۔ اس کے والد نے قلیل تنخواہ میں بچوں کی بہترین پرورش کی تھی۔ ربیعہ کا اکیلے ریکارڈ شاندار تھا۔ وہ پیکچر آرٹسٹ کی مہنتی تھی۔
 ”آف کورس دادو!“ ربیعہ بھی ایمان کی دیکھا دیکھی انہیں دادو کہتی تھی۔ اس نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا جب کہ ایمان شجیدگی بھری خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔

☆.....☆

غلام رسول کے کچے آگن میں خوشیوں کی بارات اتری تھی۔ گھر میں بے حد گہما گہما اور رونق تھی۔ پورا گاؤں اس کی

خوشیوں میں شریک تھا۔ رحمت خالہ کو اچانک ہارٹ ایک ہوا تھا۔ وہ رو بہ صحت ہو گئی تھیں مگر انہیں اپنی زندگی کا دھڑکا لگا رہتا تھا۔ وہ جلد از جلد اگلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجادیکھنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے اماں سے کہہ کر سارہ کے ایگزامز کا انتظار کیے بغیر شادی کی ڈیٹ لے لی تھی۔

اماں اور ابا نے بھی تھوڑی پس و پیش کے بعد ہاں کر دی تھی۔ غلام رسول سچا اور کھرا انسان تھا۔ گاؤں میں مختلف رادریوں کے لوگ رہتے تھے۔ وہ چوہدری کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔

”بارات آگئی، بارات آگئی۔“ غلام رسول کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ گاؤں کا ہر جوان سارہ کو بہن سمجھ کر اس کی شادی کی تیاریوں میں غلام رسول کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ رحمت خالہ نے اچانک شادی کی ڈیٹ مانگی تو حقیقتاً غلام رسول کے ہاتھ ہاں پھول گئے۔ وہ تنہائی کی شادی کی تیاری کیسے کر پاتا۔ قدرت نے اس کی مدد کی تھی۔ وہ بارات کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھا کہ شور بلند ہوا۔ وہ بارات کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ بارات کو سردانے حصے میں بٹھا دیا گیا۔ لڑکوں نے ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے کیا تھا۔ غلام رسول مطمئن تھا۔ نکاح کے بعد کھانا شروع کیا گیا تو اسے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیا گیا۔ تمام جوان بھاگ بھاگ کر مہمانوں کی تواضع کر رہے تھے۔ ہر انتظام عمدہ تھا۔

بالآخر بیٹی کے وداع کا وقت آ گیا۔ سارہ دہن بنی بے حد بیماری لگ رہی تھی۔ وہ والدین کی دھیروں دعاؤں کے لیے باہل کے آگن سے وداع ہو گئی۔ مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے تھے۔ خوشیوں بھرا اور پر رونق آگن سونا ہو گیا تھا۔ خالدہ شوہر کے قریب آگئیں۔ وہ بے حد اداس تھا۔ اسے بیٹی عزیز بھی تو بہت تھی۔ غلام رسول نے خالی اداس آنکھوں سے بیوی کو دیکھا تھا۔

”وہ چلی گئی خالہ۔“ غلام رسول کے لب دھیرے سے پھڑ پھڑائے تھے۔ دل اداس ہونے کے ساتھ مطمئن بھی تھا کہ زیادہ دور نہ گئی تھی۔

”تو نرا اجملا ہے غلام رسول! اسے تو ایک دن جانا ہی تھا۔“ خالدہ باپ بیٹی کی انمول محبت سے آگاہ تھی۔ غلام رسول کی تو اس میں جان تھی۔ خالدہ نے شوہر کو تسلی دی۔ وہ بھی بیٹی کے جانے سے اداس تھیں۔ گھر کا سونا پن اسے بھی ڈس رہا تھا۔ دن کی روشنی شام کے تلکے اندھیرے میں ڈھلنے لگی تھی۔ ان کے چروں پر پرسکون اداسی اور اطمینان پھیلا تھا۔ آخر قدرت نے انہیں ان کی زندگی کے اہم فریضہ سے بخوبی سکدوش کر دیا تھا۔

☆.....☆

”ایمان! جلدی کرو بیٹا، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔“ ان کا رزلٹ آچکا تھا۔ وہ دونوں شاندار مارکس سے کامیاب ہو گئی تھیں۔ انہوں نے کیمسٹری ماسٹرز میں ایڈمیشن لیا تھا۔ اس روز ایمان کا یونیورسٹی کا پہلا دن تھا۔ دادو ان دونوں کے ساتھ ایڈمیشن کروانے جا رہی تھیں۔ دادو پوتی کے معاملے میں بے حد حساس تھیں۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی شہر کے معروف سماجی سوشل ورکر تھے۔ ان دونوں کی برنس معاشی و سماجی مصروفیات تھیں۔ انہیں بیٹی کے لیے فرصت نہ تھی۔ دادو نے بہو اور بیٹے کی مصروفیات کے باعث پوتی کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی ذمہ داری اٹھائی تھی تاکہ وہ نظر انداز نہ ہو۔ وہ ایمان کے معاملے میں محتاط تھیں۔ مخلوط تعلیم پر قطعاً کوئی اعتراض تھا۔ ان کا بوز حاد اور زمانہ شناس دل صرف اپنی تسلی چاہتا تھا سو وہ صبح سے اس کے لیے ہانکاں ہو رہی تھیں۔

”دادو وہ منٹ پلیز۔“ ایمان کمرے میں مسمی تیار ہو رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں برش کرتی اونچا بولی تھی۔

”بیٹا! تم یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹ بننے جا رہی ہو اب بچپنا چھوڑ دو۔“ وہ دس منٹ بعد تیار ہو کر ڈائمنگ ٹیبل پر آئی تو

داود نبیل پر ناشر رکھے اسی کی منتظر تھیں۔ نیلما اور خاور اپنے کمرے میں مجبوراً آرام تھے۔

”داود! ابھی تو ایڈیشن اوپن ہوئے ہیں۔ جب ٹیکسٹ ہوں گی تو میں ریگولر ہو جاؤں گی۔“ ایمان کی انگریز فریڈا کے بعد روٹن لائف خامی چھپ رہی تھی۔ وہ دن چڑھ چکے سوئی اور پھر زیادہ ترٹی دی دیکھتی رہتی تھی۔

”داود! جلدی کریں۔ ابھی ریویو کو بھی پک کرنا ہے۔“ ایمان نے فریڈا میں ڈرائیونگ سیکھی تو خاور عیسیٰ نے بی بی کو اس کا پسندیدہ ماڈل خرید کر دے دیا۔ ایمان داود کے ساتھ گاہے بگاہے آؤٹنگ یا لنگ ڈرائیو پر چلی جاتی تھی۔ ریویو کا کالج دین پر جاتی تھی۔ اسے یونیورسٹی جانے کے لیے پبلک ٹرانسپورٹ پر خوار ہونا پڑتا۔ ایمان نے اسے فون کر کے ایڈیشن اوپن ہونے کا بتایا اور یونیورسٹی جانے کے لیے ٹائمنگ فکس کرتے ہوئے اسے پک کرنے کی پیشکش کر ڈالی۔ اس نے صاف انکار کرنا چاہا تو وہ خفا ہو گئی ناچار ریویو کو اس کی خاطر ماننا پڑا تھا۔ ناشر کرتی ایمان عیسیٰ نے وال کلاک ہم نگاہ ڈالی۔ اس نے بجلت ناشر تمام کر کے چائے دے کر گئی تھی۔ اسے ساڑھے دس بجے ریویو کو پک کرنا تھا۔

”میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں نے نہیں تم نے درکردی ہے۔“ داود غصے سے بچکانہ انداز میں منہ پھلایا۔

”ہری اپ داؤد!“ ایمان عیسیٰ نے اپنی مخصوص شوخی بھری شرارت سے ان کے پہلو میں ہولے سے کہنی چسوائی۔

”چل بیٹ شری کہیں کی۔“ گریسل فل واد قارزینت عباسی اپنی سفید چادر سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ریویو اس کی منتظر تھی۔ وہ اسے پک کر کے یونیورسٹی کی راہ پر ہولی۔

☆.....☆

”وہ دودھ پہرے سے تپتے کیے جاری تھی۔ خالہ رحمت اور فرحانہ قریبی شہر خریداری کے لیے گئی تھیں۔ اس کی شادی کو مہینے سے زائد ہو گیا تھا۔ بوراحمت نے انکوئی بہو کے خوب لاڈ و چاؤ کیے تھے۔ وہ اس سے بیٹھا پکوانی کی رسم کروانا چاہتی تھیں۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ نئی بولی دہن سے ”بیٹھا پکوانی“ کی رسم کروا کر گھر کے کام کاج شروع کروائے جاتے تھے۔ گھر میں چار باندے تھے اور ان کا کام ہی کتنا تھا۔ بوراحمت اور فرحانہ دونوں مل کر گھر کا مختصر کام جھٹ پٹ نمٹا لیتیں اور سارہ کو کسی کام کو ہاتھ نہ لگانا پڑتا بلکہ اس کے کرنے کے لیے کام ہی نہ پچتا اور اس کے کسی کام کو کرنے کی نوبت نہ آتی۔

بوراحمت خاندانی رواج پورا کرنے کے لیے بیٹھا پکوانی کی رسم کرنا چاہتی تھیں۔ ورنہ ان کا ارادہ فی الحال بہو سے کام کروانے کا نہ تھا۔ سارہ لب شیریں بنانے میں ماہر تھی۔ اس نے ساس کو لب شیریں کے اجزائی لٹ بنا کر تھمائی تو گاؤں میں کچھ اشیاء نہ تھیں سو انہیں شہر آنا پڑا۔ انہوں نے بیٹے کی شادی کے بعد بیانی بیٹی کو کوئی تحفہ بھی نہ دیا تھا۔ وہ اس کے لیے کپڑے اور جوئے بھی خریدنا چاہتی تھیں۔

”سارہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“ ابا اور حیدر کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ وہ دونوں دوپہر کا کھانا کھانے گھر آئے تو بابا نے بہو کی تنہائی کے خیال سے حیدر کو گھر کمرے کی تاکید کی اور کھانا کھا کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد سارہ کو اچانک مٹی شروع ہو گئی۔ حیدر نے تشویش بھری محبت سے استفسار کیا۔

”مجھے ناشر ہضم نہیں ہوا ہے۔“ خالہ رحمت نے صبح تڑکے ہی ساگ اور مٹی کی روٹی بنائی تھی۔ اس نے ناماسازی طبیعت کی وجہ بھاری ناشر جانا تھا۔ اس نے حیدر کی تشویش دور کرنا چاہی تھی۔

”اماں کب آئیں گی؟“ اس کی طبیعت سنبھل نہ رہی تھی۔ وہ چند بار کی تپ سے نڈھال لگ رہی تھی۔ حیدر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”وہ دودھ پہر کا کہہ گئی تھیں۔“ سارہ کو شوہر کی محبت بھری تشویش بے حد بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے چار پائی پر لیٹتے

۔ تا یا حیدر آگے بڑھ کر اس کے سر کے نیچے ٹکیہ درست کرنے لگا۔

”اماں آج آئیں تو میں تجھے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں۔“ حیدر نے تشویش سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے بچے سنبھالی تھی۔

”کیا ہوا ہے میری بہو کو۔“ اسی لمحے بوراحمت اور فرحانہ آگئیں۔ پوچھنے کی بات سن کر تیزی سے آگے آئیں۔

”نڈھال ہی زرد چہرہ لیے لیٹی تھی۔ جب کہ حیدر کے چہرے پر تشویش تھی۔ سارہ کے چہرے کی زردی نے انہیں بھی ڈالا۔ فرحانہ شاہجنگ کا سامان دوسرے کمرے میں رکھ کر وہیں چل آئی۔ وہ بھی بھائی کو کچھ کرکھ مند ہو گئی تھی۔

”اماں! اسے کھانے کے بعد اچانک تپ شروع ہو گئی تھی۔“ سارہ سے بولا بھی نہ جا رہا تھا۔ حیدر نے انہیں بتاتے

۔ اپنی جگہ دی۔

”تپ.....“ بوراحمت زیر لب بڑبڑاتے ہوئے اس کے قریب بیٹھ کر اس کی نبض نٹو لے لگیں۔ ان کی زمانہ شناس

دہی نکالیں بہو کی ناماسازی طبیعت کا بھید پا گئیں۔ ان کے لبوں پر مسکراہٹ بریک گئی۔

”تو اب بننے والا ہے حیدر۔“ بوانے بیٹے کو خوش خبری سنائی۔ فرحانہ اور حیدر خوشی سے کھل اٹھے تھے۔ بوانے محبت

۔ بکاماتھا چو سارہ نے شربا کر چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا۔

☆.....☆

”حیدر میں اپنے بچوں کو خوب پڑھا لکھا کر کسی قابل بنائوں گی۔“ بوراحمت نے اس سے بیٹھا پکوانی کی رسم تو لرائی تھی مگر اسے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں۔ انہوں نے بہو کو تعلیمی کچھالایا تھا۔ اسے کھانا تک بار پائی پر دیا جاتا تھا۔ سارہ فریڈا سے ادب گئی تھی۔ اس کا دل گھر میں نڈھال رہا تھا۔ حیدر اماں کو بتا کر اسے لیے گاؤں کھونٹے نکل پڑا۔ اماں نے دونوں کو لاکھ ہدایتوں کے بعد جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ دونوں گاؤں گھومنے کے بعد گاؤں کی ندی کنارے آن بیٹھے۔ سارہ نے جھٹ کنارے بیٹھ کر دونوں ٹانگیں پانی میں ڈال دیں۔ پانی کی ٹھنڈی لہریں جسم و جان کو بھلی لگ رہی تھیں۔ حیدر نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔ سارہ نے گردن کھما کر حیدر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ناقص حسرتوں کی کک جاگ اٹھی تھی۔

اسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ وہ اپنے ماموں کے پاس شہر جا کر انٹر کے بعد مزید پڑھنا چاہتی تھی مگر وہ انٹری نہ کر پائی تھی۔ وہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا کر اپنے ادھورے خوابوں کی تکمیل چاہتی تھی۔

”انشاء اللہ سارہ ہم اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔“ بوراحمت باقاعدگی سے بہو کا ڈاکٹر سے چیک اپ کروا رہی تھیں۔ سارہ کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش متوقع تھی۔ حیدر بھی میٹرک پاس تھا۔ وہ بھی پڑھنے کا شوقین تھا۔ مگر اسے میٹرک کے بعد ابا کا ہاتھ بٹانے کے لیے تعلیم چھوڑنا پڑی تھی۔

”حیدر تم مجھ سے وعدہ کرو اگر میں گاؤں چھوڑ کر شہر جانا پڑا تو تم میرا ساتھ دو گے۔“ سارہ نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کے سامنے اپنی پھیلی پھیلائی۔

”وعدہ۔“ سارہ کے سونے دلکش چہرے پر خوابوں کی سنہری چمک نے لمحہ بھر کو حیدر کو مبہوت کر دیا تھا۔ اس نے ایک جذب سے سارہ کی پھیلی پھیلی تمام لی۔

”تھک چو حیدر۔“ سارہ کی آنکھوں میں تشکر بھرے آنسو چمک اٹھے تھے۔ اس نے ممنونیت سے حیدر کی بند مٹھی پر اپنا دوسرا ہاتھ رکھ دیا۔

☆.....☆

نہیں اشکلی تھا۔ فرحانہ اس کی ہر وقت مدد کر رہی تھی اور اسے اپنی دوروز کی بے قراری کے قصے سنارہی تھی۔ جو اس نے متناہت زور سے سنی تھی کو کھلانے کے لیے کاٹے تھے۔ سارہ اس کی دیوانگی پر تھکن کے باوجود مسکرائے جاری تھی اور اس کے

ناہت زور سے چہرے پر مسرتا کا نور جھلک رہا تھا۔ بوارحت نے بہو کے آرام کے خیال سے جی کوٹا پڑا۔

”اماں! ابھی تو مجھے سارہ سے بہت باتیں کرنی ہیں۔“ فرحانہ نے لاڈ سے منہ سورا۔ اس نے بھائی کہنے کا تکلف نہ کیا تھا۔ وہ دھڑلے سے اس کا نام لیتی تھی اور اسے کسی نے نہ تو کا تھا۔ حتیٰ کہ سارہ کو بھی قطعاً گراں نہ گزرتا تھا۔

”فرحانہ اٹھ بیٹا! وہ تھکی ہوئی ہے۔ اس کے آرام کے دن ہیں۔“ بوارحت نے غصے سے جی کوٹ کر کہا تھا۔

”اماں میں ٹھیک ہوں۔“ فرحانہ ماں کی ڈانٹ ڈپٹ پر منہ پھللائے اٹھنے لگی تو سارہ سے سہانہ گیا۔ اس کا سونے کا

نی لال موڈ نہ تھا۔ حیدر آتے ہی دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا تھا۔ وہ اکیلی بور ہوئی رہتی۔ اس نے فرحانہ کا ہاتھ تھام

کر روک لیا۔

”تم اپنی باتوں میں کسی دوسرے کی کہاں سختی ہو بھلا۔“ ان دونوں کی پرانی عادت تھی۔ ناچار ہوا کو بار بار ماننا پڑی۔

☆.....☆

”الیاس عمر۔“ کلاسز کا پہلا روز تھا۔ ڈیپارٹمنٹ کے مین گیٹ کے ساتھ نوٹس بورڈ پر تمام کلاسز کی ٹائمنگ اور

نچر کے نام درج تھے۔ وہ دونوں شیڈول نوٹ کر رہی تھیں۔ پہلا پریڈ شروع ہونے میں ٹھوڑی دیر تھی۔ وہ شیڈول

نوٹ کر کے کلاس روم کی طرف بڑھ گئیں۔ حاضری کم تھی۔ سر علی احمد حاضری لگانے کے ساتھ تعارفی مراحل بھی طے

کر رہے تھے۔ وہ باری باری اسٹوڈنٹس کا نام لیتے اور حاضراستوڈنٹ سے تعارف کے ساتھ اس کے مثال بھی پوچھتے

تھے۔ انہوں نے نہایت دلچسپی سے نام اور رول نمبر پکارنے کے بعد کلاس پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ سبھی اسٹوڈنٹس کے

پروں پر اشتیاق تھا۔ سب کو ان کا نام پسند آیا تھا۔

”الیاس عمر۔“ ربیعہ نے پسندیدگی سے زیر لب دہراتے ہوئے بوازور پر نگاہ ڈالی تھی مگر اس کی نظروں کو ماپوس لوٹنا

پڑا تھا۔ الیاس عمر غیر حاضرتھا۔ ایمان لائق سے اپنی فائل پر جھکی تھی۔

”زائد اور لیس۔“ سر علی احمد چند ثانیوں بعد اگلے اسٹوڈنٹ سے تعارف کرنے لگے تھے۔ سر علی احمد ہیڈ آف

ایپارٹمنٹ تھے۔ ربیعہ سر جھک کر ایمان کی سمت متوجہ ہوئی جو اپنی فائل پر بے نیازی سے جھکی ٹائم ٹیکل دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆

”سارہ بیٹا! تم اپنی خوراک کے معاملے میں بہت لاپرواہ ہو گئی ہو۔“ سارہ ہیکے رہنے آئی تھی۔ خالدہ نواسی اور

نواسے کو نہلا کر دھوپ میں لیے بیٹھی تھیں۔ سارہ صبح سے ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کام نہاتے میں لگی تھی۔ اس نے

ماٹھے بھی نہ کیا تھا۔ دوپہر ہونے لگی تھی۔ خالدہ بچوں کو سلا کر سارہ کی تواضع کے لیے کھانا تیار کر رہی تھیں۔ وہ روزانہ اس

لے لیے خصوصی کھانا تیار کرتیں اور سارہ برائے نام کھا کر اٹھ جاتی تھی۔ انہیں اس کی صحت کے لیے تشویش ہوئی تو

انہوں نے جی کو بخت بھری ڈانٹ پلائی تھی۔

”اماں مجھے ان شریروں کے ساتھ فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔“ سارہ نے محبت سے سوئے ہوئے بچوں پر نظر ڈالی۔

اس کے چہرے پر مسرتا کا نور برسر رہا تھا۔

”بیٹا! اماں اپنی صحت کا خیال رکھے گی تو بچے کی صحت بہتر ہوگی نا۔“ خالدہ تو رومہ بنانے کے لیے بسن پیاز من میں

لے آئی تھیں۔

”اماں آپ آج تو رومہ بنا رہی ہیں نا میں ڈنٹ کے کھانا کھاؤں گی۔“ اس نے محبت والا ڈس سے بچکانہ انداز میں ماں

”اٹھ پتر سارہ تیرے انتظار میں ابھی تک بھوکی ہے۔ تو پہلے کھانا کھالے۔“ وہ ابا کے ساتھ اگلی فصل کی بوائی کے

لیے بیچ اور کھاؤ خریدنے کے دوروز سے شہر گیا ہوا تھا اور صبح ہی گھر لوٹا تھا۔ وہ ناشتے کے بعد سو یا تو دوپہر کو جاگتا تھا۔ وہ فریٹ

ہو کر اماں کے پاس آ بیٹھا۔ ابا حسب عادت اپنے دوستوں سے ملنے گئے ہوئے تھے۔ اماں نے ساری زندگی محنت کی تھی۔

ان کی محنت کا بی ثمر تھا کہ ان کا گھر اندھا گاوں کے چند خاندان گھرانوں میں شمار ہوتا تھا۔ گھر میں دو بیٹیں تھیں اور اماں

نے کئی مرغیاں پال رکھی تھیں۔

گھر میں دودھ دینی کی کثرت تھی۔ گھر میں برکت و سکون تھا۔ اماں نے خوش اسلوبی سے گھر کا نظام سنبھال رکھا تھا۔

وہ ماں کو شہر کی باتیں بتا رہا تھا۔ اماں اور فرحانہ اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہی تھیں کہ دفعتاً اماں کو بہو کا خیال آیا۔ وہ

بھوکی تھی۔ اس نے حیدر کے بغیر کھانا کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ ہولے سے سر ہلاتا اٹھ گیا۔

”بہت مزے کا آلو قیہ ہے۔ کس نے بتایا ہے؟“ حیدر شادی کے بعد پہلی بار سارہ سے اتنے دن دور رہا تھا۔ سارہ

نے دو دن بے کھلی میں گزارے تھے۔ اس نے بے حد چاؤ سے حیدر کا پسندیدہ آلو قیہ پکایا تھا۔ حیدر نے لقمہ منہ میں

ڈالتے ہی بے ساختہ تعریف کی۔ سارہ کو لگا جیسے اس کی محنت وصول ہو گئی ہو۔

”میں نے۔“ سارہ نے خوشدلی سے سر ہلاتے ہوئے اسے بتایا۔

”سارہ تمہارے ہاتھ میں بہت ڈانٹ ہے۔“ حیدر نے کھلے دل سے اسے سراہا تھا۔

☆.....☆

”دادو ناشتہ!“ ایڈیشن کے چند روز بعد ہی ان کی کلاسز باقاعدگی سے شروع ہو گئیں تھیں۔ فراغت کے دن قہقہ

پارینہ بن گئے تھے۔ اس روز کلاسز کا پہلا دن تھا۔ ایمان صبح جلدی اٹھ کر تیار ہو گئی تھی۔ وہ تیار ہو کر کچن میں آئی تو دادو

نے ابھی ناشتہ تیار کرنا شروع ہی کیا تھا۔ اس نے ناشتہ تیار نہ پا کر آتے ہی شور مچا دیا تھا۔

”لو کی تم ذرا چھری تلے دم تولو۔“ وہ دونوں دادی پوتی ہی نہیں بلکہ ایک دو بچے کی ہمزاد دوست بھی تھیں۔ اس کی

جلدی نے ان کے ہاتھ پاؤں بھلا کر رکھ دیے تھے۔ انہوں نے جلدی سے گر باگرم پر اٹھا تو سے اتار کر آگسٹ پھیلا

اور آلیٹ بنائے لگیں۔

”دادو! آج میری پہلی کلاس ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔“ ابھی کلاس شروع ہونے میں ڈیڑھ گھنٹہ تھا۔ اسے ربیعہ کو

بھی پک کرنا تھا۔ چونکہ آج پہلا دن تھا وہ وقت پر پہنچنا چاہتی تھی۔ ربیعہ نے اس کے ساتھ مزید جانے سے انکار کر دیا

تھا۔ اس نے یونیورسٹی آنے جانے کے لیے پوائنٹ کا انتخاب کیا تھا۔

”میں نے تمہیں کب جلدی جانے سے منع کیا ہے بس ذرا صبر کرلو۔“ دادو نے نرمی بھری خفگی سے اسے ڈانٹ پلائی

تھی۔

”لو کھاؤ۔“ دادو اس کے لیے پرائیڈ آلیٹ لائیں تو وہ سنجیدہ صورت لیے بیٹھی تھی۔ دادو کو اس کی خفگی کا خیال آنے لگا

تو انوں نے اسے خواہ مخواہ مخاطب کیا۔ وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگی۔

☆.....☆

بوارحت کے کچے آگن میں خوشیوں کی برسات اتری تھی۔ سارہ کے ہاں بیٹا، بیٹی نے جنم لیا تھا۔ ہر چہرہ خوشی سے

کھلا ہوا تھا۔ سارہ کو اسپتال لے جانا پڑا تھا۔ خالدہ اور غلام رسول بھی ہمراہ تھے۔ سارہ کو تیسرے دن دسپارچ کر دیا گیا

تھا۔ فرحانہ بچوں کو گود میں لیے بے حد سروسر تھی۔ اس کا بس نہ چٹا وہ دونوں فرشتوں کو کسی اور کو ہاتھ تک نہ لگانے دیتی۔

”فرحانہ! میری بہو کو آرام کرنے دو۔“ سارہ کو اس کے بچوں سمیت کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ ابھی سارہ سے الصفا

کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

”اگر نہ کھایا تو میں شام کو تہارے ساتھ ہی باندھ کے بھیج دوں گی۔“ حیدر نے اسے شام کو لینے آنا تھا۔ وہ مہینہ بھر رہنے کو آئی تھی مگر حیدر کا بچوں کے بغیر بالکل دل نہ لگ رہا تھا۔ وہ شام کو اسے لینے آنے والا تھا۔ خالدہ نے مخصوص مہما بھری دھمکی دی تھی۔ سارہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

☆.....☆

”الیاس عمر بے حد ڈشنگ پر سائلٹی کا مالک ہے۔ وہ دراز قد ہے اور اس کی آنکھیں تو.....“ ایمان دوروز کی چٹھی کے بعد یونیورسٹی آئی تھی۔ اسے ٹلو ہو گیا تھا۔ داوود کی اس میں جان تھی۔ داوود نے اسے نہ آنے دیا۔ وہ یونیورسٹی آئی تو ربیعہ کا الیاس نامہ جاری تھا۔

”ربیعہ پلینز۔“ وہ صبح سے الیاس نامہ سن کر عاجز آ چکی تھی۔ ربیعہ اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلمابے ملانے میں جو تھی کہ ایمان نے اکتا کر اسے ٹوکا۔

”وہ آج آیا نہیں ہے اگر تم دیکھو گی تو تمہیں بھی وہ پسند آئے گا۔“ ربیعہ ہر ڈشنگ و ڈینٹ بندے پر مڑتی تھی۔ اس کی پسندیدگی محبت یا عشق نامہ کی نہ تھی بلکہ وہ ایسی پسندیدگی کی ہوتی تھی جیسے ہم فی وی یالم کے کسی ایکٹر کو پسند کرنے ہوں۔ ربیعہ کا منہ لنگ گیا۔

”تو آ جاتا نا، میں بھی تمہارے الیاس عمر کو دیکھ لیتی۔“ وہ دونوں فری ٹائم میں ڈی پارٹنٹ کے وسیع لان میں بیٹھی تھیں۔ الیاس نے پہلے دو پیر پڑ نہیں لیے۔ اگا پیر پڑ سیریز کا تھا۔ ایمان نے ربیعہ کی مایوس صورت دیکھی تو اس کی ٹہنی چھوٹ گئی تھی۔ ربیعہ کا سادہ دل ٹوٹ گیا تھا۔

”لو وہ آ گیا۔“ ربیعہ کی نگاہ دم ڈی پارٹنٹ کے داخلی دروازے سے اندر آتے الیاس عمر پر پڑی تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ایسے جیسے اپنا گوبر نایاب نظر آ گیا تھا۔ ایمان نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا تو نگاہ پلٹنا بھول گئی۔ وہ ربیعہ کی تعریف سے کہیں بڑھ کر تھا۔ دراز قد، گوری رنگت، کمزری ناک، کشادہ پیشانی، براؤن چمکدار آنکھیں اور سلیقے سے جے بال وہ بلاشبہ لاکھوں میں ایک تھا۔ اس کا اٹھتا ہر قدم ایمان کے دل پر پڑ رہا تھا۔ ایمان کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہوئی جارہی تھیں۔ الیاس عمر داخلی راہداری سے ملحقہ برآمدے اور پھر کلاس روم میں جا چکا تھا۔ ایمان کی نگاہیں ہنوز اسی پر جمی تھیں۔ ربیعہ نے شوفی و شرارت سے زوردار ہنکارا بھرا۔ ایمان چونک کر قہقہے ہو گئی تھی۔ اس کے سینے چہرے پر خفالت بھری سرخی بکھری تھی۔ ربیعہ کی نگاہوں میں معنی خیزی اتر آئی۔ ایمان بے حد خوددار اور حساس لڑکی تھی۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرا لیں۔ ربیعہ کے ہونٹوں پر مبہم مسکراہٹ بکھری۔

☆.....☆

”حیدر! تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟“ سارہ بچوں کو سلا کر شوہر کے لیے کھانا لے آئی۔ حیدر بے حد کو آبرو بخش رہا تھا۔ وہ گھر آتا تو سارہ اکثر بچوں میں گمن ہوتی۔ وہ بچوں کی بہترین پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے شہر جانا چاہتی تھی۔

”کون سا وعدہ؟“ حیدر نے بے دھیانی سے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ سارہ سے کیا وعدہ مکر بھلا چکا تھا۔

”ہم بچوں کی بہترین پرورش کے لیے شہر جائیں گے۔“ سارہ کی حسین پلکوں میں سپنے جتنوں کی مانند جگمگ رہے تھے۔ سہرے خواہوں کی چمک سے چہرے پر الوہی حسن بکھرا تھا۔ حیدر لمحہ بھر کو مہو رہ گیا۔

”ہم ضرور جائیں گے سارہ! مگر ابھی بچے چھوٹے ہیں۔ تم ادھر تنہا ان کی پرورش نہ کر سکو گی۔“ حیدر وعدے سے نہ مکر رہا تھا۔ اسے صرف سارہ کی مشکل کا احساس ستا رہا تھا۔ حیدر کے لہجے میں تشویش تھی۔

”میں سب کر لوں گی۔ ہم بوا اور ابا کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔“ سارہ اپنے خوابوں سے کسی صورت دستبردار نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے اہل لہجے نے شوہر کو نئی راہ بھائی اگر وہ سب شہر چلے جاتے تو زندگی آسان ہو جاتی اور ان کے ذہن بھی ادھورے نہ رہتے۔ سارہ نے دے جوش سے مشورہ دیا۔

”میں صبح اماں اور ابا سے بات کروں گا۔“ حیدر نے محبت سے اسے اپنے بھرپور ساتھ کا یقین دلایا۔ ازدواجی زندگی میں فریقین ایک دو بچے کا بھرپور ساتھ بھائی تو زندگی میں آسودگی ٹھہر جاتی ہے۔ سارہ مطمئن سی سر بلاتی حیدر نے لیے جانے بنائے اٹھ گئی۔

☆.....☆

”ایکسیکلیو زی!“ وہ لائبریری کی نیر جیوں پر بیٹھی چند اہم نوٹس کے پوائنٹ اپنی فائل میں نوٹ کر رہی تھی۔ ربیعہ نے یونیورسٹی سے چٹھی کی تھی۔ ایمان نے چونک کر سر اٹھایا۔ بلیک پینٹ اور براؤن شرٹ میں لمبوں الیاس عمر سامنے تھا۔ ایمان کے دل نے اسے سامنے پا کر ایک بیٹ مس کی۔

”جی۔“ وہ ایمان پر نظریں نکاتے مخاطب تھا۔ ایمان دل کی منتشر دھڑکنوں کو سنبھالتی دھیمے سے گویا ہوئی۔

”مجھے سر زیدی کے لیکچر کے نوٹس چاہیے تھے۔ الیاس لیکچر مکمل نوٹ نہ کر پایا تھا۔ ایمان نے سر کے لیکچر کے اہم پوائنٹس نوٹ کر لیے تھے۔ الیاس نے بھلت لیکچر نوٹ کیا تھا اور کچھ پوائنٹس مٹ گئے تھے۔ اس سے اگلی رو میں بیٹھی ایمان مسلسل لیکچر نوٹ کرنے میں جو تھی۔

”شیور۔“ ایمان نے فائل کھول کر پیپر درست کرتے ہوئے اس کی طرف نوٹس بڑھائے تھے۔

”تھیک یو۔“ الیاس پیپر تمام کر اس کے برابر کھ گیا اور وہ اپنی فائل میں اہم پوائنٹس نوٹ کرنے لگا۔ ایمان کے قندوں سے کلون کی دلفریب مہک نکرائی، وہ دھوری اسے بے دھیانی میں ایک تک سکنے لگی۔ وہ کئی لڑکیوں کے دلوں کی دھڑکن تھا۔ اس کی محرکین شخصیت مد مقابل کو سمرائز کر دیتی تھی۔ دفعتاً الیاس نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ایمان نے قہقہے بھر کر نچا ہونٹ دانتوں سے دبایا۔ الیاس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھری وہ رخ موڑ نوٹس مکمل کرنے میں جو ہو گیا۔

ایمان چوری پکڑے جانے پر دل میں خائف ہونے لگی۔

”نیش۔“ وہ تیزی سے نیر حیاں اترنے لگی تو الیاس نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ وہ لڑکیوں کی نگاہوں میں اپنے لیے واضح سائنل دیکھنے کا عادی تھا۔ ایمان بے حد حسین و ذہین لڑکی تھی۔ اسے ایمان کی توجہ اچھی لگی تھی۔ نیر حیاں اترتی ایمان ٹھہر گئی۔

”آپ کے پیپر۔“ وہ نوٹس مکمل کر چکا تھا۔ اس نے ایمان کے پیپر زونٹائے وہ خاموشی سے تمام کر تیزی سے نیر حیاں اتر گئی۔ الیاس کے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

☆.....☆

”نہ پتر ہم سہیں ٹھیک ہیں تم دونوں جاؤ۔“ ابا نے سنا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ صحن میں بھی چار پائی پر ابا، اماں اور حیدر بیٹھے تھے۔ ابا تھوڑی دیر قبل کیتوں سے آئے تھے اور منہ ہاتھ دھو کر چار پائی پر آ بیٹھے تھے۔ اماں بھی ان کے قریب رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ حیدر نے موقع غنیمت جان کر بات چیمیزی۔

”تیرا ابا ٹھیک کہتا ہے حیدر! ہم شہر نہیں جائیں گے۔“ اماں بھی ابا کی ہمنوا تھیں۔

”ابا! آپ لوگ بھی ہمارے ساتھ چلتے تو بہتر تھا۔“ حیدر دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا مگر وہ اپنے والدین کو بھی نہ بہوڑنا چاہتا تھا۔

”تو چاہتا رہا، مجھے نہیں روکتے۔“ ابانے نرمی بھری آنکھوں سے اس کا کندھا دبا رہے تھے۔ اسے مخاطب کیا۔ ان کے لہجے میں ٹوٹے کاغذ کی سی جھین تھی۔ وہ ان کی اکلوتی نرینہ اولاد تھا۔ ان کا سبھی کچھ اس کا تھا۔ وہ بہتر زندگی گزار رہے تھے۔ حیدر کی دلیل انہی سچ گئی تھی۔ وہ اسے روکنا نہ چاہتے تھے۔ اماں کے چہرے پر اداسی بکھر گئی۔ ان کے جانے سے گھر میں تنہائی اتر آتی۔

”اماں!“ حیدر سے ماں کا پر لال چہرہ نندہ دیکھا گیا۔ اس نے محبت سے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈال لیں۔

”بیٹا میرے لال۔“ بہترین زندگی ہر انسان کا فطری حق ہے۔ وہ اسے روک کر اپنے بچوں کا مستقبل تاریک نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ گاؤں کی محدود زندگی میں ترقی کے چانسز کم تھے۔ انہوں نے محبت سے بیٹے کا ہاتھ چوم لیا۔ ان کے دل پر بھاری بوجھ اتر گیا تھا۔

☆.....☆

وہ طویل کوریڈور عبور کر کے تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ کلاس روم کے باہر آرن گرل پر بیٹھے کلاس فیلو سے جو گفتگو الیاس عمر کی نگاہ اس پر پڑی تو پلٹنا بھول گئی۔ وہ پوری کلاس سے منفرد تھی۔ اس ہر طرح اور حسین لڑکیوں سے دوستی تھی۔ وہ لڑکیوں کی نگاہوں میں اپنے لیے ستائش دیکھنے کا عادی تھا۔ وہ خود پسند نہ تھا مگر اسے کسی لڑکی سے محبت نہ ہوئی تھی۔ ایمان میں انجانی کشش تھی جو ہر ملاقات پر الیاس کو اپنی سمت پھینچتی تھی۔ وہ شہر کے معروف صنعت کار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے باپ کے لاکھ اصرار پر بھی بزنس کے بجائے تعلیم کو ترجیح دی تھی۔ وہ فی الحال بزنس کے مچھنٹ میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ عمر احمد اس سے سخت غدار ہے۔

”الیاس!.....“ ایمان کے تعاقب میں نگاہیں گھماتے الیاس کو زید نے ٹوکا۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا۔ زید کی کھوجی نظریں ہاسی پر جمی تھیں۔

”تمہارے قادر کا بزنس کیسا ہے؟“ الیاس نے لمحہ بھر میں خود کو کپڑا کیا۔ ایمان کلاس میں لیڈا یاد انداز رکھتی تھی۔ دل اس کی عزت کرتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایمان کا نام زبان زد عام ہو۔ اس نے زید کی کھوجی نظروں کا اثر زائل کرنا چاہا۔

”ان کی کارمنٹ فیکٹری ہے۔“ زید اسے اپنے بزنس کے متعلق بتانے لگا۔ الیاس اس کی توجہ پٹانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ وہ اپنی بدلی حالت پر خود بھی حیران تھا۔ اسے نہ جانے کب ایمان سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ کھوئے انداز میں بظاہر توجہ سے زید کی باتیں سننے لگا۔

☆.....☆

”ایک سکیم زمی۔“ ربیعہ کزن کی شادی ایشیڈ کرنے فیصل آباد گئی ہوئی تھی۔ اس کی دور روز بعد واپسی تھی۔ ایمان اس کی غیر حاضری میں تمام نوٹس مکمل کر رہی تھی۔ ربیعہ اس سے آتے ہی تمام نوٹس مانگتی اور مکمل ہونے کی صورت میں اس سے لڑتی۔ ایمان کا اس کی خفگی انورڈ کرنے کا قطعاً موڈ نہ تھا۔ وہ تندی سے نوٹس مکمل کر رہی تھی۔ اس روز موسم خاصا خوشگوار تھا۔ ایمان آف پر پڑ میں ڈی پارٹمنٹ سے باہر وسیع لان میں پھیلائے ہوئے تھی۔ اس نے سر اٹھایا سامنے الیاس عمر اسے پر شوق نگاہوں سے ٹک رہا تھا۔

”آپ کافی پڑھا کوکتی ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے کہتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ دل محبوب کی قربت کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ الیاس اسے تلاش کرتا ادھر آیا۔ وہ خاموشی سے نوٹس بنانے لگی۔ اس نے الیاس کا استہناسیہ انداز کمر نظر انداز کر دیا تھا۔

”ایمان! کیا میں آپ کے متعلق جان سکتی ہوں۔“ وہ لگی پٹی رکھے بغیر صاف گوئی سے مدعا بیان کرنے لگا۔ اسے

رداؤ انجسٹ جولائی 2017ء

ایمان کا لیا دیا انداز بے حد بھایا تھا۔ وہ اس کے سوشل سرکل کی دیگر لڑکیوں سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ اپنی فرینڈز یا سوشل سرکل کی کسی لڑکی سے بات کرتا تو وہ اس پر فدا ہو جاتی مگر مد مقابل ایمان عباسی تھی۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی کی اکلوتی اولاد۔

”سوری الیاس! مجھے ضروری نوٹس بنانے ہیں۔“ ایمان نے دل کے تھانے دباتے ہوئے معصومی رکھائی بھرا جواب دیا۔ وہ یونیورسٹی میں کسی قسم کا اسکینڈل انورڈ نہ کر سکتی تھی۔

”ایمان! میں آپ سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔“ الیاس نے صاف گوئی کی انتہا کرتے ہوئے محبت سے چمکتی نرم نگاہیں اس کے صبح کھڑے پر جمادیں۔

”الیاس پلیز۔“ دل اس کی پر شوق نگاہوں سے کھلا جا رہا تھا۔ ایمان نے لہجے میں معصومی درشتی سوتے ہوئے نگہ سے اسے ڈانٹا تھا۔ اسے کسی کلاس فیلو کے دیکھ لینے کا خوف تھا۔ اسے ربیعہ کی کی شدت سے محسوس ہوئی۔

”آئی لو یو ایمان!“ الیاس نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایمان نے جھپٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی نگاہوں میں واضح بے یقینی تھی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ الیاس اس سے محبت کرتا ہوگا۔ ایمان کو خود پر شک آیا۔

”الیاس! میں ایسی کوئی محبت انورڈ نہیں کر سکتی ہوں۔ پلیز آپ مجھے آئندہ ڈسٹرب مت کیجیے گا۔“ وہ خود پر نازاں و مسرور تھی۔ اس کی محبت یکطرفہ نہ تھی۔ الیاس بھی اس کے سنگ تھا اگر محبت کے سفر میں پسندیدہ ہمسفر بھی سنگ ہو تو زندگی کی راہ ہمک اٹھتی ہے مگر اسے اپنی دادوں کی لاج رکھنا تھی۔ ماما اور ڈیڈی اسے دادوں کے حوالے کر کے مطمئن تھے۔

”مگر کیوں ایمان! میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ وہ اس کے انکار پر تڑپ اٹھا۔ بھلا اس میں کیا کمی تھی کہ کوئی اسے ریجیکٹ کرتا۔

”الیاس میری کچھ مجبوری ہے۔“ ایمان کو گھومتی۔ وہ ایک اجنبی کو کیسے اپنی فیملی پر اہم بتا دیتی۔ اسے اپنے والدین سے شدید محبت تھی۔ وہ اس کی ہر ضرورت و آسائش کا مکمل خیال رکھتے تھے۔

”ایمان! میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیج دیتا ہوں۔“ وہ ایمان کے گریز کی وجہ کسی حد تک کھوج چکا تھا۔ وہ کسی اسکینڈل کے حق میں نہ تھی۔ الیاس نے سیدھا حاصل پیش کر دیا۔ ایمان کا منہ مارے تحیر کے کھلا رہ گیا۔ وہ اتنا فارورڈ ہو گا اسے توقع نہ تھی۔ وہ لمحہ بھر کو چپ ہو گئی۔

”ایمان! مجھے تمہاری عزت بے حد عزیز ہے۔ میں تم پر کوئی حرف نہ آنے دوں گا۔“ الیاس عمر محبت سے اس کا ہاتھ دبا کر چھوڑتے ہوئے اٹھ گیا۔ ایمان دھڑکتے دل سے اس کا نقش پابکتی رہ گئی۔ دل میں الیاس کی محبت مزید گہری ہو گئی تھی۔

”دادو! وہ اپنے گھر والوں کو ہمارے ہاں لانا چاہتا ہے۔“ ایمان اور دادو کی گہری دوستی کسی رازداری کا بار نہ جمیل کتی تھی۔ اس روز وہ دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو ایمان نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے محبت سے ایمان کی پیشانی چومی۔

”ایمان! وہ تجھے بھی پسند ہے نا؟“ دادو بتاتا اس کے دل کا بھید پائی تھیں۔

”دادو وہ بہت اچھا ہے۔“ ایمان نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

”ایمان بیٹا! اچھا ہونے اور اچھا دکھنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ دادو نے پرسوج انداز میں اسے سمجھایا۔

”تم اسے کیو وہ کل ڈنر پر ہمارے ہاں آجائے۔“ دادو نے فیصلہ سا ڈالا۔ وہ الیاس عمر سے ملنا چاہتی تھیں۔ ایمان

رداؤ انجسٹ جولائی 2017ء

کم عمر دنیا سمجھتی وہ الیاس سے مل کوا سے جا بچتا جانتی تھیں۔
 ”تھینک یو دادو! میں الیاس سے کہوں گی وہ کل آکر آپ سے مل لے۔“ ایمان کھکھلا کر ہنس دی۔ دادو نے محبت سے اس کی پیشانی چوم کر آنکھیں موندھ لیں۔ ایمان بھی سونے کی تیاری کرنے لگی۔

☆.....☆

”لو تم اس طرح روڈ کی تو میں پریشان رہوں گا۔“ ماحول بے حد بوجھل تھا۔ وہ شہر جانے کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔ اس نے اپنی نوکری اور رہائش کا بندوبست کر لیا تھا۔ یو اور دادو باتو بیٹے کی خوشی میں چپ ہو گئے تھے مگر سارہ کے والدین نے بے حد دوا دیا تھا۔ سارہ نے انہیں بے حد مشکل سے منایا تھا۔ ریمانہ آپارات سے اپنے بچوں سمیت آئی ہوئی تھی۔ سارہ کے والدین بھی کچھ دیر قبل بیٹی کو دواغ کرنے آئے تھے۔ اماں کا روڈ کر رہا تھا۔ انہیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اب بیٹی کو دواغ کر رہی ہیں۔ مٹی کے نو جوان تمام ضروری سامان ٹرک پر لا رہے تھے۔ یو اور اماں نے دل پر بھر رکھ کر بیٹے کی خوشی کے لیے اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ بو اور کھر کا سونا پن ہولار ہا تھا۔ وہ اور فرحانہ صبح سے کئی بار رو چکے تھے۔ حیدر دوستوں کے ساتھ سامان لوڈ کر رہا تھا۔

”وہ صبح کھر ہا ہے تم کیوں اسے پریشان کرتی ہو۔“ اماں نے حسب عادت بیٹے کی طرف داری کی۔ وہ ہمیشہ حیدر کو ہر معاملے میں سپورٹ کرتے تھے اگر وہ راضی نہ ہوتے تو حیدر بھی شہر نہ جا پاتا۔ اماں نے نہ صرف اسے جانے کی اجازت دی تھی بلکہ انہوں نے اماں کو بھی سمجھا بچھا کر منالیا تھا۔

”حیدر بھائی! سامان رکھا جا چکا ہے۔“ پڑوسی کا چھوٹا بیٹا چلا آیا۔ ماحول پر سمجھیرا تباہ ہو گئی۔ وقت رخصت تھا۔ حیدر ماں کے گلے مل گیا۔ بو نے اس کا ماتھا چوم کر اسے ڈھیروں دعا میں دے ڈالیں۔ وہ باپ اور سر کے ہمراہ کھر سے نکل گیا۔

”سارہ تم بچوں کا مکمل خیال رکھنا۔“ بو اسے بچوں کے متعلق نصیحتیں کرنے لگیں۔ وہ محبت سے سر ہلاتی سب سے مل کر ہر نکل گئی۔

☆.....☆

”واٹ..... تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟“ ربیعہ فرسٹ کزن کی شادی ایشینڈ کرنے دو ہفتے سے ادا کاڑھ گئی ہوئی تھی۔ اس دوران ایمان اور الیاس میں کافی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔ دادو الیاس سے ملتا جاتا تھا جس مگر وہ پہلے اپنے گھر میں ایمان کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتا تھا۔ سو اس نے چند روز کی مہلت لی تھی۔ ربیعہ واپس لوٹی تو بدلی بدلی ایمان نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے ایمان کو آڑے ہاتھوں گھیرا تو اس نے اعتراف محبت کر لیا۔ ایمان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ بکھری تھی۔ ربیعہ غامضی ایکسپریشن لگ رہی تھی۔ اس نے فوراً محبت بھرا شکوہ کیا۔ وہ دونوں ہمیشہ ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرتی تھیں۔

”تم یہاں تھیں کب؟“ ایمان نے نرمی سے اس کا شکوہ دور کرنا چاہا تھا۔ ربیعہ ہنس دی۔

”دادو کا کیا رد عمل تھا؟“ ربیعہ کو ساری صورتحال جاننے کی بے چینی لگی تھی۔ دفعتاً اسے دادو کا خیال آیا تو وہ پوچھنے بنا نہ رہ پائی تھی۔ اس کے لبوں پر شریر مسکراہٹ رقصاں تھی۔

”وہ الیاس سے ملنے پر راضی ہیں۔“ ایمان نے کھر سے خوش کن تصور میں کھر کو جواب دیا۔ دادو اس کا سب سے اہم ووٹ تھیں اگر وہ راضی ہو جائیں تو پھر پیا اور ماسکی انکار نہ کر پاتے۔

”چلو سر شاہ کا پریڈ اسٹارٹ ہونے والا ہے۔“ ایمان نے اپنی باتوں پر سر دھنتی ربیعہ کو یاد دلایا۔

☆.....☆

سارہ نے حیدر کے سامنے دو روز پہلے کی بچی دال لاکر رکھی۔ شہر آئے چھ ماہ سے زائد ہو چکے تھے وہ اس دوران دو بار گاؤں کا چکر لگا آئے تھے۔ بو اور فرحانہ خود کو سنبھال چکی تھیں اور وہ ان کے آنے پر اداس بھی نہ ہوتی تھیں۔ حیدر کو ابھی تک کوئی ڈھنگ کی جاب نہ ملی تھی۔ سارہ اس کا بھرپور ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے حیدر کو کبھی بے جا فرمائشیں کر کے تنگ نہ کیا تھا۔ وہ دو روز کا اکٹھا سالن پالیتی اور حیدر کو ڈینی ٹینشن سے محفوظ رکھتی۔ وہ جانتی تھی کہ حیدر پریشان رہتا ہے پھر وہ کیوں خواہ مخواہ ٹینشن کرتی۔ اس کے سامنے بیٹی نوالہ توڑتی سارہ کا ہاتھ لے کر بھر کر مگیا۔

”گھر میں یہی تھی حیدر۔“ سارہ کے لبوں سے دھیمی سی سرسراہٹ بھر مانہ انداز میں نکلی جیسے اسی کا قصور ہو وہ بچوں سمیت محدود آمدنی میں بمشکل مہینہ بھر گزارا کر پائی تھی۔ حیدر کے دوست نے انہیں رہائش کے لیے اپنا کوارٹرز فری دے رکھا تھا۔

”سارہ میرا یہ مطلب نہ تھا۔“ وہ دو روز سے دال کھا رہا تھا۔ آج اس کا موڈ دو روز کی باسی دال کھانے کا نہ تھا۔ سارہ کے چہرے پر تانسف کے سامنے بکھرے تھے۔ حیدر پریشان ہو گیا۔ اس نے نرمی سے بیوی کا ہاتھ تمام لیا۔ ”سارہ تمہیں یہاں تنگی کا سامنا ہے۔“ مجھے کوئی ڈھنگ کی نوکری ہی نہیں مل رہی ہے۔“ نازوں پٹی اکلوتی اولاد تھی۔ حیدر کو گھر سے ملال نہ گھیر لیا۔

”حیدر! تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ یہ میری اپنی چوائس ہے۔“ یہ زندگی سارہ کی اپنی خواہش تھی۔ بھلا حیدر جیسا میٹرک پاس نو جوان کیسے آسانی سے شہر میں سروائیو کر پاتا۔ اس نے دوستانہ مسکراہٹ چہرے پر جا کر شوہر کا ملال کم کرنا چاہا تھا۔ وہ دونوں اپنی مشکلات سے گھبرا جاتے تو ان کے بچوں کو روشن مستقبل کیسے ملتا۔

”سارا! تم میری اچھی جاب کی دعا کیا کرو۔“ حیدر کا دل سنبھل نہ پا رہا تھا۔ وہ دونوں ہی ایسی مشکل زندگی کے مادی نہ تھے۔

”انشاء اللہ! اللہ آسانی پیدا کرے گا۔“ سارا کوئی گلہ شکوہ کیے بغیر وفا شعار بیوی کی مانند شوہر کی دل جوئی کر رہی تھی۔

☆.....☆

”چپا! مجھے شادی کرنی ہے۔“ ڈنر پر ڈائننگ ٹیبل پر تینوں نفوس خاموشی سے ڈنر میں مگن تھے۔ الیاس نے ٹیبل پر گویا دھماکا کر ڈالا۔ عمر کا منڈیک جاتا ہاتھ جہاں کا تھاں ساکت رہ گیا۔

”واٹ.....“ الیاس فطرتاً بخیر فطرت تھا۔ اس کے حلقہ احباب میں بیشتر لڑکیاں تھیں۔ وہ آئے روز گرل فرینڈ چینیج کرتا رہتا تھا۔ انہیں بیٹے کے طرز زندگی پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ انہوں نے بیٹے کو ہر طرح کی مکمل جھوٹ دے رکھی تھی۔ عمر صاحب کو خاصا دھچکا لگا تھا۔ ان کی بے جا ڈھیل کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ اسے پسند کی شادی کی اجازت دے دیتے۔ وہ نہ جانے کس خاندان کی لڑکی اٹھالاتا۔

”تم کل سے اسٹڈی چھوڑ کر آفس آؤ۔“ وہ اگلے پل غصے پر جا پو جا کر رواجی دولت مند کا روپ دھار چکے تھے۔

”چپا پلیر!“ الیاس باپ کے تقطیع بھرے رویے سے آگاہ تھا۔ ان کے حتمی فیصلے کے سامنے تو فریج بھی نہ ٹھہر پاتی تھیں تو وہ کیا چیز تھا اس نے لاجت سے باپ کو نرم کرنا چاہا۔

”میں اسی دن سے ڈرتا تھا۔ میں نے اسے اس کی مرضی کی زندگی جینے دی۔ یہ میری غلطی تھی۔ اسے یونیورسٹی کی بجائے آفس میں ساتھ لے گیا ہوتا تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔“ فریج خاموشی سا مٹی بنی ڈنر میں لائقیت سے مٹو تھیں۔ وہ

باپ بیٹے کی آئے روز کی نوک جھوک کی عادی تھیں۔

”چپا! میں آفس آ کر آپ کی دولت بڑھانے کا موجب بننا اور اگر میں یہ کام ایسے ہی کر دوں تو.....“ الیاس باپ کی لالچی فطرت سے آگاہ تھا اس نے مہارت سے باپ کی دھمکی رگ پر ہاتھ رکھا۔ اس کی بھلے کی لڑکیوں سے دوستی بھی اور وہ فطر تاہر جاتی تھا مگر اس نے ایمان کو بچے دل اور خلوص سے چاہا تھا۔ وہ اس سے ہر صورت شادی کرنا چاہتا تھا۔

”وہ کیسے؟“ مگر صاحب حسب توقع چپک اٹھے۔ فریج بھی ڈر بھلائے اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ بھی بیٹے کی بات پر دل میں اس سے خفا تھیں انہوں نے اس کے لیے اپنے سوشل سرکل میں کئی لڑکیاں دیکھ رکھی تھیں۔ الیاس نے ان کی تمام امیدوں پر پانی پھیر کر انہیں کئی خدشات کا شکار کر دیا تھا۔ ان دونوں کی استغیاہیہ نگاہیں بیٹے پر لگی تھیں۔

”چپا! مجھے ایمان عباسی سے شادی کرنی ہے۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی کی اکلونی اولاد سے۔“ الیاس نے آہستگی سے کہتے ہوئے باری باری ان دونوں کے چہروں پر نگاہ ڈالی۔

”کیا.....!“ فریج عمر کی چپکار بکھری۔ ان دونوں سے سارا شہر واقف تھا۔ وہ ان کے ہم پلہ وہم جوڑتے۔ خاور عباسی کا بزنس بیرون ملک پھیلا ہوا تھا۔ وہ امارت میں ان سے کم نہ تھے۔ نیلما ایک مقامی این جی او کی صدر اور ملک کی معروف پالیٹکس پارٹی کی مقامی ووہمن ونگ کی چیئر پرسن تھیں۔ فریج نے اپنے سوشل رابٹھڑا جانے کے لیے ان سے تعلقات استوار کرنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ تاحال ناکام تھیں۔ نیلما کا حلقہ احباب محدود تھا اور وہ صرف انہی پر اعتماد کرتی تھیں۔

”واہ میرے بیٹے تو نے جی خوش کر دیا۔“ عمر کو بے ساختہ بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ خاور عباسی سے رشتے داری ان کے بزنس کو بلندی پر پہنچا دیتی۔

”چپا! مجھے کل ایمان کی دادو سے ملنے کی تیاری کرنی ہے۔“ وہ حصول مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ وہ اگلے روز ہی ایمان کی دادو سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے ابھی ایمان کو فون پر اطلاع دینا بھی وہ اٹھ گیا۔

”ایزیوٹس“ عمر کے لہجے میں شیرینی کھل گئی تھی۔ کچھ دیر قبل کی کئی ماحول سے چھٹ گئی تھی۔ عمر اپنے بزنس جب کہ فریج اپنے سوشل کانیکشن بڑھانے کے خوش کن خواب دیکھنے لگیں۔

☆.....☆

”ہوں تم ہو الیاس عمر۔“ وہ دو روز بعد زینت عباسی کے رو برو تھا۔ دادو نے ربیعہ اور ایمان کا سختی سے اندر داخلہ منع کر رکھا تھا۔ ربیعہ یونیورسٹی سے واپسی پر ایمان کے ساتھ ہی آگئی تھی اور اسے دادو اور ایمان دونوں نے گھر ڈراپ بھی کرنا تھا۔ دادو نے سڑا پا سے سخت جاچتی نگاہوں سے گھورنے کے بعد پرسوچ بنگار بھرنا تھا۔ الیاس ان کی سخت تنقیدی نگاہوں سے پزل ہوا جا رہا تھا۔ اس نے خاموشی چوکا کھاتے ہوئے عجب ہونٹیں پن سے زور سے سر جبات میں ہلایا۔

”تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟“ دادو باقاعدہ انٹرویو کا آغاز کر چکی تھیں۔ انہوں نے فوراً اگلا سوال داغا۔

دروازے کی اوٹ سے جھانکتی ایمان اور ربیعہ کبھی دادو اور کبھی الیاس کو گھور رہی تھیں۔

”وہ بزنس میں ہیں۔“ الیاس کی کھوٹی خود اعتمادی رفتہ رفتہ بحال ہونے لگی تھی۔

”تم اپنے متعلق کچھ بتاؤ۔“ دادو اسے کوئی رعایت دینے پر ہرگز تیار نہ تھیں۔ وہ اسے اچھی طرح جاننا چاہتی تھیں۔

”تمہارے نزدیک محبت کیا ہے الیاس۔“ وہ دادو کو مکمل قائل کرنے کے لیے تفصیلاً انہیں آگاہ کر رہا تھا کہ زینت عباسی نے اسے دفعتاً مخاطب کیا۔ الیاس کا غیر متوقع سوال پر منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ ان سے اس سوال کی قطعاً امید نہ رکھتا تھا۔

”دادو! محبت نازک اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ محبت انسان کے اندر کی سختی کو نرمی میں ڈھال کر اس کے وجود کو نرم مٹی سا بنادیتی ہے۔“ الیاس نے سنبھل کر ٹھہرے لہجے میں جواب دیا تھا۔ دراصل دادو کی جہانمہ نگاہیں اس کے اندر چھپے ہر جانی مرد کو پہچان گئی تھیں۔ ایمان حساس دل کی مالک خود ار لڑکی تھی وہ نہ چاہتی تھیں کہ ایمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچے انہوں نے تاک کر نشا نہ لگایا تھا۔

”الیاس! تمہارا فوجی پلان کیا ہے؟“ دادو کو اسے جتنا جاننا تھا وہ جان چکی تھی۔ وہ سوال برائے سوال پر اتر آئیں۔ ربیعہ اور ایمان کی دروازے سے چپکے چپکے ٹانگیں سوکھ گئی تھیں۔ گویا دادو کو ان دونوں کی حالت پر ترس آ گیا تھا۔

”دادو میں پکا بزنس سنبھالوں گا اور.....“ الیاس انہیں فوجی پلاننگ بتانے لگا۔ دادو کا دور رس ذہن گہری سوچ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی باتوں پر گاہے بگاہے سر ہلارہی تھیں۔

☆.....☆

”دادو! میں الیاس کے بغیر نہیں جی سکتی۔“ وہ ربیعہ کو ڈراپ کر کے گھر آ چکی تھیں۔ دادو خلاف معمول کچھ چپ تھیں۔ ان کی خاموشی نے ایمان کو الجھا دیا تھا۔ وہ ان کی طرف سے بھرپور تبصرہ کی امید کر رہی تھی اور دادو نے کچھ نہ کہنے کی جیسے تم کھار کھی تھی۔ ایمان نے دبے لفظوں الیاس کا ذکر چھیڑا مگر وہ بی ان سنی کر گئیں۔ وہ فی الحال اس موضوع پر کوئی بات کرنے کے موڈ میں نہ تھیں۔ وہ سونے کے لیے لیٹیں تو ایمان نے نرمی سے ان کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیے۔

”وہ ہر جانی مرد ہے ایمان۔“ دادو دکھ سے تڑپ اٹھیں انہیں الیاس کی یہی خامی بری طرح ڈس رہی تھی۔

”وہ مجھ سے محبت کرتا ہے دادو!“ ایمان نے تڑپ کر اس کی طرف اندری کی۔

”میں محبت نہیں بے وفا کی بات کر رہی ہوں ایمان۔“ دادو نے اس کے ہاتھ نرمی سے تھام کر اسے سمجھانا چاہا تھا۔

”وہ مجھ سے شادی کرے گا۔“ ایمان نے چند روز کی محبت کی خاطر ان کی برسوں پرانی محبت فراموش کر دی۔ وہ اس کی وکالت میں جرح پر اتر آئی۔

”ہر جانی مرد عورت سے کبھی وفا نہیں کرتا۔ وہ اس سے شادی کر بھی لے تو اسے زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر دھوکا ضرور دیتا ہے۔“ دادو نے اسے قائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایمان کی آنکھوں میں چھپی محبت و بناوت نے انہیں سمجھا دیا تھا۔ محبت ہی تو انسان کو باقی بنا کر خود سری پراکساتی ہے۔

”دادو پلیز! وہ ایسا نہیں ہے۔“ ایمان کی آنکھوں پر بندھی محبت کی پٹی نے اسے الیاس کے باطن میں چھپائے ہوئے دیا تھا۔ وہ الیاس کی لڑکیوں سے دوستی سے آگاہ تھی مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس نے محبت صرف ایمان سے کی تھی۔

”ایمان! مجھے تمہاری خوشیوں کو نظر لگ جانے کا خوف ہے۔“ دادو چاہ کر بھی اسے نہ سمجھا پارہی تھیں۔

”مجھے کسی سے کوئی گلہ نہیں ہوگا۔“ ایمان کا لہجہ بھر گیا۔ الیاس سے جدائی کا تصور ہی اتنا ہولناک تھا کہ وہ دھکی ہو گئی تھی۔ دادو ساکت رہ گئیں۔ ان کی ہر دلیل اور ہر منطق نے چپ سا دھ لی تھی۔ انہیں الیاس کی ظاہری شخصیت بے حد پسند آتی تھی مگر وہ پونی کی دائمی خوشیاں چاہتی تھیں۔ انہوں نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ آس و فراس میں گہری

ایمان کی نگاہیں ان ہی پر جمی تھیں۔

”اللہ تمہیں بھی کسی آزمائش میں نہ ڈالے بیٹا۔“ ایمان نے محبت پانے کے لیے جذب باتیت میں جو بات کی تھی دادو

کا دل سن کر دہل گیا تھا۔ وہ بالآخر خرامند ہو ہی گئیں۔ انہوں نے صدق دل سے اسے دعائیں دیتے ہوئے اس کے ماتھے پر شفقت بھرا ہوا سہا دیا۔
”تھینک یوسوچ دادو!“ ایمان مارے خوشی کے ان کے گلے لگ گئی۔

☆.....☆

”سارہ سارہ کدھر ہو یار۔“ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ انہیں اسکول میں تو داخل نہ کروایا گیا تھا مگر سارہ انہیں گھر پر ابتدائی قاعدہ پڑھاتی تھی وہ دونوں کو قاعدہ پڑھا رہی تھی کہ حیدر خوشی سے اسے پکارتا مٹھائی کا ڈبہ لیے گھر داخل ہوا تھا۔
”یہ کس خوشی میں ہے۔“ اس نے ڈبہ سارہ کو تھمایا تو سارہ نے مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔
”مجھے یہ نوکری ملی گئی ہے۔ آٹھ ہزار تنخواہ ہوگی۔ اس میں ترقی کے کافی چانسز ہیں۔“ حیدر نے خوشی سے بتایا۔
اسے دوست کے توسط سے نوکری ملی تھی۔ اس میں ترقی کے کافی چانسز تھے اور مالک بھی کافی نرم اور مہربان شخصیت کا مالک تھا۔ حیدر ان سے بے حد متاثر ہوا تھا۔
”تمہیں بہت مبارک ہو۔“ سارہ نے ڈبہ بھول کر مٹھائی کا ٹکڑا اٹھا کر حیدر کے منہ میں ڈالا۔ وہ بے حد خوش تھی۔
”میں بچوں کو جلد کسی اسکول میں داخل کروا دوں گا۔“ حیدر کی آنکھوں میں سینے سے جے تھے۔ سارہ نے ہولے سے سر ہلا کر شوہر کی تائید کی۔ وہ بھی بچوں کے خوشگوار اور کامیاب مستقبل کے خواب بننے لگی تھی۔

☆.....☆

تقریب میں سارا شہر اٹھ آیا تھا۔ خاور عباسی اور نیلما عباسی نے بیٹی کی شادی میں شہر کے روساء سمیت دوست و احباب کو مدعو کر رکھا تھا۔ دادو نے سہو اور بیٹے کو منالیا تھا چونکہ رشتہ ان کے ہم پلہ تھا سو انہیں زیادہ تنگ دود نہ کرنا پڑی تھی۔ عمر اور فریخ نے بیٹے کی زبانی بات طے کر کے جلد شادی کا مطالبہ کر ڈالا۔ بارات کا شایان شان استقبال کیا گیا تھا۔
خاور نے بیٹی کو جہیز میں محل جیسا بنگلہ اور شاندار لکڑی گاڑی بھی دی تھی۔ ان کی تمام جائیداد ایمان کی ہی تو تھی۔ انہوں نے دیگر پر اپنی اور بزنس شیئر بھی ایمان کے نام کر دیے تھے۔ عمر کو بیٹے پر پہلی بار نوٹ کر پیارا رہا تھا۔ اس نے بہت اونچا ہاتھ مارا تھا۔ ان کا بزنس بام عروج تک پہنچ جاتا تھا۔
ایمان کو رخصت ہو کر عمر و لاء کی بجائے ”ایمان لاج“ جاتا تھا۔ ایاس کے والدین کو قطعاً کوئی اعتراض نہ تھا۔ آخر ایاس نے انہی کی اولاد دینا تھا۔ خواہ وہ ان کے ساتھ رہتا یا الگ۔
”فریخ میں آج بہت خوش ہوں۔ مجھے ایاس پر فخر ہے۔“ عمر گاڑی خود ڈرائیو کر رہے تھے۔
”وہ بہت چمکنے والے ہے۔“ فریخ نے گردن تان کر جواب دیا ان کے چہرے پر مغرور مسکراہٹ پھیلی تھی۔
”تم خوش تو ہو نا ایمان؟“ ویسے سے اگلے روز ہی دعوتوں کا نہ تھننے والا طویل سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان کی دن میں دو تین جگہ دعوت ہوتی۔ مصروفیت کی طویل گھڑیوں میں ایمان کو میکے آنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ اس روز شادی کے بعد پہلی بار میکے آئی تھی۔ دادو نے اسے پھیلی کا چھال بنا رکھا تھا۔ وہ ان کی گود میں سر رکھے بیٹھی تھی۔ دادو نے اس کے سر سہلاتے ہوئے محبت بھری توثیل سے استفسار کیا۔

”آف کورس دادو! ایاس بہت اچھا ہے۔“ ایمان نے خوشی سے چپکتے ہوئے بتایا۔ ایاس بے حد لوگ اور کیئرنگ تھا۔ وہ اس کا بے حد خیال رکھتا۔ وقت ایاس کی محبت بھری سنگت میں بے حد حسین و خوشگوار گزر رہا تھا۔ ایمان ایاس کی محبت بھری سنگت میں بے حد خوش تھی۔ وہ شادی کے بعد بہت بدل گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ہمہ وقت مسکراہٹ چھلکتی

رہتی اور یہ ایاس کی محبت کی دین تھی۔ دادو نے محبت سے اس کا ہاتھ چوم لیا تھا۔
”دادو! آپ خواہ مخواہ ڈری ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے بے وفا کی نہیں کرے گا۔“ ایمان کے لہجے میں اندھا اعتماد تھا۔
ہزار دو جی رشتہ اعتماد محبت کی بنیاد سے مضبوط ہوتا ہے اگر محبت کی جڑ میں نرمی دلکاؤ نہ ہو تو محبت کا پودا سوکھ جاتا ہے۔
ایمان اور ایاس کی محبت ہرگز رتے دن کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔
”ایمان! میں آج بھی تمہاری بہترین دوست ہوں اگر وہ تمہیں ستائے تو مجھے فوراً بتانا میں اس کے کان کھینچوں گی۔“ دادو نے محبت بھری شیر نظر سے ایمان کے محبت سے چپکتے چہرے پر نظریں جمائیں۔
”آف کورس دادو!“ ان دونوں کی دوستی و محبت روا جی فقروں یا جڈوں سے ہٹ کر تھی۔
”دادو! میں خوش ہوں۔“ ایمان کو ان کے اندر چھپے انجانے خوف کا اور راکھ ہوا تو اس نے انہیں بھرپور یقین دلایا۔
دادو نے ہنستے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا تھا۔
”اچھا یہ بتائیں، ربیعہ آپ کون کون کرتی ہے؟“ ربیعہ سے اس کی روزانہ بات ہوتی تھی۔ اس کی اگلے ہفتے منگنی تھی مگر اس کا جانا مشکل تھا۔ ان کی دعوتیں ہی ختم نہ ہو رہی تھیں۔ ایمان نے موضوع گفتگو بدل دیا۔
”ہاں ہر دوسرے تیسرے روز اس کا فون آ جاتا ہے۔“ دادو اسے بتاتے لگیں ان کا ربیعہ سے رابطہ تھا۔
”دادو اس کی اگلے ہفتے منگنی ہے۔ آپ ضرور جائے گا۔ میرا جانا مشکل ہے۔“ ایمان انہیں ربیعہ کی منگنی کا بتاتے ہوئے تاکید کرنے لگی۔ وہ قوجہ سے اس کی بات سننے لگیں۔

☆.....☆

”ایمان! میری ماما اور پاپا فطرتاً مادیت پرست ہیں اور ہماری شادی بھی اسی بنا پر ممکن ہوئی ہے۔“ ایاس نے ٹھہر ٹھہر کر اسے ساری بات بتادی تھی۔ وہ جوں جوں بات عمل کر رہا تھا۔ ایمان کے چہرے پر تشویش کم ہوتی جا رہی تھی۔
”ایاس یو آر سو پیٹ۔“ وہ اپنے والدین کے بالکل برعکس تھا۔ ایمان کے لیے یہ بی کافی تھا۔ ان دونوں کی محبت میں دولت حائل نہ ہوئی تھی۔ خلوص سے جڑے رشتے دلوں میں ایک دوسرے کی قدر بڑھاتے ہیں۔ ایمان کے دل میں ایاس کی محبت مزید گہری ہو گئی تھی۔ وہ مارے محبت کے اس سے لپٹ گئی۔
”ایمان تم کبھی میری محبت و خلوص پر شک مت کرو نہ میں مر جاؤں گا۔“ ایاس نے اسے اپنی بانہوں میں بھر کر محبت سے اس کے بالوں پر اپنا گال رکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کل کو ایمان کو یہ بات کسی اور رنگ میں پتا چلتی اور وہ اس سے بدظن ہوتی۔

”ایاس! مجھے تمہاری محبت پر فخر ہے۔“ ایمان خود کو معتبر اور خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ ایاس نے اس پر اعتماد کیا تھا اسے پورا مان بخشا تھا۔ وہ اس کا مان کیونکر توڑتی۔ اس کی محبت ایاس کی بے پناہ محبت پر خوشی سے چمک اٹھی تھیں۔
”تھینک یوسوچ ایمان۔“ محبت میں مان دینا اور نبھانا محبت کو معتبر کرتا ہے۔ ایمان نے اس کا مان نہ توڑا تھا۔ وہ اس کی محبت پر اندھا اعتماد کرتی تھی۔ اس کے لیے یہ زندگی کی سب سے بڑی خوشی تھی۔ ایاس کا لہجہ محبت سے پور تھا۔
بچے پھیلے ماحول نگاہ ہزنے کی ہریالی مزید بڑھ گئی تھی۔

☆.....☆

”حیدر! کل بچوں کی اسکول فیس جمع کروانے کی لاسٹ ڈیٹ ہے۔“ دونوں بچوں کو شہر کے اچھے اسکول میں داخل کروایا گیا تھا۔ حیدر نے اپنی استطاعت سے بڑھ کر بچوں کے تعلیمی اخراجات اٹھائے تھے۔ اس نے کئی نوکری ملتے ہی فرم میں ڈبل شفٹ شروع کر دی تھی۔ اس کی تنخواہ ڈبل ہونے کے ساتھ اس کا بزنس بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ صبح کا کیمارات

گئے مگر لوٹا تھا۔

”تم کل کھیتی کے پیسوں سے بینک میں فیس جمع کروادینا۔ میں شام کو تنخواہ لیتا آؤں گا۔“ حیدر کو تنخواہ ملنے میں تاخیر ہو گئی تھی۔ حیدر نے اسے بروقت فیس جمع کروانے کی تاکید کی تاکہ وہ جرمانے سے بچ سکے۔

”حیدر! تم کتنا تمک جاتے ہو۔“ وہ اپنی استغاثت و ہمت بڑھ کر محنت کر رہا تھا۔ وہ گاؤں میں بابا کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بابا اس کا کھیتوں میں مکمل ہاتھ بٹاتے تھے جب کہ وہ یہاں اکیلا تھا۔ اس نے بو اور بابا سے شہر آنے کو کہا تھا مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ حیدر نے انہیں زمینیں بیچنے کا مشورہ دیا تھا تاکہ وہ سب شہر میں اکٹھے نہ سکیں۔ اسے بو اور بابا کی بے حد فکر رہتی تھی۔ فرحانہ کے بھی دو تین رشتے آئے ہوئے تھے۔ بابا جلد ہی ایک رشتہ فائل کرنے والے تھے۔ لڑکا برادری کا تھا اور لی اے کے بعد شہر کی ایک مشہور فرم میں معقول جاب کر رہا تھا۔ وہ بیاد کر شہر آ جاتی۔ حیدر والدین کو بھی ساتھ لانا چاہتا تھا مگر ان کی نہ ہاں میں نہیں بدل رہی تھی۔ سارہ کو اس کے خود چہرے پر پھٹتی تھکاوٹ نے ملول کر دیا۔ اس کے لہجے میں تاسف بھری ہمدردی سمٹ آئی تھی۔

”میں یہ سب تم لوگوں کے سکھ کے لیے ہی تو کر رہا ہوں جھلی۔“ حیدر نے محبت سے اسے سینے سے لگا لیا۔ سارہ نے طویل سانس کھینچتے ہوئے اس کے سینے سے سر نکال دیا۔ ان کے دکھ سکھ سانچے تھے۔ اسے حیدر کا ہجر پور ساتھ دینا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ہر قدم پر تھی۔

☆.....☆

”ایمان! اگر تم اسٹڈی کمپلیٹ کرنا چاہتی ہو تو تم یونیورسٹی جوائن کر سکتی ہو۔“ وہ دونوں فارن ٹرپ سے لوٹ آئے تھے۔ ان کی دعوتوں کا سلسلہ بھی ختم چکا تھا۔ وہ وطن لوٹنے کے بعد بزنس سنبال چکا تھا۔ وہ آفس کے لیے تیار ہو کر ناشتے کی ٹیبل پر آیا تو ایمان اسی کی مختصر سی۔ الیاس نے ایمان کی تنہائی کا خیال آتے ہی اسے اجازت دی۔

”نہیں میرا مزہ پڑھنے کا سوڈ نہیں ہے۔ ایمان رفتہ رفتہ روٹین لائف میں سیٹ ہو رہی تھی۔ اس کا پڑھنے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ خاصا مصروف وقت گزارتی تھی۔ دادو بھی گا بے بگا ہر بنے کے لیے آ جاتیں۔ ایمان نے صاف انکار کر دیا۔

”اوکے ایز یوش۔“ الیاس اسے فورس نہ کر رہا تھا۔ وہ محض اس کی تنہائی بانٹنے کے خیال سے اسے مشورہ دے رہا تھا۔ اس نے مصروفیت بھری رضامندی سے کندھے اچکاتے ہوئے توں کا گلزار منہ ڈالا تھا۔

”ایمان! مجھے شام کو دیر ہو جائے گی۔“ الیاس کو آفس میں اپورٹ میٹنگ اینڈ کرنا تھی۔ وہ بجلت ناشتہ ختم کر کے کوٹ پہنتا باہر کی طرف لگا۔

”آپ واپسی پر دادو کو گولیتے آئے گا۔“ ایمان اسے پورچ تک چھوڑنے آئی تھی۔ اس نے الیاس کو تاکید کی۔ وہ دو روز میں ہی دادو کے بغیر اداس ہو گئی تھی۔ الیاس اپنے نئے بزنس میں کافی بڑی رہتا تھا اور ہر دوسرے روز اسے آفس سے واپسی پر درہو جاتی تھی۔ دادو کے آنے سے اس کی تنہائی ختم ہو جاتی۔

”جو حکم عظیم صلیب کا۔“ الیاس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے سر کو لگا سا خم دیا۔ ایمان کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ رینگ گئی وہ الیاس کو گاڑی باہر نکالتے دیکھنے لگی اور گاڑی نکالیں ہوں سے اوٹھل ہوتے ہی پلٹ گئی تھی۔

☆.....☆

”حیدر! میں جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ انہیں شہر آئے پانچ سال سے زائد ہو گئے تھے۔ انہیں حیدر کے دوست نے دیا ہوا رہائش کے لیے مگر واپس لے لیا تھا۔ اس کی ٹیلی بیرون ملک سیٹل ہو رہی تھی اور وہ اپنی تمام پر اپنی سچ کر جا رہے

تھے۔ حیدر کو مگر ڈھونڈنے اور کرائے کی فکر تھی۔ حالات بہتر جا رہے تھے مگر اب گھر کے کرائے کے لیے رقم ہر مہینہ نکالنا دو بھر ہو چکا تھا۔ بچوں کی ماہانہ فیس ہزاروں میں تھی۔ وہ انہیں کسی معمولی اسکول میں داخل نہ کروانا چاہتا تھا۔ وہ ان کے بہتر مستقبل کے لیے ہی تو شہر آئے تھے۔ حیدر کا بی بی پریشان رہنے لگا تھا۔ سارہ نے شوہر کی پریشانی کا حل ڈھونڈ لیا تھا۔

”نہیں تم کہاں کر دو گی جاب۔ میں خود کچھ کر لوں گا۔“ حیدر کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ سارہ مشقت کا بوجھ اٹھائے۔ اس نے نازک اندام سارہ کو محبت سے دیکھتے ہوئے صاف انکار کیا۔ وہ شادی کے آٹھ نو سال بعد بھی نہ بدلی تھی۔ ان دنوں کی محبت گزرتے وقت کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔

”حیدر! میں اکیلی پور ہوئی ہوں اور یوں تمہاری ویلپ بھی ہو جائے گی۔“ سارہ لاڈ سے چٹکی۔

”سارہ تم.....!“ حیدر کا دل نہ مان رہا تھا۔

”پلیز حیدر!“ سارہ جس فیصلے پر پڑا جاتی تو وہ پیچھے نہ ہٹتی تھی اس نے منت بھرے انداز میں اس کے بازو پر اپنا نرم ہاتھ رکھا۔

”تم کہاں جاب کر دو گی؟“ وہ ذرا ڈھلا پڑا تھا۔

”میں نے اخبار میں ایک دیکھنی دیکھی ہے۔“ سارہ روزانہ پڑوس سے اخبار منگوا کر جاب کا ایڈ دیکھتی تھی۔ وہ تفصیلاً حیدر کو بتانے لگی۔

”مگر سیکرٹری کو ہائی ایجوکیشن بھی ہونا چاہیے۔“ حیدر کو اس کی تعلیمی قابلیت کا خیال آیا اس نے دھیسے سے سارہ کو احساس دلایا۔ وہ خوش شکل اور خوش لباس خوش گفتار تھی مگر بھلا محض میٹرک پاس کو کون سیکرٹری رکھتا۔ جب کہ فرم بھی نئی مکمل تھی۔

”حیدر! ثرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ خوش گفتاری کم تعلیمی قابلیت کا عیب چھپا لیتی ہے۔ وہ پکا تہیہ کر چکی تھی۔ اس نے شوہر کو مضبوط دلیل دی۔

”چھاپیسے تمہاری مرضی۔“ یہ حیدر کا مخصوص انداز تھا۔ وہ کبھی اس سے بحث میں جیت پاتا تھا جو آج وہ جیت جاتا۔ اس نے ہار مانتے ہوئے مسکرا کر دونوں ہاتھ سارہ کے سامنے جوڑے۔

”چھینک یو سوچ حیدر۔“ سارہ نے جواباً خوش دلی سے کہا۔

☆.....☆

”مس سارہ حیدر۔“ الیاس نے سارہ کی مختصر سی وی کو اچھی سے دیکھ کر فائل بند کرتے ہوئے سر تپا پاسانے بیٹھی سارہ کو بخور دیکھا۔ گوری رنگت، دراز قد، سلیقے سے سجے بال، خوش لباس اور خوش گفتار سارہ جیسی لڑکی بھینا سیکرٹری کی تمام خوبیوں پر پورا اترتی تھی مگر اس کی تعلیمی قابلیت نے الیاس کو سوچ میں ڈال دیا تھا اگر وہ گریجویٹ بھی ہوتی تو حسن پرست الیاس اسے ہی سیکرٹری رکھتا۔

”جی سر!“ اس کے لہجے کا واضح تحیر محسوس کر کے بھی سارہ کا لہجہ سادہ و پر اعتماد تھا۔

”آپ محض میٹرک پاس ہیں جب کہ ہماری ریکروائٹمنٹ کم از کم گریجویٹ ہے۔“ الیاس اس کے لہجے سے متاثر ہو کر نرمی سے گویا ہوا۔ نہ جانے اس لڑکی میں ایسا کیا تھا کہ وہ اس سے متاثر ہوا جا رہا تھا۔

”سر! آپ مجھے صرف ایک چانس دے کر دیکھیں میں آپ کو مایوس نہیں کر دوں گی۔“ سارہ کا سادہ لہجہ اعتماد و منت سے پر تھا۔ وہ ہر صورت یہ جاب پانا چاہتی تھی۔

”آپ میرا مطلب نہیں سمجھ پا رہی ہیں۔“ الیاس نے نرمی سے اس پر گہری نگاہ ڈالی تھی۔ معصومیت بھرا سادہ حسن دل موہ لینے والا تھا۔

”میں اپنے کام سے اپنی کم تعلیمی قابلیت ظاہر نہ ہونے دوں گی۔“ سارہ نے جاب حاصل کرنے کے لیے دلیل دی۔

”مس سارہ! آپ اس دکنسی کی باریکیاں سمجھ پائیں گی۔“ الیاس کا لہجہ استغماہیہ تھا۔ وہ گہری سوچ میں گم ماما رگڑاتا اس سے مخاطب تھا۔ وہ دو روز میں کئی لڑکیوں کے انٹرویو کر چکا تھا مگر اسے کوئی لڑکی پسند نہ آ رہی تھی۔ سارہ پہلی لڑکی تھی جو اسے بے حد بھائی تھی مگر اس کا تعلیمی ریکارڈ بیچ میں حائل تھا۔

”آپ مجھے ایک ہفتہ جاب کا موقع دے کر دیکھ لیں۔“ سارہ ذہین اور مخفی تھی۔ اس نے اعتماد سے الیاس کی نگاہوں میں جھانکا تھا۔

”ہوں..... آپ کل سے آجائیں۔“ اس کی دلیل پر وزن تھی اس نے قائل ہوتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔
”جھینک پوسر!“ سارہ کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ دفعتاً الیاس کو لگا اس کے آفس میں روشنی بڑھ گئی ہے۔

☆.....☆

”اسلم! سارہ کو اندر بھیجیو۔“ سارہ باقاعدگی سے آفس آ رہی تھی۔ اس نے واقعی اپنی محنت و ذہانت سے جاب کی باریکیاں سمجھ لی تھیں۔ اس نے الیاس کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا تھا۔ الیاس نے ایک ہفتے کے ٹرائل کے بعد اس کی جاب چکی کر دی تھی۔ وہ ذمہ داری سے اپنا کام کر رہی تھی۔ الیاس کو کبھی ٹیل نہ ہوا تھا کہ وہ محض میزک پاس ہے۔ سارہ نے اپنی خوش اخلاقی و خوش گفتاری سے آفس میں اپنی جگہ چکی کر لی تھی۔ اسے آتے مہینہ بھر ہو گیا تھا۔ الیاس نے اسے نئے پروجیکٹ کی فائل مکمل کرنے کی کوئی تھی۔ الیاس نے بیون کو بلا کر سارہ کو بلوانے کی ہدایت کی۔

”سر! وہ آج غیر حاضر ہیں۔“ بیون بتا کر چلا گیا۔ الیاس نے اس کے جانے کے بعد کمپیوٹر پر فائل کا ڈیٹا تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس سے کیسوی سے کام نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ بار بار ڈیٹا تیار کرتا اور ڈیلیٹ کر دیتا۔ آخر اس نے تنگ آ کر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور سردیوں ہاتھوں پر گر لیا۔ وہ کچھ عرصے میں ہی سارہ کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اس کے بغیر اس سے ایک روز بھی کام کرنا دو بھر ہو گیا تھا۔

اس کا آفس سے یکدم دل اچاٹ ہو گیا۔ اسے پہلی بار خیال آیا کہ اس کے پاس سارہ کا پرسل نمبر بھی نہ تھا۔ اسے کبھی سارہ کے پرسل نمبر کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس نے آنکھیں موندھ کر سرچیز کی بیک سے نکال لیا۔ اگلے بل اس نے کرٹ کھا کر آنکھیں کھل دیں بند پتلوں پر سارہ کا مسکراتا چہرہ متحرک تھا۔

”کیا مجھے سارہ سے محبت ہو گئی ہے؟“ الیاس کے وجہ میں سوال چکرانے لگا۔ وہ سنانے میں رہ گیا۔ محبت اس کے وجود میں دھاتاک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ جتنا خود کو جھٹلاتا۔ سچائی اتنی شدت سے خود کو منوانے پر قائل جاتی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ!“ الیاس نے سچائی سے ہار مانتے ہوئے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ اس کے سنے اعصاب رفتہ رفتہ ڈھیلے پڑنے لگے۔ سارہ کا دلکش سراپا پتلوں پر متحرک تھا۔

☆.....☆

”ہوا! آپ ہمارے پاس رہیں۔“ ہوا رحمت اور بابا نے فرحانہ کی شادی کی ڈیٹ فکس کر دی تھی۔ وہ بیٹی کے جینز کی خریداری کے لیے شہر آئے تھے۔ وہ دونوں شاپنگ مکمل کر چکے تھے اور صبح ان دونوں کی واپسی تھی۔ سارہ نے ہفتہ بھر آفس سے چھٹی کر کے ان کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ وہ ان کی واپسی پر اداس تھی۔

”جنا! فرحانہ کی شادی میں تمہوڑے دن رہ گئے ہیں اور کام زیادہ ہے۔“ بوارحمت نے رسائییت سے انکار کیا تھا۔ ان کا دل بھی سپردا رہنے کے ساتھ رہنے کو چاہ رہا تھا مگر فرحانہ کی شادی سر پر تھی۔

”تم اداس نہ ہو۔ تم دونوں شادی پر آنا پھر ہم دو بارہ تہوارے ساتھ رہنے آ جاؤ گے۔“ سارہ خاصی اداس تھی۔ بوا سے بھوکے اداسی دیکھی نہ گئی۔ انہوں نے محبت سے بھوکو خود سے لپٹا لیا۔ وہ بیٹی کی شادی کے بعد تہوار کے تصور سے ہراساں رہتی تھیں۔ وہ دلی طور پر خواہش مند تھیں کہ حیدر اور سارہ واپس آ جائیں۔ وہ بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر آئے تھے۔ گاؤں کا ان کا کالج ڈگری کالج بن گیا تھا۔

”بوا فرحانہ خوش تو ہے نا؟“ سارہ کو اپنی پرانی سہیلی کا خیال آیا تو اس نے محبت سے پوچھا۔

”وہ کافی خوش ہے۔“ بوا نے خوش دلی سے جواب دیا۔ سارہ ان سے فرحانہ کی باتیں شیئر کرنے لگی۔

☆.....☆

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے الیاس؟“ رات کے دو بج رہے تھے۔ ایمان کی آنکھ کمرے میں پھیلی روشنی سے کھلی۔ الیاس بستر پر نیم دراز سوچوں میں گم مسلسل چھت گھورے جا رہا تھا۔ ایمان نے نشوونما سے استفسار کرتے ہوئے اس کا کندھا ہلایا تھا۔

”ہوں..... ہاں.....“ الیاس بری طرح بوڑا کر سیدھا ہوا تھا۔ ایمان کی گہری کھوجتی نظرس ای پر جمی تھیں۔ سارہ ہفتہ بھر سے آفس سے بغیر اطلاع کے غائب تھی۔ الیاس سے اس کے بنا وقت کاٹنے نہ کٹ رہا تھا۔ وہ محبت کے پراویت دورا ہے پر کھڑا تھا۔ یہ ادارا کے جاکسل لمحات تھے۔ وہ چاہ کر بھی حقیقت سے فرار نہ حاصل کر پار ہوا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس ذرا سر میں درد تھا۔“ الیاس نے نرمی و محبت سے بہانہ بناتے ہوئے کمرٹ لیتے ہوئے آنکھیں موندھ لیں۔ نیند کی رسیا ایمان قدرے مطمئن ہو کر اسے سوتا کچھ کر دو بارہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔ الیاس سکون بھری سانس بھرتا سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔

☆.....☆

”آپ میرے آفس میں آئیں مس سارہ۔“ بوا جا چکی تھیں۔ وہ اگلے روز آفس جانے لگی۔ اس نے جاتے ہی دو ہفتے کا آف لینے کے لیے درخواست ٹاپ کر کے الیاس کی ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ الیاس اس سے گریز کر رہا تھا۔ وہ ایمان سے بے وفائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس سے شدید محبت کرتا تھا۔ وہ آفس کا راؤنڈ لگا کر لوٹا تو اس کی نگاہ اپنے ٹیبل پر پڑی۔ وہ خود سارہ کی ٹیبل پر آ گیا۔ کام میں بڑی سارہ سر ہلائی اٹھ کر اس کے پیچھے چل دی۔

”یہ کیا ہے سارہ؟“ وہ جو بھی اندر داخل ہوئی تو الیاس نے استحقاق بھرے انداز میں اسے ڈانٹتے ہوئے خفگی سے اس کی نگاہوں کے سامنے درخواست لہرائی۔

”سر! مجھے اپنے گاؤں شادی اٹینڈ کرنے جانا ہے۔“ سارہ نے آہستگی سے مجرمانہ انداز میں بتاتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”سارہ! آپ جہاں مرضی جائیں مگر چند روز بہت زیادہ ہیں۔“ الیاس نرم پڑا وہ خاصی نروس ہو گئی تھی۔ وہ پھلے اس سے گریز برت رہا تھا مگر دل کا ایک کوناسا کے جانے کا سوچ کر ہی اداس ہوا جا رہا تھا۔

”مس سارہ! آپ پہلے ہی ایک ہفتہ آف کر کے آئی ہیں۔ آپ کو مزید آف نہیں مل سکتا ہے۔“ الیاس نے اسے ڈپٹے ہوئے صاف انکار کیا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا جب کہ سارہ اس کی بات سمجھنے پر آمادہ ہی نہ تھی۔

”سر! کام کا جو جرح ہو گا وہ جلد پورا کر دوں گی۔“ سارہ نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔ وہ دل تمام کر رہ

گیا۔ وہ ساکت اسے چند لمحے گھورنے لگا۔ ماحول پر معنی خیز خاموشی طاری ہو گئی۔ عورت کو خدا نے یہ صفت ودیعت کی ہے کہ وہ مرد کی نسبت کسی انہونی کو جلد بھانپ لیتی ہے۔ الیاس بے حد نرم اور مہربان باس تھا۔ اس نے سارہ پر کبھی بے جا سختی نہ کی تھی اور نہ ہی کبھی اس پر زندہ کام کا لوڈ ڈالا تھا۔ سارہ کو کسی انہونی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے الیاس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جہاں محبت و پسندیدگی کی چمک واضح تھی۔ وہ دہلی کر کے ساختہ دو قدم پیچھے ہٹتی۔

”سر!“ وہ جاب کی ریکارڈ منٹ بخولی احسن پوری کر رہی تھی مگر اس کے سامان و گمان میں بھی نہ تھا کہ الیاس اسے جانے لگے گا۔ وہ میرڈ تھی اس نے یہ بات بھی الیاس کو نہ بتائی تھی بلکہ اسے کبھی یہ بات بتانے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ اس کی دھیمی سرسراہٹی آواز لیوں سے مشکل نکلی تھی۔

”سارہ! آپ جلد آ جائیے گا۔ آفس ورک کا ہرج ہوتا ہے۔“ ماحول پر دھیرے دھیرے جھانی مسمیہ ٹائوٹ مٹی تھی۔ الیاس نے چونک کر خود کو سنبھالنے ہوئے اسے جانے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے سن ذہن لیے پلٹ گئی۔

☆.....☆

”وہ آفس سے لیٹ ہو رہا تھا۔ وہ خلاف معمول جلد اٹھ کر تیار ہو گیا تھا مگر وہ اپنی تیاری سے مطمئن نہ ہو پار ہوا تھا۔ اس نے میووں بار خود پر پرفیوم انڈیا ملا تھا۔ وہ خوشبودن میں نہایا۔ نیوی بلیو شرٹ اور بلیک پینٹ میں لمبوس، کمری ناک اور پیلے سے تھے بال میں بے حد جرج رہا تھا۔ وہ عام دنوں سے ہٹ کر لگ رہا تھا بلکہ وہ آج زیادہ وجیہہ و خوب رنگ رہا تھا۔ اس کی مردانہ وجاہت واقعی بڑھ گئی تھی یا پھر ایمان کو ہی ایسا لگ رہا تھا۔

وہ بیڈ پر بیٹھی بند ہاتھوں کی ٹمپی پر چہرہ دکھانے تیاری میں مشغول الیاس کو گہری سوچتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہر رنگ و انداز بدلا بدلا تھا۔ عورت اپنے مرد کے ہر رنگ و روپ کو بخوبی پہچانتی ہے۔ وہ مرد کا معمولی بدلاؤ بھی فوراً بھانپ جاتی ہے اس کی جمعی حس بے حد شارب ہوتی ہے۔ اسے آنے والے حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ الیاس مختلف لگ رہا تھا یا وہ واقعی بدل گیا تھا۔ ایمان ٹھٹھک کر رہ گئی۔

ان کی شادی کو سال بھر ہونے والا تھا ان کی مثالی محبت و ازدواجی زندگی کے چرچے زبان زد عام تھے۔ وہ کوئی ایکسٹینڈل قطعاً انورڈ نہ کر سکتی تھی۔

”الیاس! آج آپ کافی ٹک سک سے تیار ہیں۔“ ایمان اس سے پوچھے بنا نہ روہ سکی تھی۔ سارہ وہ ہفتوں کی لیو کے بعد آفس آ رہی تھی۔ الیاس نے محبت سے نظرس چراتے وقت گزارا تھا مگر محبت نے اسے اپنی مضبوط گرفت سے آزاد نہ کیا تھا۔ وہ لاشعوری طور پر سارہ کے لیے خصوصی طور پر تیار ہوا تھا۔ اس نے رات آفس سے واپسی پر شہر کی معروف شاہراہ سے ایک گلاب کی ادھکلی کی بھی خریدی تھی۔ اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب لاشعوری طور پر چھپی۔ وہ چونک کر متوجہ ہوا اور خالی نظروں سے ایمان کو دیکھنے لگا۔

”ہوں..... آج آفس میں اپورٹنٹ میٹنگ ہے۔“ اس نے لہجہ ہموار بتاتے ہوئے مسکرا کر ایمان کو دیکھا۔ وہ اس کے دل کے قریب تھی۔ اس کی روح کا قرا اور جسم و جان کا سکون تھی۔ اسے دیکھتے ہوئے الیاس کے چہرے پر پھیلی نرم مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

”الیاس! آپ بے حد اچھے لگ رہے ہیں۔“ ایمان نے اپنے اندر اٹھتے شک کو دباتے ہوئے محبت سے اس کی ٹائی کی ٹاٹ درست کی۔ وہ مسکرا کر اس کے گال پر محبت بھرا بوسہ دیتا تیزی سے باہر نکل گیا۔ جب کہ ایمان کی پر سوچ گہری نگاہوں نے اس کا دور تک پہنچا گیا تھا۔

☆.....☆

ماہ رمضان کا آغاز ہو چکا تھا۔ ماہ رمضان کا آغاز ہوتے ہی سارہ کی مصروفیات بے حد بڑھ گئی تھیں۔ انہی مصروفیات میں وہ الیاس کے بدلے رنگ ڈھنگ چاہ کر بھی نظر انداز نہ کر پاری تھی مگر اس کی تمام توجہ صرف اپنے کام پر تھی۔ اس کی خوشحال قبلی تھی اگر ایسا اس سے کوئی بات کرتا تو وہ اسی روز جاب چھوڑنے کا تہیہ کر چکی تھی۔ اسٹاف مگر جا چکا تھا۔ وہ کام میں بڑی تھی۔

”مس سارہ!“ آفس میں گہری خاموشی کا راج تھا۔ الیاس اسٹاف کے آف کے بعد مگر جانے کے لیے اپنے روم سے نکلا تو سارہ اپنے کیمین میں لیپ ٹاپ پر بڑی تھی۔ وہ آہستگی سے چلا اس کی ٹیبل کے قریب آگیا اس نے دونوں ہاتھ ٹیبل پر نکاتے ہوئے جھک کر سارہ کی گہری سرخی آنکھوں میں جھانکا۔

”لیس! کام میں مصروف سارہ نے بوکھا کمر لو پر اٹھایا اور الیاس کو سامنے پاتے ہی تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

”آپ گھر نہیں گئیں؟“ الیاس نے اس کی تنہائی کے خیال سے پوچھا۔ وہ وقتی جذبے کے حصار میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ خود کو سنبھال چکا تھا۔ اس نے اپنے اندر جھانکا۔ دل میں کوئی خاص جذبہ نہ ابھرا۔ یہ صرف پسندیدگی تھی۔ اس کا دل ہلکا ہلکا ہو گیا۔ وہ ایمان کے بغیر جیسے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

”سر! بس تھوڑا کام رہ گیا تھا۔ میں جانے والی تھی۔“ وہ قدرے ہلکا کر بولی۔ اسے الیاس کی موجودگی نزدں کر رہی تھی۔

”آپ سکون سے کام ختم کریں۔ میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا۔“ الیاس عام لہجے میں کہتا اپنے روم کی طرف پلٹ گیا۔ اس کے قدم محبت کی خاردار وادی میں آگے نہ بڑھے تھے۔ اس نے جلدی اپنے جذبے پہچان کر قدم موڑ لیے تھے۔ اس کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ پھیلی تھی۔ وہ بے خبر تھا کہ کوئی اور ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

☆.....☆

”حیدر! ہم گاؤں واپس چلتے ہیں۔“ رمضان کا آخری عشرہ چل رہا تھا۔ فرحانہ کی شادی کے بعد گاؤں میں بڑا اور بابا بے حد تنہا ہو گئے تھے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے تھے مگر انہیں گھر میں تنہائی اور سناٹا ڈسٹا تھا۔ فرحانہ یا ریمنا آجائیں تو گھر کے خاموش درد بام چھپانے لگتے اور ان کے جاتے ہی خاموشی کا گہرا راج چھا جاتا۔ گھر میں موجود دونوں نفوس کے پاس جیسے کہنے سننے کو کچھ نہ بچا تھا۔ سارہ کو ان کی تنہائی کا خیال ڈسٹا رہتا۔ صد شکر کہ الیاس نے اپنے قدم جلد موڑ لیے تھے۔ اس کی خوشگوار ازدواجی زندگی میں کوئی سلاطم نہ آیا تھا۔ وہ بے حد خوش و خرم اور مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔

انفاری میں کچھ لمحے باقی تھے۔ وہ دونوں بچوں سمیت دسترخوان پر موجود تھے۔

”رینگی سارہ! تم نے میرے منہ کی بات سمجھ لی۔“ حیدر کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ اس نے ممنونیت سے بے ساختہ سارہ کے ہاتھ تمام لیے۔ اسے بھی والدین کی تنہائی ڈستی تھی۔ وہ بچوں کے خوشحال اور بہتر مستقبل کے لیے شہر آئے تھے۔ ان گزرے سالوں میں گاؤں نے کافی ترقی کر لی تھی۔ ان کے پاس شہر میں مزید قیام کو کوئی جواز نہ رہا تھا۔ وہ بچوں کو گاؤں میں بھی پڑھا لکھا سکتے تھے۔

”میں بوا کو نوں کر دوں گی۔“ سارہ نے خوشی سے چپکتے ہوئے کہا تھا۔

”نہیں، ہم انہیں سر پرانز دیں گے۔“ حیدر بے حد پر جوش ہو چکا تھا۔ جب کہ دونوں بچے بھی دادی اور دادا کے ساتھ رہنے کے خیال سے بے حد مسرور تھے۔

”اللہ اکبر! اللہ اکبر۔“ مغرب کا ملکا باندھرا چھلنے ہی قریبی مساجد سے اللہ کی کبریا کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ اس نے محبت سے اپنے بے حد چاہنے والے مسرور دیکھا جس نے زندگی کے ہر قدم پر اس کا ہر پور ساتھ دیا تھا۔

☆.....☆

”حیدر کے ابا! میرا حیدر آگیا۔“ اس روز تو ہی امکان تھا کہ اگلے روز عید ہوگی۔ حیدر اور سارہ کو سامان سمیٹتے اور تیاری کرتے ہنک گئے تھے۔ بعد نماز عصر بوارحت تلاوت قرآن پاک سے فارغ ہو کر انفاری کی تیاری میں بچے کھل گئی میں ٹوک آن رکا۔ وہ برسوں گلی میں ایسی آواز سننے کو ترسی تھیں۔ وہ مالک گوشت پکانے میں مگن تھیں کہ انہوں نے بے ساختہ ٹھکتے ہوئے رک کر بند دروازے کے کواڑوں کو کھولا۔ ان کی آنکھوں میں یاسیت بھرے آنسو ٹھہر گئے۔ ان کا دل انجانے احساس میں گھر کر خوش کن خیال میں ڈوب کر ابھرا۔ ان کا دھیان بٹ چکا تھا۔ وہ چاہ کر بھی کھانے کی طرف دھیان نہ لگا پاری تھی۔

”ٹھک ٹھک۔“ گلی میں سامان اتارنے کی مخصوص آوازیں ابھر رہی تھیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو ان کا دل سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہ حیلے قدموں سے چلتی آئیں اور دروازہ کھول دیا۔ اگلے بل ان کے حلق سے پرسترت چچ ابھری تھی۔ بابا تیزی سے بھاگتے آئے اور بے یقینی سے صحن کے پیچوں بچ اپنی جگہ ساکت رہ گئے۔ زمین نے ان کے قدم مضبوطی سے جکڑ لیے تھے۔ ان کی پچنی پچنی نگاہیں دروازے پر جمی تھیں۔ جہاں بوارحت بیٹے اور بہو کی بلائیں لینے کے بعد پوتے پوتی کو گود میں لیے ہوئے تھیں۔

”بابا۔“ حیدر اور سارہ ہوا سے ملنے کے بعد ابا کے گلے لگ گئے۔ بابا کی آنکھوں سے تشکر بھرے آنسو نکل گئے۔ ان کی ساری دعاؤں قبول ہو گئی تھیں۔

باتوں میں مگن انفاری کا نام ہونے کو تھا۔ بوا پرسکون سی کھانا بنانے میں مگن ہو گئیں سارہ ان کے منع کرنے کے باوجود ان کا ہاتھ بنانے لگی۔ بابا نے گھر کے ہر پور منظر پر تشکر بھری نگاہ ڈالی۔ دونوں بچے کھیل میں مگن تھے جب کہ حیدر ان کے ساتھ باتوں میں کو تھا۔ اب کے برس عید کئی برسوں بعد پوری رعنائیوں سمیت ان کے آنگن میں اترنے والی تھی۔ وہ رب کے بے حد مشکور تھے۔

☆.....☆

”عید مبارک ایمان۔“ الیاس نماز عید کے بعد گھر لوٹا تو ایمان اور دادو بچن میں مصروف تھیں۔ ایمان اس کے لیے شیر خرمد لے کر آئی۔ الیاس نے محبت سے اسے تمام کر مبارک باد دی تھی۔ سارہ میر ڈی اسی سارہ کے ریزائن دینے کے بعد علم ہوا تھا۔ وہ رب کا شکر گزار تھا کہ وہ اپنی نگاہوں میں مستبہر رہا تھا۔ وہ تو سارہ کی نگاہوں میں گرا تھا اور نہ ہی اس نے ایمان کا اعتماد کھو یا تھا۔ اسے ایمان سے محبت تھی اور وہ وفادار تھا۔ وہ بھلے ہر جانی فطرت کا مالک کسی مگر اس نے وفا نبھائی تھی۔ اس کے وجہ چہرے پر محبت ان کی صورت بکھری تھی۔

”سیو یو۔“ ایمان نے جوا کر مجبوشی سے اسے عیدوش کی تھی۔ عورت مرد کی طبیعت کا بدلاؤ فوراً بھانپ لیتی ہے اس نے الیاس کے بیون اسلم کو نصوصی مراعات کے وعدے پر الیاس کی مکمل جاسوسی کرنے کا حکم دیا تھا۔ اسلم نے چند روز اس کی مکمل جاسوسی کر کے ایمان کو سب او کے کی رپورٹ دی تھی۔ ایمان نے سب وہم دل و دماغ سے جھٹک دیے تھے۔ الیاس صرف اسی کا تھا۔

”بی بی جی! آپ کو صاحب بلا رہے ہیں۔“ الیاس محبت سے اس کے لیے لائے پھولوں کے گجرے پہنار ہا تھا کہ ملازم دستک دے کر اندر داخل ہوا اور پیغام دے کر لوٹ گیا۔ وہ دونوں مطمئن و مسرور باہر آ گئے۔ عید سائیں روشن ہو گئی تھیں۔ خاردار نیلہ انہیں ملنے آئے تھے۔ عمو اور فریڈ آئے والے تھے۔ عید کی خوشیاں دو بالا ہونے کو تھیں۔

☆.....☆

انیتہ اختر

میرج ہندی کی درد منشاں

”یا اللہ میری دعاؤں کو قبول فرما الہی تو بڑا غفور
الرحیم ہے یا اللہ تو ستر ماؤں جتنا پیار کرنے والا رب
ہے الہی میری دعاؤں کو قبول فرما میرے دل سے اس
انسان کو نکال دے میں اپنے رشتوں سے دغا نہیں

کر سکتی۔“ آنسوؤں سے تر چہرہ لئے پچھل آدھے
گھٹنے سے وہ اپنے رب کے حضور رگڑا رہی تھی جا بہ نماز
لیٹ کر کھڑکی کے پاس آکھڑی ہوئی چہرے کو بے
دردی سے رگڑتے ہوئے اس آدمی اور صوری ملاقات
کے بارے میں سوچنے لگی جس نے اس کی زندگی کا ہر
رنگ چھین لیا۔

☆☆☆☆

”اوہ امی جی میری سادی مہندی خراب
کر دی۔“ وہ آنکھوں میں آنسو لئے مہندی سے نجی



تھیلیوں کو دیکھتی پوری کی پوری معراج سکندر کے دل میں اتر گئی تھی۔

”مسٹر! تم دیکھ کر نہیں چل.....“ اس کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے جب اس کے گریبان پر لگا مہندی کا رنگ دیکھا۔

”اوہ آئی ایم سوری وہ کیا ہے ناں کہ امان میری مہندی خراب کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو میں بھاگتی ہوئی آپ سے ٹکرائی۔“ وہ اپنی خراب مہندی کو بھول کر ایکسکوز کرنے لگی۔

”اس اوکے۔“ وہ اپنی پاکٹ سے رومال نکال کر مہندی صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یہ داغ اس طرح نہیں جائے گا یہ مہندی کا رنگ ہے اور سفید کپڑے سے مہندی کا رنگ نہیں جاتا۔“ شرمندگی سے بولتی ہوئی اس نے اس کی پوری ڈریسنگ کا جائزہ لیا، سفید شلوار میض اور گلے میں یلو اور گرین دوپٹہ ڈالے وہ بہت ڈشنگ دکھائی دے رہا تھا۔

”تو کیا پورا فنکشن اس داغ کے ساتھ اٹینڈ کروں گا۔“ وہ ہاتھ سے میض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

”ڈونٹ وری میں کچھ کرتی ہوں آپ چلیں میرے ساتھ۔“ وہ اسے لئے اندر کی طرف بڑھ گئی جب وہ واپس اس کی طرف آیا تو عمر کی بلیک شلوار قمیض میں ملبوس تھا، عمر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا دیکھ رہے ہو تمہارا بی ڈریس ہے۔“ معراج سکندر مسکرا کر بولا۔

”مگر یار یہ سب ہے کیا۔“ عمر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

”یار وہاں ایک لڑکی کی مہندی سے میری قمیض خراب ہو گئی تھی وہ امان سے اپنی مہندی بچاتے بچاتے میری میض خراب کر گئی اور اپنی مہندی بھی۔“

”مثال ہوگی وہی ہر وقت امان سے لڑتی رہتی ہے۔“ مثال۔“ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے معراج سکندر کے ہونٹوں پر ایک خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆☆

پہلے مہندی پھر ولیمہ اور بارات وہ دونوں ایک دوسرے کو ہی کھو جتے رہے، معراج سکندر اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کس جذبے کے تحت ہے مگر مثل اب تک اس جذبے کو کوئی نام نہیں دے پائی تھی اس طرح شادی اختتام پذیر ہوئی اور مثل کی فیملی کراچی سے لاہور روانہ ہوئی۔

☆☆☆☆

شفیق صاحب اور نامہ بیگم دونوں بہن بھائی تھے شفیق صاحب اپنی بہن سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے شفیق صاحب ہی نہیں بلکہ ان کی بچی صوبہ بھی نامہ کو اپنی بہنوں کی طرح ہی سمجھتی تھیں شفیق صاحب کی شادی ان کی والدہ نے اپنی مرضی سے کی تھی شفیق صاحب اور نامہ ابھی بڑھ رہے تھے تو ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا جبکہ کوثر بیگم شفیق کی شادی کے کچھ ماہ بعد نامہ کی ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر اس دنیا سے چلی گئیں شفیق صاحب کو اپنی لاڈلوں میں پلی بہن کے لئے اپنا دوست فیاض پسند آیا اور نامہ باہل کے آنگن سے رخصت ہو کر فیاض احمد کے گھر کی رونق بن گئی۔ شفیق صاحب اور نامہ بیگم کی دو دو اولادیں تھیں شفیق صاحب کے دو بیٹے عمر وانیل اور امان جبکہ نامہ بیگم کی دو بیٹیاں مثل اور مثال جو کہ اب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکے تھے۔

☆☆☆☆

وقت بہت رومی سے چل رہا تھا مثل جب سے واپس آئی تھی اس کا کسی چیز میں دل ہی نہیں لگ رہا تھا ہر وقت ابھی ابھی رہتی اس کے انگیزام سر پر تھے جب بھی کتاب کھولتی معراج سکندر کا ہی عکس دکھتا وہ گھبرا کر کتاب ہی بند کر دیتی اگر انھیں بند کرتی تو

چشم سے اس کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا گھبراہٹ کے مارے وہ کئی کئی گھنٹے چھت کو نکلتی رہتی جب اپنی ہی کیفیت سے تنگ آ جاتی تو بااوپر رونے لگتی وقت بڑا استاد ہوتا ہے سب کچھ سکھایا دیتا ہے مثل نے بھی اس احساس کو محبت کا نام دے ہی دیا وہ جو پہلی نظر کی محبت کو مذاق سمجھتی تھی جب کوئی پہلی نظر کی محبت کے بارے میں بات کرتا تو وہ قہقہے لگاتی مذاق اڑاتی۔

”کبھی پہلی نظر کی محبت ہوتی ہے پہلی نظر میں تو انسان صحیح سے کسی کو دیکھ بھی نہیں سکتا۔“ مگر اب وہ جان گئی تھی کہ محبت اپنا آپ منوالیتی ہے۔

☆☆☆☆

معراج سکندر کی بھی حالت مثل سے مختلف نہ تھی کبھی وہ سوچتا کہ وہ اس سے رابطہ کیسے کرے کبھی سوچتا کہ اس سے ملنے لاہور ہی پہنچ جائے پھر اس نے اپنے سارے ارادے ترک کرتے ہوئے عمر سے بات کرنے کے بارے میں سوچا، اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موبائل اور چابیاں اٹھا کر عمر کے آفس کی طرف ہویا۔

☆☆☆☆

”ارے میرے یار کو آج میری یاد کیسے آ گئی۔“ عمر معراج کے محلے لگتے ہوئے شکوے سے بولا۔

”بس یار کچھ کام ہی ایسا تھا۔“ معراج شرارت سے بولا، عمر نے اسے مصنوعی فحش کے ساتھ دیکھتے ہوئے انٹرکام پر ریفریشنٹ کے لئے کہا اور معراج کی طرف متوجہ ہوا۔

”ہوں تو ایسا کیا کام آن پڑا جو محترم کو ہمیں عزت کا شرف بخشا پڑا۔“ عمر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یار! کبھی میں نہیں آ رہا کہ کہاں سے بات شروع کروں اور کہاں ختم۔“

”اب یار شروع کرے گا ناں تو ختم ہوگی۔“

عمر بولا۔

”عمر! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ معراج کسی بچے کی طرح بولا۔

”ہائے پتر ڈر کس بات کا لگ رہا ہے میں صدقے میں ہوں ناں۔“ عمر بالکل رواجی ماؤں کی طرح بولا۔

”یار کیا ہے تجھے مذاق سمجھ رہا ہے۔“ معراج جھنجھلا کر بولا۔

”اوکے اوکے آئی ایم سیریس بولو کیا بات ہے۔“ عمر مسکراہٹ دباتے ہوئے بولا۔

”یار عمر! مجھے پیار ہو گیا ہے اور تمہیں رشتے لے کر جانا ہے۔“ معراج نے اتنی تیزی سے کہا کہ عمر کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا، عمر گھوم کر اس کی طرف آیا اور کہا۔

”معراج! یار تو ٹھیک تو ہے ناں اور تو نے کیا کہا کہ میں تیرا رشتہ لے کر جاؤں انکل آئی اس فرض کو نبھانے کے لئے موجود ہیں۔“ عمر اس کے پاس دالی چیز پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”ون سیکنڈ عمر میں تمہیں ساری بات سمجھاتا ہوں میں نے بولا ہے کہ مجھے تیری ہیلپ کی ضرورت ہے مجھے جس لڑکی سے پیار ہوا ہے وہ تمہاری کزن ہی ہے شادی میں جو مجھ سے ٹکرائی تھی۔“ معراج نے پوری بات تفصیل سے بتائی۔

”یو مین مثال.....“ عمر حیات اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں یار! مگر پلیز تو میری بے عزتی مت کرنا کیونکہ میں نے سنا ہے کہ بہنوں کے معاملے میں بھائی بہت پوزیسیو ہوتے ہیں پر کونسا میں کوئی فلمی ہوں یار باقاعدہ رشتہ بھیجوں گا۔“ معراج سکندر کے چہرے پر ہلاکی خوبصورت تھی۔

عمر جو کافی دیر سے سنجیدہ چہرہ لئے بیٹھا تھا، چھت بھاڑ قہقہہ لگاتے ہوئے معراج کو گلے لگانے لگا۔

”بار! تو پریشان مت ہو مجھے تجھ پر پورا بھروسہ ہے پانچ سال کی دوستی ہے اتنا تو بھروسہ کر ہی سکتا ہوں کہ بہن کو تیرے سپرد کر دوں۔“ عمر معراج کا شانہ چھتہ پتاتے ہوئے سلی آئیز لہجے میں بولا۔

☆☆☆☆

وہ بھی ایک عام دنوں جیسا ایک دن تھا، مثل جب کالج سے واپس آئی تو اس پر جو انکشاف ہوا اس کے لئے کسی دھچکے سے کم نہیں تھا، صوبہ بیگم کی زبانی اسے چال چل چکا تھا کہ معراج سکندر کا رشتہ مثال کے لئے آیا ہے، لڑکا دیکھا بھالا ہے کسی بات کا کوئی شک و شبہ نہیں اس لئے جواب ہاں ہی میں ہوگا، معراج سکندر کو شفیق صاحب اپنی فیملی ممبر کی طرح ہی سمجھتے تھے اور انہوں نے کبھی بھی اپنے بیٹوں اور اس میں فرق نہیں کیا تھا ان دونوں فیملیز کے تعلقات سبھی آپس میں بہت اچھے تھے مثل اور مثال نے بھی معراج کو دیکھا تو نہیں تھا مگر اس کا ذکر عمر اور امان سے بے انتہا تھا تا جب ہی تو مثل شادی میں اسے پہلی مرتبہ ہی دیکھتے پہچان گئی تھی۔

☆☆☆☆

”بلا کی افراتفری ہے میری ذات میں بے دھیانی میں بھی تیرے دھیان رہتے ہیں“ ”اللہ جی! ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا اگر وہ میری بہن کی قسمت میں تھا تو تو نے میرے دل میں اس کے لئے محبت کیوں ڈالی یا اللہ میں اپنی بہن سے بے حد پیار کرتی ہوں میں اس کے ساتھ دعا نہیں کر سکتی شاید اس کی فیملی کو مثال پسند آئی اور شاید اسے بھی جیسی تو اتنی جلدی رشتہ بھیج دیا۔“ وہ دل ہی دل میں اپنے رب سے ہم کلام تھی وہ جب بھی پریشان ہوتی بہت سی باتیں اپنے رب سے شیئر کرتی۔

”مثل..... مثل“ مثال کی آواز پر اس نے اپنے چہرے کو انگلیوں سے رگڑتے ہوئے چہرے پر

زبردستی مسکراہٹ سجائی تھی۔

”مثل! میں تمہیں کب سے آوازیں دے رہی تھی کن سوچوں میں تم نہیں۔“ مثال بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں کچھ بھی نہیں تم کہو کوئی کام تھا کیا۔“

”کام تو نہیں تھا بس تم سے کچھ بات کرنی تھی۔“ مجھے پتا ہے تمہیں کیا بات کرنی ہے امی نے مجھے سب بتا دیا ہے مثال تم بہت لگی ہو جو تمہیں معراج سکندر جیسا لائف پارٹنر ملا۔ مثال میں تمہارے لئے بے حد خوش ہوں اللہ تمہیں وہ سب خوشیاں دے جو تم ڈیزر کرتی ہو۔ مثل اپنی ہی جھن میں اپنے ترتیب دیئے گئے الفاظ بولے جا رہی تھی شاید وہ مثال کے چہرے پر چھائی تاریکی نہیں دیکھ پائی تھی۔

☆☆☆☆

رات کا پچھلا پہر تھا وہ لان کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں کھڑی چاند کے آس پاس چمکتے ستاروں کو بڑی غور سے دیکھ رہی تھی۔ دل عجیب ہی اداسی میں لپٹا ہوا تھا زندگی میں یوں تو بہت نازک مرحلے آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں مگر ایک مرحلہ ایسا ہوتا ہے جسے انسان زندگی بھر نہیں بھول سکتا وہ مرحلہ ہے جب کسی کا دل ٹوٹ جاتا ہے کاش یہ نازک مرحلہ کسی پر نہ آئے کیونکہ درد کا احساس وہی جانتا ہے جس کے چوٹ لگتی ہے اور دل میں گھاؤ پڑتا ہے۔

”اے خدا کاش! یہ وقت کسی پر نہ آئے۔“ سوائے دکھ اذیت اور کرب کے سوا کچھ نہیں تھا اس کی نیند اس سے روٹھ چکی تھی جو آنکھیں ہمیشہ مسکرائی تھیں وہاں اداسیوں نے ڈھیرے ہمار کھے تھے اس نے اپنے چہرے پر پھیلے اشکوں کو بے دردی سے انگلیوں سے صاف کیا اور کھڑکی بند کر کے مثال کے پہلو میں لیٹ گئی۔

☆☆☆☆

مثل کی حالت کسی سے بھی چھپی نہیں تھی وہ سارا

بارادن کھوئی کھوئی رہتی اگر کوئی بات کرتا تو اچھے اچھے جواب دیتی چھوٹی چھوٹی باتوں پر باقاعدہ رونا شروع کر دیتی سب اس کے رویے کی وجہ سے پریشان تھے مثل لان میں بیٹھی ڈوبتے ہوئے سورج اور گھروں کو لوٹتے ہوئے پرندوں کو بڑی غور سے دیکھ رہی تھی جب پاس پڑے سیل نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانی۔

”امان کالنگ۔“ دیکھتے ہی وہ جیسے بکھرنے لگی تھی امان اور مثل دونوں بیسٹ فرینڈ تھے مثل نے امان سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی مثال کی متنگی کے بعد آج اس نے کال کی تھی۔

”ہیلو ڈیر مثل! کیسی ہو لگتا ہے لاہور والے اتنے بے مروت ہو گئے کہ ہم جیسے زندہ دل لوگوں کو بھول ہی گئے۔“ مثل کے ہیلو کہتے ہی امان شروع ہو گیا۔

”تمہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بس پارا ایگزام جیل رہے ہیں اس وجہ سے۔“ مثل نے کمزور سی وضاحت دی۔

”مثل! تمہاری آواز کو کیا ہوا تم ٹھیک تو ہو نا۔“ امان کے لہجے میں حد سے زیادہ فکر مندی تھی۔ ”نہیں کچھ بھی نہیں بس ایسے ہی مثل آہستگی سے بولی۔

”ایسے کیسے کچھ بھی نہیں یا تم مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو ایسی کیا بات ہے۔“ امان کے کہنے کی دیر بھی مثل بچکیوں سے روٹنے لگی امان کی تو جان پر بن آئی۔

”مثل! کول ڈاؤن کچھ بولو گی کہ بس آج رونے کا مثل فرماتی رہو گی۔“ پھر مثل نے امان کو بچکیوں کے درمیان ساری بات بتادی، مگر وہ اس بات سے بالکل غافل تھی کہ اس کے دل کے ساتھ کسی اور کا دل بھی ٹوٹا ہے جب دل ٹوٹتا ہے تو آواز نہیں آتی پر درد بہت ہوتا ہے پر کبھی کبھی آپ کو وہ درد برداشت

کرنا پڑتا ہے اور کسی کے لئے نہ سہی اس انسان کے لئے جس سے آپ پیار کرتے ہیں اس کے لئے امان شفیق احمد نے بھی یہ درد بس کر سہا تھا صرف مثل فیاض کے لئے۔

☆☆☆☆

امان نے لاہور آنے کی بہت کوشش کی کہ وہ سب سے بات کرے گا یا وہ عمر سے بات کرے گا مگر مثل نے اسے اپنی قسم دے کر روک لیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا اس لئے وہ فی الحال خاموش تھا۔ مثل اور مثال دونوں صبح سے کاموں میں لگی ہوئی تھیں آج معراج سکندر کے گھر والے متنگی کی رسم کرنے آ رہے تھے ان کے ساتھ ہی نانہ بیگم اور عمر بھی آ رہے تھے امان نے مثل کو دوبارہ فون کر کے عمر کو سب بتا دیئے کو کہا، لیکن وہ نہیں مانی اور اس نے لڑجھک کر فون ہی بند کر دیا۔

”بیٹا! وہ لوگ بیٹھنے والے ہوں گے اب تم دونوں نہادھو کر کپڑے پہن لو اور ہاں مثل بہن کو اچھے سے تیار کرنا اور مثال تمہارا چہرہ کیوں اتنا مرجھایا ہوا ہے ابھی بیٹا ہم کون سا تمہیں رخصت کر رہے ہیں جو تم اتنی پریشان ہو۔“ صوبہ بیگم ضروری ہدایت کے ساتھ مثال کو ریلیکس کرنے کی کوشش کرنے لگیں۔

”امی! مثال کے سسرال سے کتنے لوگ آ رہے ہیں۔“ مثل نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوال کیا صبح سے لے کر اس کا یہ پہلا سوال تھا اور پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ کہیں وہ دشمن جاں بھی تو ساتھ نہیں آ رہا۔

”بیٹا معراج کی ماں بہن اور ایک چھوٹا بھائی ہے۔“ صوبہ بیگم مختصر جواب دیتے ہوئے نماز کے لئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆☆

متنگی کی رسم مختصر تھی سب گھر کے ہی لوگ موجود تھے بریڈ بیگم (معراج کی والدہ) نے مثال

کو انگوٹھی پہنائی حنزہ اور مریم نے اس لمحے کو اپنے موبائلز میں قید کیا انہوں نے مثل کو بھی زبردستی ساتھ بٹھا کر تصویر بنائی عمر آج بہت خوش تھا کہ اس کی اور معراج کی دوستی رشتے داری میں بدل گئی اور پھر ایک خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا مثال کا تو چپ رہنا بنتا تھا لیکن مثل اتنی خاموش کیوں تھی یہ بات عمر کے ساتھ ساتھ نامہ بیگم نے بھی نوٹ کی تھی۔

☆☆☆☆

حنزہ آگے اور معراج اس کے پیچھے ایک گھٹنے سے معراج مریم اور حنزہ کی منٹیں کر رہا تھا کہ اسے منگنی کی تصویریں دکھادیں۔ لیکن وہ دونوں آج اسے ستانے کہ فل موڈ میں تھے۔

”بھائی ایک شرط پہ میں آپ کو تصویریں دکھاؤں گا۔“ حنزہ نے بڑے احسان جتانے والے انداز میں کہا۔

”یارتو مجھے تصویریں دکھا دے تو جو بولے گا میں کروں گا۔“

”تو پھر ٹھیک ہے تو میرا لپ ٹاپ ڈن ہے۔“

حنزہ نے اپنی شرط بتائی۔

”اوکے ڈن۔“ معراج نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تو یہ دیکھیں اپنی ہونے والی شریک حیات کی تصویریں۔“ حنزہ نے موبائل معراج کے ہاتھ میں دیا۔ معراج ایک ایک تصویر آگے کر رہا تھا مگر وہ جس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا وہ تو کہیں نہیں تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے وہ تصویریں تیزی سے آگے کر رہا تھا ایک تصویر میں وہ سادہ نظر آ رہی تھی اس کے اعصاب کام کرنا چھوڑ چکے تھے۔

”بھائی آپ اس طرح تصویر کیوں دیکھ رہے ہو آریو اوکے۔“ حنزہ نے معراج کا کندھا ہلایا۔ وہ ایک دم حواس میں لوٹا۔

”حنزہ میری بات سنو۔“ وہ یکدم اس کی طرف

متوجہ ہوا۔

”ان دونوں لڑکیوں میں سے میری منگنی کس کے ساتھ ہوئی ہے؟“ معراج نے موبائل حنزہ کے ساتھ کیا۔

”بھائی اس کے ساتھ۔“ حنزہ نے مثال کی پک کی طرف اشارہ کیا۔ معراج سکندر کچھ پل کے لئے تو ساکت رہ گیا لیکن حنزہ کے پکارنے پر تیزی سے صوفے سے اٹھا میز سے چایاں لیں اور کچھ دیر بعد اس کی گاڑی عمر دانیال کے آگے کے باہر تھی۔

☆☆☆☆

”عمر یہ سب کیا ہے؟“ معراج سکندر تیزی سے روم میں داخل ہوا اور اس تیزی سے موبائل عمر کے سامنے پھینکا تھا عمر نیچر صاحب سے کوئی ضروری فائل ڈسکس کر رہا تھا وہ معراج کے اس طرح ری ایکٹ کرنے پر سخت شرمندہ ہوا۔

”عمر ان صاحب اس فائل کو ہم بعد میں ڈسکس کرتے ہیں۔“ عمر نے فائل بند کر کے عمران صاحب کو پکڑائی عمران صاحب فائل لے کر جا چکے تھے تو وہ معراج کی طرف متوجہ ہوا۔

”قیامت آگئی ہے کیا جو جاہلوں کی طرح ری ایکٹ کر رہے ہو۔“ عمر دانت پیٹتے ہوئے بولا۔

”ہاں آگئی ہے قیامت۔“ معراج حلق کے بل چیخا تھا۔

”یہ دیکھو یہ لڑکی کون ہے جس سے تم نے میری منگنی کرا دی۔“ معراج نے موبائل اسکرین پر مثال کی تصویر دکھائی۔

”دہات ڈیو مین یہ لڑکی کون ہے یہ مثال ہے اور کون ہے۔“ عمر نے نا بھی کہ عالم میں کہا۔

”اگر یہ مثال ہے تو یہ کون ہے؟“ معراج نے عمر کو مثل کی تصویر دکھائی۔

”یہ مثل ہے مثال کی چھوٹی بہن۔“ عمر کے انکشاف سے تو معراج کو گویا چودہ طبق روشن

ہو گئے۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہی نہیں رہا اور بولا بھی تو کیا۔

”مجھے مثال سے نہیں مثل سے شادی کرنی ہے۔“

”دہات نان سینس تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں تمہارے لئے شاید رشتے مذاق ہیں۔“ معراج کی بات پر عمر ہکا بکا رہ گیا۔

”یار عمر! تو سمجھ نہیں رہا۔“

”کیا سمجھوں یہی کہ پہلے تمہیں مثال سے محبت ہوئی اور اب مثل کی تصویر دیکھی تو شرم آئی چاہئے تمہیں ایک بہن کا بھائی تو بھی ہے۔“ عمر کا غصے کی شدت سے چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

”عمر ایک دفعہ میری بات سن لو بعد میں جو بولنا ہو بول لیتا پلیز مجھے غلط مت سمجھو میں نے تم سے مثال کی نہیں مثل کی بات کی تھی اس دن شادی میں مجھ سے مثال نہیں مثل لگائی تھی اور اس دن آج پر تم نے یہی بولا کہ وہ مثال ہوگی غلطی میری بھی ہے کہ میں نے کنفرم نہیں کیا اور رشتہ بھیج دیا اب تک اگر میں تصویر نہ دیکھتا تو میں یہی سمجھتا کہ مثال ہی وہ لڑکی ہے پلیز تم مجھ سے بدگمان مت ہو یہ سب کچھ غلط فہمی سے ہوا ہے۔“ معراج جو پہلے غصے میں تھا اب منتوں پر اتر آیا تھا۔

”تو اب کچھ نہیں ہو سکتا جو ہوتا تھا ہو چکا۔“ عمر کو رہ رہ کر معراج کی لاپرواہی پر غصہ آ رہا تھا۔

”پلیز عمر! اس طرح مت بولو میں مر جاؤں گا یار میں اگر شادی کروں گا تو صرف مثل سے ورنہ میں جان دے دوں گا۔“ معراج تو عمر کے رویے سے باقاعدہ رونے والا ہو گیا۔ معراج کو دیکھ کر عمر کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ عمر کا ایک ہی دوست تھا معراج جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا اور اسے کھوٹا نہیں چاہتا تھا۔

”اچھا کول ڈاؤن تم بیٹھو یہاں۔“ عمر نے پانی کا گلاس پکڑتے ہوئے اسے ریلیکس کرنے کی کوشش

کی۔

”میں کچھ سوچتا ہوں تم گھر جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور پریشان مت ہونا۔“ عمر نے معراج کو تو تسلی دے کر بھیج دیا لیکن خود اس سے بھی زیادہ پریشان تھا۔

☆☆☆☆

”بھائی کیا ہوا؟ آپ بہت پریشان دکھائی دے رہے ہیں۔“ عمران میں بہت پریشان بیٹھا تھا جب امان کی آواز پر چونک گیا۔

”بھائی ایوری تھک ازاو کے؟“ امان پاس والی چیئر پر بیٹھے ہوئے بولا۔ عمر بہت ٹینشن میں تھا۔ اس لئے اسے یہی بہتر لگا کہ امان کے ساتھ اس پر اہم کو شیئر کر لیتا چاہئے عمر نے ساری بات امان کے گوش گزار کر دی۔

”اب تم ہی بتاؤ امان میں کیا کروں ایک طرف دوست ہے اور دوسری طرف بہن سوچتا ہوں اس طرح مثال کتنی ہرٹ ہوگی۔“ عمر نے تھک کر کرسی سے ٹیک لگائی تھی امان پوری بات سن کر قدرت کی کایا پلٹ کر حیران تھا۔

”بھائی اس طرح مثال بھی تو معراج کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اس طرح ایک نہیں چار زندگیاں تباہ ہوں گی۔“

”کیا مطلب؟“ عمر کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”مطلب یہ ایک مثال کی زندگی پھر معراج اور مثل کی اور چوتھی اس انسان کی جس سے مثل کی شادی ہوگی۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو صاف صاف کہو۔“

”بھائی مثل بھی معراج سے پیار کرتی ہے ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے اللہ تعالیٰ نے محبت ڈالی ہے یہ اتفاق نہیں ہو سکتا اور وہ دونوں اس بات سے بالکل بے خبر ہیں کہ وہ دونوں

ایک دوسرے کے لئے ایک جیسے جذبے رکھتے ہیں اب اگر اس مسئلے کا حل نہ نکالا تو کوئی نہ کوئی تو پاگل ہو ہی جائے گا۔

”خاص کر میں تو ضرور ہو جاؤں گا۔“ عمر نے اپنی کپٹیاں دباتے ہوئے کہا اور پھر وہ دونوں پلان کرنے لگے کہ کیا کرنا ہے اس پلان میں زیادہ تر کردار امان کا ہی تھا کسی کو تو محبت کی قربانی دینی ہی تھی سو امان محبت کے سامنے جھک گیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ بیڈ پر بیٹھی مثال کی طرف متوجہ ہوئی۔
”مثال! کیا بات ہے تم کچھ پریشان ہو جس دن سے تمہاری منگنی ہوئی ہے تم بہت کھوٹی کھوٹی سی رہتی ہو۔“ مثال جوابی ہی سوچوں میں گم تھی مثال کی بات پر چونک گئی۔

”نہیں..... نہیں مثال! ایسی تو کوئی بات نہیں تمہیں ضرور کوئی وہم ہوا ہے۔“ مثال مختصر جواب دے کر واش روم میں گھس گئی۔ شاید وہ بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھی مثال کو خاموش کمرے میں وحشت سی ہوئی تو وہ اٹھ کر ٹیبلر کی طرف چل دی۔

☆☆☆☆

”امی! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ نامہ بیگم عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر جاء نماز تہہ کر رہی تھیں کہ امان ان کے کمرے میں چلا آیا۔
”آؤ بیٹھو بیٹا! کیا بات کرنی ہے؟“ نامہ بیگم نے بیکے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”امی! آپ ناراض تو نہیں ہوں گی۔“ امان پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”اگر ناراض ہونے والی ہوئی تو ضرور ہوں گی۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

”امی! میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ امان ڈرتے ڈرتے بولا۔

”تو بیٹا اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے تم لڑکی

کا نام بتاؤ اگر مجھے پسند آئی تو میں نہ نہیں بولوں گی۔“
”امی لڑکی تو آپ کو بہت پسند ہے مگر.....“
”مگر کیا بیٹا؟“

”امی اس کا نام مثال ہے۔“ امان نے نام ہی نہیں لیا تھا گویا نامہ بیگم کے سر پر بم پھوڑا تھا وہ کچھ کہنے سننے کے قابل ہی نہیں رہی تھیں کچھ دیر کے لئے کمرے میں گہرا سناٹا چھا گیا تھا جسے امان کی آواز نے ہی توڑا تھا۔

”امی! میں مثال سے پیار کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“ امان نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

”امان! تمہیں شرم آتی چاہئے اس طرح کی باتیں کرتے ہوئے تمہیں ذرا بھی اندازہ ہے کہ تم کیا بول رہے ہو مثال کی منگنی ہو گئی ہے اور کچھ ہی عرصے بعد اس کی شادی ہونے والی ہے۔“ نامہ بیگم صدمے سے بولیں۔

”امی میں کچھ نہیں جانتا میں اگر شادی کروں گا تو صرف مثال سے اگر آپ نے ماموں سے بات نہیں کی تو میں خود ان سے بات کروں گا انہوں نے انکار کر دیا تو میں یہ ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چلا جاؤں گا۔“ وہ ماں تھیں امان کی دھمکی پر ان کا دل تڑپ اٹھا تھا۔

”امان! یہ کیا بدتمیزی ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم اس عمر میں کیوں مجھے بے عزت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“ نامہ بیگم روتے ہوئے بولیں۔

ماں کہ آسودہ دیکھ کر امان کہ دل کو کچھ ہوا تھا لیکن اسے یہ سب کرنا تھا بہت سارے دل ٹوٹنے سے بچانے تھے۔

”امی پلیز! آپ ماموں سے بولیں کہ وہ معراج کی فیملی کو کچھ بھی بہانہ بنا دیں۔“ امان نے بات ختم کی اور کمرے سے نکل گیا وہ ماں کہ اور آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا اور نامہ بیگم ساکت بیٹھی بند

دروازے کو دیکھتی رہیں۔

☆☆☆☆

نامہ بیگم نے امان کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کی سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھا تھک ہار کر نامہ بیگم نے عمر سے بات کی تو اس نے بھی یہی حل بتایا کہ ماموں کی فیملی سے بات کر لینی چاہئے نامہ بیگم معراج کی فیملی کو لے کر پریشان تھیں تو عمر نے تسلی دی کہ وہ دیکھ لے گا پھر نامہ بیگم عمر کے ساتھ کراچی سے لاہور روانہ ہو گئیں۔

☆☆☆☆

جاتے ہوئے عمر معراج کو کال کرنا نہیں بھولا تھا۔

”یار ایک آدھ دن میں ماموں تم لوگوں کو انکار کے لئے فون کر س گئے پلان کہ مطابق تم آئی کو تیار رکھنا اور پلیز کوئی گڑبدمت کرنا۔“ عمر نے بات مکمل کر کے کال کاٹ دی۔ عمر کو اس طرح سب کو دھوکے میں رکھنا اچھا تو نہیں لگ رہا تھا لیکن ان رشتوں کا کیا فائدہ جن میں محبت نہیں بس بھجوتا ہو۔

☆☆☆☆

نامہ بیگم کا یوں اچانک بتائے بغیر آنا سب کو تشویش میں مبتلا کر رہا تھا رات کے کھانے کے بعد سب لوگ ایک کمرے میں جمع ہو گئے مثال اور مثال دونوں اپنے کمرے میں چلی گئیں نامہ بیگم نے ساری بات فیاض صاحب اور صوبہ کے سامنے رکھ دی تھی اور غصہ بھلا کے اپنے بیٹے کی خوشیوں کی بھیک مانگتی تھی وہ نہیں جانتی تھیں کہ ان کا بیٹا کتنی بڑی قربانی دے رہا ہے وہ بھی اپنی محبت کی قربانی عمر فیاض صاحب کی پریشانی کا اندازہ لگا سکتا تھا وہ نہ تو بہن کو چھوڑ سکتے تھے اور ایک شریف اور اصول پسند انسان ہونے کے ناطے اپنی زبان سے بھی نہیں نکال سکتے تھے۔

”ماموں آپ معراج کی فیملی کے بارے میں

سوچ رہے ہیں ناں۔“ عمر فیاض صاحب کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

”بیٹا پریشانی کی تو بات ہے اگر امان ہمیں سب کچھ بتا دیتا تو معاملہ یہاں تک نہ پہنچتا۔“
”ڈونٹ وری ماموں میں دیکھ لوں گا آپ ان لوگوں کو فون کر دیں باقی میں سنبھال لوں گا۔“
”نہیں بیٹا! میں ان لوگوں سے بات نہیں کر سکتا مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے۔“ فیاض صاحب جھکے ہوئے لہجے میں بولے۔

”کوئی بات نہیں ماموں! مای خود ہی سہرینہ آئی سے بات کر لیں گی۔“ عمر نے بات کا رخ صوبہ بیگم کی طرف کیا۔

”میں کیسے صوبہ بیگم۔“ روپائی ہوئیں۔
”مامی اب کسی کو تو بات کرنی ہے ناں پلیز یہ کام آپ کو ہی کرنا ہے۔“

”ٹھیک ہے بیٹا میں کر لوں گی۔“ بات نامہ بیگم کو اس وقت بھائی اور بھابھی کی محبت پر رشک محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆☆

معراج آفس سے سیدھا گھر ہی آیا تھا اور آتے ہی سہرینہ بیگم کو آوازیں دینے لگا وہ جو بچن میں ملازمہ کو ضروری ہدایت دے رہی تھیں معراج کی آواز پر بچن سے باہر آئیں۔

”ارے بیٹا! اتنے بے صبر کیوں ہو رہے ہو آ رہی ہوں۔“

”ماما! بات ہی کچھ ایسی ہے۔“

”کیا بات ہے بولو۔“ وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

”امی! کچھ ہی دیر میں میرے سسرال سے آئی میں فیاض انکل کے گھر سے کال آئے گی۔“
”تو بیٹا اس میں پریشان ہونے والی کیا بات

”ماما بات پریشان ہونے والی ہے اب میں آپ کو جیسا بولوں گا آپ ویسا ہی بولیں گی۔“ اور پھر معراج نے سبرینہ بیگم کو ساری بات لفظ بہ لفظ بتادی وہ تو اس کی بات سن کر ہکا بکارہ گئیں مگر وہ معراج ہی کیا جو کسی کو قائل نہ کر سکے۔

☆☆☆☆

صوبہ بیگم نے کال کر تو لی تھی لیکن بات کرنے کے لئے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے پھر سبرینہ بیگم نے ہی بات کا آغاز کیا۔

”صوبہ بہن! آپ جو بات کرنا چاہتی ہیں بلا جھجک کریں اگر مثال کے بارے میں کوئی بات کرنی ہے تو آپ صاف صاف بولیں وہ آپ کی بیٹی ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا آپ کو پورا حق ہے۔“ سبرینہ بیگم کی باتوں سے صوبہ کے دل کو ڈھارس ملی تھی اور انہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”دراصل بات یہ ہے کہ ہم مثال کا رشتہ امان سے کرنا چاہتے ہیں ہم لوگ نامہ کو دیکھی نہیں دیکھ سکتے اس لئے ہم لوگ آپ سے مغفرت چاہتے ہیں۔“ صوبہ بیگم نے بھیجتے ہوئے بات مکمل کر دی۔

”صوبہ بہن! میں یہ تو نہیں جانتی کہ اس سب کے پیچھے وجہ کیا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ ہمیں خالی ہاتھ مت لوٹانے ہمارے لئے مثال اور مثال میں کوئی فرق نہیں! اگر مثال کے رشتے کو لے کر آپ لوگوں کو خاندان میں کوئی مسئلہ ہے تو مثال بھی ہمارے بچوں کی طرح ہے ہمارے لئے یہ اعزاز کی بات ہوگی کہ ہماری رشتے داری آپ لوگوں کے ساتھ قائم رہے۔“ صوبہ بیگم ان لوگوں کی اچھائی کے آگے کچھ دیر کے لئے تو کچھ نہ بول سکیں پھر ہمت کرتے ہوئے بولیں۔

”ہم لوگ آپ کو سوچ کر بتائیں گے۔“ اور اللہ حافظ کہہ کر کال کاٹ دی۔

”ماما آئی لو یو سوچ۔“ معراج سبرینہ بیگم کے

ہاتھ پر بوسہ دیتے ہوئے خوشی سے بولا۔

”معراج یہ سب ٹھیک نہیں ہے۔“

”ماما سب ٹھیک ہو جائے گا آپ مینش مت لیں۔“ وہ انہیں گلے لگاتے ہوئے بولا۔

☆☆☆☆

عمر نے یہ نیوز امان کو دے دی تھی اس کے لئے اب سب سے اہم کام معراج اور مثال کے رشتے کے لئے سب کو راضی کرنا تھا اور اب وہ یہ کام انجام دینے کے لئے فیاض صاحب کے کمرے کی طرف چل دیا۔

”ماموں آپ بڑی تو نہیں ہیں میں اندر آ سکتا ہوں۔“ عمر نے دروازہ ناک کرتے ہوئے کہا۔

”آؤ بیٹا۔“ فیاض صاحب بیڈ کریک سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے عمر بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

”ماموں مجھے معراج والے رشتے کے بارے میں آپ سے بات کرنی ہے۔“

”ہاں بیٹا تمہاری ماما نے مجھ سے بات کی ہے ان لوگوں کی خواہش کے بارے میں اس بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”ماموں! جہاں تک مجھے لگتا ہے ہمیں ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہئے جہاں تک میں سوچتا ہوں ان لوگوں کا رد عمل اس بات کو لے کر غلط ہونا چاہئے تھا لیکن ان لوگوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پرپوزل مثال کے لئے دے دیا۔“ عمر کو یہ سب کچھ گرتے ہوئے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن مجبوری انسان سے سب کچھ کروا دیتی ہے۔

”ٹھیک ہے بیٹا! جیسے تمہیں بہتر لگے پر کیا مثال مان جائے گی۔“

”ڈونٹ وری میں اس سے بات کرتا ہوں۔“ عمر کہتے ہوئے اٹھ گیا۔

☆☆☆☆

جب عمر نے مثال اور مثال کو آمنے سامنے بیٹھا کر بات کی تو وہ دونوں تو دنگ رہ گئیں مثال کے

امان کی فیلنگ مشکل کا رشتہ معراج سکندر نے وہ بھی اس کی فیلنگ کی مرضی سے ان دونوں کے لئے یہ پروجیشن بہت عجیب تھی! کچھ دیر کے لئے تو کمرہ خاموشی کی زد میں آ گیا اور پھر مثال نے ہی ہمت کی۔

”How is possible اور امان اس نے تو مجھ سے اس بارے میں کبھی کچھ شیئر نہیں کیا اور میں معراج سکندر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ مثال کے تو مانو پاپلیٹ روشن ہو گئے۔

”مثال مثال پلیز پروجیشن کو سمجھنے کی کوشش کرو! ماماں بہت پریشان ہیں امان کی حرکت کو لے کر وہ بہت ڈسٹرب ہیں تم دونوں جو بھی فیصلہ کرنا ماموں کے بارے میں سوچ کر کرنا تم دونوں کے پاس سوچنے کے لئے وقت ہے میں اب چلتا ہوں۔“

☆☆☆☆

مثال تو اس سارے واقعے میں خاموش ہی تھی تابانے کن سوچوں میں گم تھی کہ مثال نے اسے کدھے سے بلایا۔

”مثال! تم پریشان مت ہو اگر تم یہ شادی نہیں کرنا چاہتیں تو میں پاپا سے بات کروں گی اور امان کو بھی سمجھاؤں گی۔“

”مثال پلیز مجھے معاف کر دو۔“ مثال مشکل کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے بیٹھی تھی۔

”تم مجھ سے کیوں معافی مانگ رہی ہو۔“ وہ اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

”میں جانتی ہوں تم امان سے پیار کرتی ہو ناچ میں مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا میں تو امان کی فیلنگ کے بارے میں بھی نہیں جانتی تھی بس تم مجھے معاف۔“

”دن سیکنڈ یہ تم کیا بول رہی ہو میں اور امان سے پیار ایسا نہیں ہے وہ صرف میرا بیٹ فرینڈ ہے جسٹ فرینڈ۔“ مثال حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”مگر میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ تم امان سے اس لئے تو میں نے۔“

”تم نے کیا۔“ مثال نے مثال کی ادھوری بات کو مکمل کرنا چاہا۔

”اسی لئے تو میں نے معراج سکندر کے رشتے کے لئے ہاں کہہ دی۔“

”اوہ میرے خدایا اور میں اب تک یہی سمجھ رہی تھی کہ تم معراج میں انٹر سٹڈ ہو کتنی غلط فہمی ہو گئی تھی اگر امان ہمت نہیں کرتا تو۔“ مثال نے دونوں ہاتھوں میں سر پکڑا تھا۔

”اچھا چھوڑو یہ بتاؤ تم نے معراج سکندر والے پرپوزل کے بارے میں کیا سوچا۔“ اصل مشکل تو مثال کے لئے اب آئی تھی وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کہیں معراج سکندر مثال میں انٹر سٹڈ تو نہیں ہے۔

”کیا ہوا کیا سوچ رہی ہو۔“ مثال کی آواز پر وہ چونکی۔

”I don't know! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”مثال! تم بہت لکی ہو کہ تمہیں معراج سکندر جیسا لائف پارٹنر مل رہا ہے یہ تمہارے ہی الفاظ ہیں ہاں تو پھر جھجک کس بات کی تم یہ بھول جاؤ کہ معراج کی ممکنہ مجھ سے ہوئی تھی تو تمہیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔“ مثال یہ کہنے کے ساتھ ہی اٹھ گئی شاید وہ یہ سوچ رہی تھی کہ مثال کو سوچنے کے لئے تنہائی چاہئے۔

☆☆☆☆

”میرے اللہ! میں اپنی قسمت کا ہر فیصلہ تجھ پر چھوڑتی ہوں معراج سکندر کو مجھ سے اس طرح ملانے میں شاید تیری کوئی مصلحت ہو تو میرا رب ہے میرے لئے جو فیصلہ کرے گا بہتر کرے گا۔“ مثال دعا سے فارغ ہو کر سیدھا مثال کے پاس گئی۔

”مثال! امی کو بول دو کہ میں اس رشتے کے

لئے راضی ہوں۔“ وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی نماز کہ اسٹائل میں چہرے کے گرد لپٹے میرون دو بیٹے میں مثال کو وہ بہت معصوم لگی تھی۔
”اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے۔“ مثال اس کا گال چومتے ہوئے خوشی سے بولی اور ماما کے کمرے کی طرف دوڑتی مثال بھی امان کو فون کرنے کی غرض سے لان میں چلی گئی اب اس کی ٹانگ بھی تو جھنجھتی تھی۔

☆☆☆☆

”قسم سے امان مجھے تم سے ہرگز ایسی توقع نہیں تھی تم نے مجھ سے چھپایا اس لئے معراج والے رشتے سے مرے جا رہے تھے۔“ مثال نے معنوی خفگی سے کہا۔
”ہاں تو تم بھی تو معراج کے لئے مری جا رہی تھیں ناں۔“ امان نے حساب برابر کیا۔
”ون سیکنڈ کیا یہ سب تم نے۔“

”اوہو میڈم اتنی خوش بھی اچھی نہیں ہوتی میں کیوں تمہارے لئے اپنی زندگی برباد کر دوں گا۔“
”امان تم بہت برے ہو۔“ مثال رو ہاں ہوئی۔
”مثقل۔“ امان کی ٹھمبھیری آواز مثال کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”مجھے بھی بھول تو نہیں جاؤ گی صرف تم ہی میری بیسٹ فرینڈ ہو پلیز مجھے بھی نہ بھلانا۔“ مثال کو ناجانے کیوں امان کی آواز پھٹکی پھٹکی محسوس ہوئی تھی۔
”امان از اپوری ٹھنک او کے؟“

”کیا یار! اموشی ڈائلاگ بھی نہیں بولنے دیتی ہو۔“ وہ سٹپلے ہوئے بولا۔

”امان کے بچے ایک دفعہ تم میرے بہنوئی بن جاؤ پھر میں سالی بن کر تم سے خوب بدلے لوں گی۔“

”ارے سالی سے یاد آیا میری بہن کو دیکھو اس نے بھی مجھ سے کچھ شیر نہیں کیا۔“ مثال شکوہ کنناں لہجے میں بولی۔

”کیا نہیں بتایا۔“

”بہن کی کہ وہ بھی تم سے پیار کرتی ہے۔“

”کیا وہاں۔“ امان ایک دم اچھل پڑا۔

”آئی کانت بلیو دس اس نے کبھی کچھ کہا کیوں نہیں۔“

”کیونکہ وہ پاگل یہ سمجھتی تھی کہ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“ مثال ٹھٹھکا کر بولی امان کے اندر چھن کر کے کچھ ٹوٹا تھا۔

”ہاں مگر اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ تم پاگل معراج سکندر سے پیار کرتی ہو۔“ وہ جل کر بولا۔

”اچھا اب میں فون بند کر رہی ہوں امی بلا رہی ہیں اللہ حافظ۔“ اس نے کہتے ساتھ ہی فون بند کر دیا امان کہ اندر ڈھیروں سکون اتر آیا تھا کہ وہ مثال اور معراج کو ہی نہیں مثال کو بھی انجانے میں ہی سہی اس کی محبت دلوانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ جانتا تھا مثال ایک محبت سے گندمی ہوئی لڑکی ہے وہ جلد اسے اپنا بنا لے گی۔

☆☆☆☆

شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں ہر طرف شاپنگ کے ڈھیر تھے مثال اور مثال کی شادی ایک ہی دن رکھی گئی تھی جس پر معراج نے بہت داد دیا مچایا کہ عمر امان کی برات کے ساتھ چلا جائے گا اس لئے اس کی شادی ایک دن بعد رکھی جائے تاکہ وہ عمر کو ساتھ لے جا سکے پھر عمر نے ہی اسے بھلایا پھسلا یا کہ برات جانی تو ایک ہی جگہ ہے ناں تو وہ جاتے ہوئے امان کے ساتھ جائے گا اور آتے ہوئے اس کے ساتھ اس لئے وہ منت سماجت کے بعد مان گیا ان دونوں کی رخصتی ایک ساتھ ہوئی تھی مثال نے تو رد و کر برا حال کر لیا تھا دونوں بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت فیاض صاحب کی آنکھیں بار بار نم ہو رہی تھیں بہر حال یہ مشکل مرحلہ بھی تہہ ہوا اور ساری رسموں کے بعد اب مثال کو روم میں لایا گیا۔

☆☆☆☆

وہ پورے کمرے کا بغور جائزہ لے رہی تھی پورا لہر فیش گلابوں سے ڈیکوریٹ کیا گیا تھا ماحول میں گلاب کی بھٹی بھٹی خوشبو رچی ہوئی تھی وہ صبح سے بند بیٹھ کر تھک چکی تھی وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے انھیں موندے ارد گرد سے اتنی بے نیاز تھی کہ اُن نے الے کی آمد بھی محسوس نہ کر سکی معراج کھڑا مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا وہ پھولوں میں بیٹھی پھولوں کا مہر ہی لگ رہی تھی اس کی نظروں کا ارتکاز تھا شاید کہ اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں اور جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی۔

”آئی ایم سوری میں تھک گئی تھی تو اس لئے۔“
”وضاحت دینے لگی۔“

”کوئی بات نہیں اس میں شرمندہ ہونے والی کیا بات ہے۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھے ہوئے بولا مثال نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کتنا پرنیکٹ ہے یہ انسان جس کے ساتھ کے کچھ ہی دنوں میں میں نے کتنے سنے بجائے اور بھرائے رب سے اسے بھول جانے کی قسمیں دے لیں لیکن آج وہ میرے سامنے ہے صرف میرا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی خواب ہو۔“ اس کی ٹھمبھیر آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ جیسے خوابوں کی دنیا سے باہر آئی۔

”مثقل! تمہیں پتا میرے لئے ایسا ہے جیسے کوئی خواب ہو بہت مشکلوں کے بعد لی ہو تم مجھے ایک بل کے لئے تو ایسا لگا کہ میں نے تمہیں کھو دیا ہے۔“

”کیا مطلب مجھے آپ کی کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔“ مثال کی حیرانگی انتہا پر تھی۔

”ارے واہ سبز معراج سکندر میں کس کرب سے گزر رہا ہوں آپ کو اندازہ ہی نہیں ہے۔“ معراج مصنوعی خفگی سے بولا۔

”کرب کیسا کرب؟“ پھر معراج نے اسے

پوری بات حرف بہ حرف بتائی سوائے اس کے کہ امان کا رشتہ لے کر جانا ان کی پلاننگ تھی وہ امان نے معراج کو منع کیا تھا کہ یہ بات ہمیشہ ان تینوں کے درمیان دہنی چاہئے۔

وہ حیران کی بیٹی اس کا چہرہ تک رہی تھی۔
”ایسے کیا دیکھ رہی ہو ج بول رہا ہوں اگر میں اس دن والی تصویریں نہ دیکھتا تو میں تمہیں ہمیشہ کے لئے کھودیتا۔“ وہ لہجے میں محبت سموئے بولا۔ مثال کو اپنی قسمت پر رشک ہو رہا تھا۔

”آئی لو پو مثقل۔“ معراج سکندر ایک جذب کے عالم میں بولا۔

”کچھ بولو تو مثقل کیا سب میں ہی بولوں گا۔“
”آئی لو پو تو۔“ مثال نظریں جھکائے بولی۔

معراج پر شادی مرگ کی کیفیت طاری تھی وہ یہ سب توقع نہیں کر رہا تھا۔

”مثقل! کہیں میں مری نہ جاؤں خوشی سے۔“
”اللہ نہ کرے۔“ مثال کے دل کو کچھ ہوا۔

”ارے یار کوئی کسی سے اتنی جلدی محبت کیسے کر سکتا ہے ابھی آدھا گھنٹہ ہوا ہے تمہیں میرے پاس بیٹھے ہوئے۔“

”معراج! میں نے آپ کو اس آدھے گھنٹے میں ہوئی محبت کے لئے آئی لو پو نہیں کیا بلکہ میں تو آپ سے اس دن سے محبت کرتی ہوں جس دن آپ۔“

”اوہ مائی گاڈ تو تم بھی اسی کیفیت میں تھیں جس میں میں تھا فرض کرو مثقل اگر میری شادی مثال سے ہو جاتی تو۔“ وہ شرارت سے بولا۔

”معراج! آپ میرے بخت کا روشن ستارہ تھے تو پھر کیسے اللہ کسی اور کے نصیب میں لکھ دیتا۔“

معراج کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا اس نے اسے خود سے قریب کیا اور نازک سا ہاتھ شپ لاکٹ اسے پہنایا اور محبت سے خود سے قریب کر لیا۔

☆☆☆☆

زندگی بھر کی محبت خورشید

”مام.....مام!“ ریان کی زوردار آواز آئی۔
”تم اس وقت جاؤ امی پریشان ہو رہی ہوں گی۔“

”آخا فہر ماموں۔“ عفتان اس کے گلے میں جھپول گیا۔

”یار آرام سے، بڑے ہو گئے ہو۔“ اس نے عفتان کو شانوں سے پکڑا۔

”ہوں آپ سے چھوٹا ہی۔“ وہ ہنسا۔

”مما کھانے میں کچھ ہے؟“ ریان کو بہت زوردار بھوک لگی تھی۔

”یہ تمہارے ماموں آگئے تو باتوں میں لگ گئی اس لیے کچھ بھی بنانے سے رہ گیا۔ چل فہر میرے بچوں کو

باہر سے کچھ لاکے دے۔“ کنول نے فہر کے شانے پر زوردار چپکی دی۔

”میرے ساتھ گھر چلو وہاں کھلا دوں گا۔“

”ماموں برگر کھاتے ہیں۔“ عفتان کو باہر کا برگر بہت پسند تھا۔

فصل نمبر 13



”بھئی تم لوگ جاؤ جو بھی کھانا ہے میں رات کے کھانے کے لیے تیاری کر لوں۔“ وہ ان لوگوں کے درمیان سے چلی گئیں۔
ریان اور عثمان اس کے ساتھ ہی چلے گئے حالانکہ اس کا موڈ بہت خراب تھا مگر ان دونوں کی خاطر سب کچھ درست کرنا پڑا۔

☆.....☆

ناہید آئی ہوئی تھیں اور جنین اسی وقت آفس سے آیا تھا۔ وہ بات انیسہ سے کر رہی تھیں جون اس نے بھی لی تھی۔ اگلے قدموں اپنے کمرے میں آگیا تھا۔
”یعنی آریکہ مجھ سے اتنی بدظن اور خائف ہو گئی ہے اس نے آئی کو بھیجا ہے ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا ہے۔“ وہ نہا کے فریش ہو گیا تھا مگر اس کا دل و دماغ الجھ گیا تھا وہ شش و پنج میں مبتلا تھا اسے آگے ایسا کیا کرنا ہے کر آریکہ کی بدگمانی ختم ہو جائے وہ جہیز تک کی بات کر رہی تھیں جب کہ اس نے تو آئی کو سب کچھ کرنے سے منع کر دیا تھا پھر اچانک سے وہ یہ بات کرنے آگئی تھیں۔
”بھائی آپ کو اتنی باری ہی ہیں۔“ حسن اسے بلانے آیا تھا۔
اس کی سوچوں کا تسلسل ٹوٹ گیا تھا تو انیسہ اس نے جیڑ کی پشت پر پھیلا یا چہرہ اس کا خاصا سنجیدہ ہو رہا تھا۔
پستی ٹکر کے ایزی سے تمیض شلوار میں ملیں وہ انیسہ سلام کرتا ہوا داخل ہوا۔
”جیتے رہو۔“ انہوں نے خوش دلی سے سلام کا جواب دیا اور دعائیں دیے لگیں۔
”وہ مودب انداز میں ان کے سامنے والے سنگل صوفے پر بیٹھا چہرے سے لگ رہا تھا وہ بہت سنجیدہ بھی ہے۔“

انیسہ کی نگاہوں نے سب دیکھا۔
”بیٹا میں انیسہ باجی سے کہنے آئی تھی کہ ہم فرنگی وغیرہ سب دیں گے آریکہ کی خواہش ہے۔“
”آئی میں نے آپ کو پہلے ہی منع کر دیا تھا یہ روایتی تکلفات میں نہیں پڑیں۔“ اس نے پہلو بدلا۔
”میں تو کب سے سمجھا رہی ہوں مگر یہ سمجھ ہی نہیں رہی ہیں۔“
”آئی آپ نے یہ بات سوچی بھی کیسے؟“

”جنین بیٹا! آریکہ کی خواہش ہے اور یہ اس کا حق بھی ہے۔ پھر ہمارے پاس جو بھی ہے ہماری بیٹیوں کا نہ ان کے لیے ان کے ابو نے سب کچھ کر کے رکھا ہوا تھا۔“
”آئی میں آریکہ کی یہ بات نہیں مان سکتا۔“ وہ بھی قطعیت بھرے ضدی لہجے میں گویا ہوا کیونکہ آریکہ کی بات تو اسے مانتی ہی نہیں تھی۔
”بیٹا! ادھر اس نے مجھ سے کہہ دیا ہے اگر میری بات نہیں مانتی تو وہ شادی سے انکار کر دے گی اور میں نہیں چاہتی ان کے ابو کو یہ بات پتا چلے۔“
وہ تو سن کے ہی سناٹے میں آگیا اور انیسہ بھی گھبرا گئیں۔
”یہ تو آئی بلک میٹنگ ہوئی جو وہ آپ کو کر رہی ہے۔“
”بیٹا میں کیا کروں میری بیٹی ہے اس کا بھلا ہی سوچوں گی اس لیے بیٹا ہماری عزت تمہارے ہاتھ ہے۔“

اپنی ضد پراڑی ہے۔“ ناہیدہ تو رد ہانسی ہو گئیں۔
”میں بات کروں گی آریکہ سے۔“ انیسہ بولیں۔
”امی رہنے دیں وہ اگر چاہتی ہے کہ سب کچھ ملے تو ٹھیک ہے۔“ وہ اٹھ گیا۔
ناہیدہ نے اسے جاتے ہوئے دیکھا کیونکہ جنین کے چہرے اور لہجے سے واضح ہو گیا تھا اسے یہ بات پسند نہیں آئی ہے۔

”ناہیدہ کیا آریکہ نے ہماری کوئی بات نوٹ کر لی ہے یا جنین کی بری لگی ہے۔“ انیسہ ماں تھیں انہیں بھی جنین اور آریکہ کی چچکشل کا اندازہ تھا۔
”نہیں نہیں باجی ایسی کوئی بات نہیں ہے، کہتی ہے میرا سارا جہیز کا سامان آپ کو دیتا یہ میرا حق ہے۔“ وہ خود ہی عذر بھی تراش کے گویا ہوئیں۔
جنین باہر برآمدے میں ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھا اندران کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا دل کبیدگی کا شکار ہو گیا آریکہ اس سے حد سے زیادہ بدظن ہو گئی تھی اور یہ فکر مندی کی کی علامت تھی۔
ناہیدہ آئی کی آواز پر وہ چونکا جوانے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔ جنین تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
اسے کسی طرح بھی آریکہ سے بات کرنی تھی مگر کیسے اور اسے موقع بھی تو نہیں ملتا کیونکہ وہ نیچے بھی صفائی کرتی نظر نہیں آتی تھی۔
”جنین.....!“ انیسہ کی پکار پر وہ سیدھا ہو کے بیٹھا۔
”جی امی۔“

”بیٹا میں نے تو بہت کہا ناہیدہ سے لیکن وہ مان ہی نہیں رہی ہے۔“
”رہنے دیں کیا کر سکتے ہیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔
”جنین مجھے لگتا ہے آریکہ کو تمہاری باتیں بری لگی ہیں۔“
”امی میں نے ایسی کوئی بات ابھی تک نہیں کی کہ جہیز وغیرہ کا کیا ہو۔“ اس نے کہا۔
”لو کی بہت حساس ہے۔“
”جی!“ اس نے بھی سر ہلایا۔

”بیٹا میں نہیں چاہتی شادی سے پہلے ہی تم دونوں میں ناراضی اور تکی رہی تو زندگی اچھی نہیں گزرتی ہے۔“
وہ پریشان لگ رہی تھیں۔
”شادی کرنا تو بہت آسان ہوتا ہے مگر اسے نبھانا اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے کسی کی بیٹی کو ساری زندگی کے لیے اپنے ساتھ باندھ کے رکھنا اور اس کی عزت کرنا اور کروانا یہ فرض ہوتا ہے کیونکہ وہ سب کچھ چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے ماں باپ کی دہلیز چھوڑ کے آتی ہے اس لیے کہ کوئی اسے بہت چاہے سے بیاہ کے لے جا رہا ہوتا ہے اگر ابتداء میں ہی ترقی سرد مہری غلط فہمی جڑ پکڑ جائے تو زندگی ویران ہو جاتی ہے۔“ وہ اسے بڑے سنجیدگی کے اور ایک ایک لفظ پر زور دے کے سمجھا رہی تھیں۔
جنین سر جھکائے بغور ان کی سن رہا تھا جو ٹھیک کہہ رہی تھیں اس کی زندگی کی ابتداء میں ہی غلط فہمی جڑ پکڑ چکی تھی اور آریکہ جیسی حساس لڑکی کو سنبھالنا جنین کو جوئے شیر لانے کے مترادف لگ رہا تھا۔

”آریکے سمجھدار لڑکی ہے۔ میں نے ایسے ہی اس کا انتخاب نہیں کیا ہے۔ ورنہ تو تمہارے خاندان میں بھی لڑکیاں ہیں لیکن تم نے خاندان میں کرنے کو شروع سے ہی منع کیا ہے۔ میری نظر آریکے پر چلی گئی لیکن تم نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا ہے۔“ وہ دکھ و افسردگی سے گویا ہوئیں۔

”امی آپ کیا چاہتی ہیں۔“ اس نے قدرے توقف کے بعد ان سے پوچھا۔
 ”بیٹا میری تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ کروں تو کیا کروں شادی سے پہلے ہی ایسی باتیں ہو رہی ہیں بعد میں کہیں.....؟“ آگے بڑھنے، بولنے وہ رک گئیں انہیں اندیشے ڈرارہے تھے۔
 حنین اپنی ماں کی سوچ کو سمجھ رہا تھا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ اس نے آریکے کے ساتھ مذاق مذاق میں بہت کچھ کہا جس کا نتیجہ اسے نظر آ گیا تھا۔

”ابھی تو آپ چپ کر کے ان کی مانتی جائیے۔“
 ”کیوں بعد میں پھر تم آریکے کو سناؤ گے۔“ وہ تھوڑا غصے میں ہی آگئیں۔
 ”نہیں بلکہ میں اس کی غلط فہمی دور کروں گا۔“ اس نے ان کے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر یقین دلایا۔
 ”حنین مجھے اس عمر میں نامید اور منیر بھائی کے سامنے شرمندہ نہیں کروانا۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
 ”ارے امی آپ ایسا کیوں سوچ رہی ہیں۔“
 ”جانے کیوں دل ڈر رہا ہے۔ میں تو خوشی خوشی شادی کی تیاری کر رہی ہوں۔“ وہ لب بھیج کے رہ گئیں۔
 ”آپ خوشی خوشی کریں غلظتیں کریں انشاء اللہ سب اچھا ہی ہوگا۔“ اس نے انہیں اپنے شانے سے لگایا۔
 ”امی آپ سے ایک بات کہنی تھی۔“ وہ جھجک کے رکا۔
 ”ہاں بولو۔“ وہ سنبھل گئیں۔

”میں آریکے سے ملنا چاہتا ہوں۔“
 ”یہ تو بھول کے بھی نہیں کرنا۔“ انہوں نے جھٹ منع کیا۔
 ”پھر ایسے کیسے ہوگا مسئلہ حل۔“
 ”ابھی تم چھوڑ دو میں خود ہی بات کروں گی۔ پتا نہیں وہ بچی دماغ میں اور دل میں کیا بیٹھائے بیٹھی ہے۔“
 سوچتے ہوئے انہیں۔

”ارے ہاں تم آگے ہو تو حرا کو چونک سے لے آؤ۔“
 ”جی اچھا۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔
 ”محترمہ آریکے صلیبہ تمہیں تو ٹھیک بعد میں ہی کروں گا۔ کیا پتا تم مرنے کی طرح بدک جاؤ۔“ وہ مرر دیکھ کر مسکرا کے خود سے ہنسٹا ہوا۔

انیسہ کچن میں چلی گئی تھیں۔ مغرب ہونے والی تھی۔ حنین نے اوپر نگاہ کی شاید کھڑکی سے اس کا عکس نظر آجائے۔ اب تو وہ بھولے بھٹکے کھڑکی تک میں نظر نہیں آتی تھی۔ نئی نئی گاڑی ملی تھی۔ اس نے سوچا تھا حرا، ثمرہ کو اور آریکے کو لے کے باہر ہونگ ہی کر آئیں گے مگر حالات ہی ایسے ہو گئے تھے یہ ممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔
 گاڑی اشارت کر دی تھی مگر اسے ایسا لگا باہر روڈ پر کھلنے والی کھڑکی سے اسے کوئی دیکھ رہا تھا۔ نگاہ اوپر کی تو چھپاک سے ہیولہ بٹا تھا۔ دل میں خوش گمانی بھی ہوئی وہ تو نہیں تھی خود ہی ہنسنا بھی۔

☆.....☆

تکلیل احمد کو دیکھ کر وہ کھل ہی گئی تھی۔ طبیعت خرابی کے بعد سے کمزور ہو گئی تھی۔
 ”لگتا ہے صرف پڑھائی کی ہے۔ کھانے پینے پر توجہ نہیں دی ہے۔“ انہوں نے گلابی کپڑوں میں ملبوس نسل فر کو جب دیکھا۔

”ابو! ابھی تو اتنے دن بعد آئے ہیں۔“ وہ ان کے بازو سے لپٹی بیٹھی تھی۔
 ”کام کی بزنس کی تھوڑی مصروفیت بڑھ گئی تھی حالانکہ سارا کام ضیاء دیکھتا ہے مگر اس کی ضد تھی ساری میٹنگز میں ڈیل کروں۔“
 نسل فر نے ضیاء کے نام پر پہلو بدلا۔ اندر سے ایک جذبہ اور احساس کروٹیں لیتا کاش وہ اپنے ان دونوں بھائیوں کے ساتھ ہو اور وہ دونوں اس کے غم سے اٹھائیں۔

”ابو حمزہ! آفس نہیں دیکھتا۔“
 ”حمزہ ابھی اپنی پڑھائی مکمل کر رہا ہے اس دفعہ تو اس نے میرا دماغ کھایا ہوا ہے چینیوں میں انگلی بند جاؤں گا۔“ انہوں نے بتایا۔
 ”میں نے ابھی تو آپ سے انگلی بند جانے کا کہا تھا۔“ وہ قدرے توقف کے بعد بولی تھی۔
 ”مجھے یاد ہے میں ساری تیاریاں کر رہا ہوں۔ شہوار کا اور زبیدہ بہن کا آئی ڈی کارڈ دے دو۔“ انہیں یکدم ہی یاد آیا۔

”جی اچھا۔“ اس نے سر ہلایا۔
 اور شہوار کو بلا کے ہی لے آئی تھی۔
 ”بیٹا! جلدی سے آپ اپنا آئی ڈی کارڈ دو اور ہاں زبیدہ بہن کا بھی۔“
 ”بھیا آپ ہمارا رہنے دو۔“ زبیدہ بھی وہیں چلی آئی تھیں۔
 ”دیکھا ابو یہ لوگ مجھے غیر سمجھتی ہیں۔“ وہ خفگی سے گویا ہوئی۔
 ”نہ بیٹی نہ، ایسا کچھ نہیں ہے۔“ انہوں نے جھٹ نفی کی۔
 ”پھر منع کیوں کر رہی ہیں۔“ تکلیل احمد بھی ان سے توجہ نہ مانگنے لگے۔
 ”بھیا اچھا نہیں لگتا لاکھوں کا معاملہ ہوتا ہے ہمارا کیا ہے ہم یہاں رک جائیں گے پھر شہوار جاب کا بھی کہہ رہی ہے اس کے لیے اس نے کہیں درخواست دی ہوئی ہے۔“
 ”یہ جاب ضرور ہے۔“ انہوں نے شہوار سے پوچھا۔

”انکل سمجھتے ہیں مشادات اور تجربہ بات چاہتی ہوں۔ شوق یہی سبھی میں یہ جاب کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے نارمل انداز میں ہی بتایا کیونکہ اگر مزید کچھ کہنا تو تکلیل احمد سے ڈانٹ پڑ سکتی تھی۔
 ”اگر جاب تم یہ سوچ کے کرو گی کہ تم بوجھ ہو مجھ پر تو میں قطعی اجازت نہیں دوں گا۔“
 ”نہیں نہیں انکل آپ جانتے ہیں مجھے ہر چیز کا شوق ہے جس سے کہ جاب کرنے والی لڑکیاں کیسے اپنی انک بیچ کرتی ہیں۔“
 ”ابو اسے زیادہ ہی افلاطون بننے کا شوق ہے۔“ نسل فر نے ہنس کے اس کا مسخرہ اڑایا۔

جواب تو تم بھی کرنے کو کہہ رہی تھیں۔“ شہوار نے یاد دلایا۔

”ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔“ اس نے اپنے سارے شوق صرف اس فہرٹ کی وجہ سے ختم کیے تھے اور یہاں سے جاتا بھی وہ اسی لیے چاہتی تھی۔

”تم جواب کر بھی نہیں سکتی ہو۔“ شہوار نے کہا۔

”اچھا تو یہ بتائیے آپ لوگ آئی ڈی کارڈ بک دے رہی ہیں۔“

”بھیا ہمیں رہنے ہی دو وہاں کا ٹھنڈا موسم مجھے نقصان دے گا خواہ خواہ پریشانی ہوگی۔“ زبیدہ کی پوری کوشش تھی وہ دونوں نہیں جائیں۔

”ارے وہاں جا کے آپ اچھا محسوس کریں گی۔“

”انکل پلیر مان لیں۔“

نیل فرما کر منہ پھول گیا تھا۔ شہوار نے دیکھ بھی لیا تھا۔

”میں بھی نہیں جا رہی۔“

”ج!“ شہوار اچھل گئی۔

”نہیں میں پھر بھی جاؤں گی۔“ اسے فہر کا سوچ کے پھر گھبراہٹ ہوئی۔

”نیل فرماؤ آپ کا دل ہے تو ضرور جاؤ آپ کی خالہ بھی ہیں مل آؤ گی۔“ کلکیل احمد بھی چاہتے تھے کہ وہ یکسانیت والے ماحول سے ہٹ کے کچھ دن وہاں گزار آئے۔ جب تک وہ گھر کے حالات ایسے ٹھیک لگیں گے کہ اسے بھی وہاں لے جائیں سب سے بڑا مسئلہ ٹرایا کا تھا انہیں اعتماد میں لے کے بتانا تھا۔

”ابو، خالہ اور شہوار بھانے بتا رہی ہیں نہ جانے کے۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ہم بھانے نہیں بتا رہے انکل سمجھ گئے ہیں تم گھوم پھر کے آؤ پھر پاکستان ٹور کا پروگرام بتائیں گے۔“ اس نے نیل فرما کر خوش کیا۔

”ابھی بناؤ۔“ وہ جھٹ بولی۔

”ابھی کیسے، تم تو جا رہی ہو۔“ اس نے بھی جھٹ کہا۔

”ٹھیک ہے وہاں نہیں جانی پاکستان ٹور پر چلتے ہیں۔“ وہ بھی وضاحت دینے لگی۔

”تم وہاں سے ہو آؤ پھر چلتے ہیں کیونکہ اس دوران میں جاب بھی ڈھونڈ لوں گی۔“ وہ تو ویسے بھی نیل فرما کر ٹال رہی تھی مگر وہ تو بھند ہو گئی۔

”ابو یہ بعد میں بھی نہیں جائے گی۔“ اس نے منہ بسور کے کلکیل احمد سے اس کی شکایت ہی کی۔

”چلو تو کوئی مسئلہ نہیں ہے جب تک یہ جاب کا ایکسپیرنس کر لے۔“ انہوں نے بھی اس بحث کو دفع ہی کیا۔

”شہوار بیٹا آپ یہ یاد رکھیے گا جاب آپ صرف اپنے شوق اور ایکسپیرنس کے لیے کر رہی ہیں میں مستقل اسے کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔“ انہوں نے ساتھ ہی شہوار کو سنجیدہ لہجے میں ہدایت دی۔

”جی انکل۔“ اس نے جھٹ گڑبڑا کر سر ہلایا۔

شہوار کی سوچ شاید وہ جان گئے تھے اسی لیے اسے پہلے ہی متنبہ بھی کر دیا۔

”میں تمہارے لیے خود جاب دیکھتا ہوں۔“

”انکل میں خود اپنی محنت سے حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ پھر بولی۔

”ایک تو اسے پتا نہیں کیوں جاب کا خط سوار ہو گیا ہے۔“ نیل فرما کر اس کی یہ رٹ اور ضد سخت ناگوار گزر رہی تھی۔

”جیسے تمہیں انگلینڈ جانے کا خط سوار ہو گیا ہے۔“ اس نے بھی ترکی بہ ترکی چمک کے ہی کہا۔

کلکیل احمد مسکراتے ہوئے دونوں کی طرف دیکھ کر۔

”نیل فرما کر ایسا کرو اپنی شاپنگ وغیرہ شروع کر دو کیونکہ چند دن میں تمہارے جانے کا سارا انتظام ہو جائے گا۔“ انہوں نے ساتھ ہی بتایا۔

اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا وہ فہر علی سے بچ کے کچھ دن سکون کے گزارنا چاہتی تھی۔ شاید کچھ عرصہ یہاں نہیں ہوگی تو وہ بھی اسے بھول جائے گا۔

مجھ اب چلنا چاہیے فضاء نے کہا تھا چھ بجے میٹنگ ہے اور میرا وہاں موجود ہونا ضروری ہے۔“ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

”یہ میسج ہیں تم اپنی تیاری مکمل رکھنا اور پیسوں کی ضرورت ہو تو مجھے کال کر دینا۔“

”ابو یہ بھی بہت ہیں۔“ اس نے پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں کی گلدی دیکھی۔

”پھر بھی ضرورت ہو تو کال کرنا۔“ اس کے ماتھے پر پیار کر کے اور دعائیں دے کے وہ تیزی سے نکل گئے تھے۔ نیل فرما کر انہیں حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا تھا جو چند گھنٹوں کے لیے اس کے پاس آتے تھے اور ہر دفعہ انتظار دے جاتے تھے۔

کلکیل احمد شاید تیزی میں تھے وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے تھے مگر دو حیران نظروں نے ان کا تعاقب کیا تھا۔ نیل فرما کر وہ سیٹھی ہوئی تھی ڈور نیل ہوئی۔ وہ چونکی اس وقت کون اور کلکیل احمد کے علاوہ یا پھر سلام کے علاوہ تو کوئی شخص آتا ہی نہیں تھا آس پاس کے لوگوں سے میل جول اس نے رکھا ہوا نہیں تھا۔ زبیدہ بھی کسی کسی کام سے چلی جاتی تھیں۔

”ابو تو ابھی گئے ہیں۔“ وہ صوفے سے اٹھی۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ زبیدہ خالہ نے ہی ڈور کھولا سامنے ہی کنول کھڑی ہوئی تھیں انہیں حیرانگی کا جھٹکا لگا۔

”السلام علیکم!“ کنول خود بھی گھبرا رہی تھیں۔

زبیدہ خالہ نے ان کے سلام کا جواب دیا۔ نیل فرما کر بھی وحشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ کہیں فہر تو نہیں آگیا۔

”آ..... آپ.....“ وہ سراپستگی سے زبیدہ سے ہی لپٹ گئی۔

اتنے میں شہوار بھی اندر سے آگئی۔ کنول کو یوں اچانک سے سامنے دیکھ کر چونکی۔

”آ..... آپ کیوں آئی ہیں۔“

”دیکھو گھبراؤ نہیں میں آئی ہوں اکیلی۔“ وہ اس کے ڈرنے اور خوفزدہ ہونے پر شرمندہ بھی ہو رہی تھیں۔

”خالہ ان سے کہیں چلی جائیں ان کا بھائی بھی آیا ہوگا۔“ وہ تو باقاعدہ رو ہانسی ہو گئی۔

”میرے بھائی کو معاف کر دو۔“ ان کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔
 ”آپ جانتی ہیں کسی لڑکی کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے اگر یہ چلی جائے تو سمجھو وہ مرجاتی ہے۔“

”فہر ایسا نہیں ہے اچھے خاندان کا ہے اور وہ تم سے محبت کرتا ہے کوئی بھی غلط حرکت نہیں کرے گا۔“ لہجے میں وثوق اور یقین تھا۔

”ایک لڑکی کو اس کی مرضی کے بغیر زبردستی اٹھا کے لے گئے، یہ کیا اچھی حرکت ہے۔“
 ”تم نے خود دیکھا تھا میں نے فہر کو کتنی سنائی تھیں تمہیں خود چھوڑنے آئی تھی۔“ وہ اس کے کہنے پر شرمندہ بھی ہو رہی تھیں۔

”آپ کو نہیں معلوم میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت رہی ہے۔ ہر وقت آپ کے بھائی کا ہوا سوار رہتا ہے۔“

”تمہیں اس سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں وہ تمہیں ذرا بھی تنگ کرے مجھے بتانا دیکھنا اس کی عقل ٹھکانے میں لگاؤں گی۔“ انہوں نے اسے یقین دلایا۔

نیل فران کے اپنائیت بھرے لہجے پر تحیر زدہ سی رہ گئی وہ اس سے کتنی محبت اور لگاؤ کا اظہار کر رہی تھیں۔
 ”مجھے بھی معاف کر دو۔“

”پلیز مجھے آپ معافی مانگ کے شرمندہ نہیں کریں میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ نے مجھے یقین دیا ہے آپ میرا ساتھ دیں گی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہوں میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ وہ مسکرامیں اور سر ہلایا۔
 ”آج سے ہم دونوں فرینڈ بھی ہیں۔“

”نہیں فرینڈ نہیں۔“ اسے تو آگے کے وہم ڈراتے تھے۔

”کیوں بھی فرینڈ کیوں نہیں۔“ وہ حیرانگی سے سوالیہ نگاہ ڈال کے پوچھنے لگیں۔

”آپ کے بھائی پھر مجھے.....“

”نیل فرایسا کچھ نہیں ہوگا تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر وہ کہیں لے جائیں سکتا۔“

”آپ انہیں یہ بھی سمجھا دیں محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاتی۔“ وہ اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

شہوار اسے مسکراتی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی کہ کتنی جلدی وہ کنول سے صلح جو لہجے میں بات کر رہی تھی۔

”ٹھک کہا محبت زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتی یہ تو خود بخود آہستہ آہستہ اپنا راستہ بناتی چلی جاتی ہے اور پھر وہ دل میں گھر کر لیتی ہے۔“ وہ ایک جذب سے بول رہی تھیں۔ نیل فرنے جھینپ کے لب بچھنے لگے۔

”کہتے ہیں جتنا کسی سے بھاگو وہ اتنا ہی سامنے آتا ہے۔“ شہوار نے بھی مداخلت کی۔

”ہاں یہ تو ہے۔“ کنول نے تائید کی۔

”آپ اپنے بھائی کو اچھی طرح سمجھا دیں۔“ نیل فر کو پھر بھی ڈر رہی تھا۔

”ارے کبر تو رہی ہوں سمجھا دوں گی تم اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو۔“ کنول اس کے یکنیت بدلتے چہرے کو دیکھنے لگیں جو دشت زدہ بھی ہو رہی تھی۔

”میں کبر رہی ہوں نہیں آیا میری سن تو لو میں صرف۔“ حافی مانتے آئی ہوں۔“

”آپ بیٹھیے پلیز۔“ شہوار نے بھی کنول کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگایا وہ پریشان اور واقعی شرمندہ بھی ہیں۔

”خالد ان سے کہیں جائیں۔“

”نیل فر چپ تو ہو جاؤ میری سن تو پلیز۔“ کنول نے گویا التجائیہ انداز میں اس کے ہاتھوں کو تھاما جو خوف اور دشت سے ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

”کیا سن لوں آپ کا بھائی مجھے زبردستی یہاں سے لے کے گیا۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ پلیز میری عزت کا ہی خیال کریں۔“ وہ سر ہاتھوں میں تھام کے رونے لگی۔

”نیل فر پہلے ان کی سن لو پھر کچھ کہنا۔“ شہوار نے اسے ڈپٹ کے چپ کر دیا۔

”میں بہت شرمندہ ہوں میرے پاس وہ الفاظ اور جملے نہیں ہیں جو ادا کروں اور آپ لوگوں کو یقین آجائے۔“ وہ بے بس اندر دامت میں گھری ہوئی گویا ہوئیں۔

”میرے بھائی نے بہت غلط حرکت کی ہے اس کے لیے میں نے اسے بہت برا بھلا کہا ہے۔ میں نے اس سے بات کرنا بند کر دی وہ اسی لیے کھسایا ہوا پریشان پھر رہا ہے۔“

”اب کیوں پریشان پھر رہے ہیں۔“ نیل فر نے ترش روی اور رکھائی سے کہا۔

”میں نے اس سے کہا پہلے تم سے معافی مانگے پھر ہی میں بھی تم سے بات کروں گی۔“

”اچھا تب ہی وہ کال کر رہے تھے۔“ شہوار کو یکدم یاد آیا۔

”نیل فر نے اس سے بات نہیں کی۔“

”میں اس انسان کا چہرہ تو کیا آواز تک سننا نہیں چاہتی۔“ وہ تو آگ بگولہ ہی ہو گئی۔

”پلیز اسے معاف کر دو۔“ انہوں نے نیل فر کے ہاتھ پھر تھام لیے۔

”آپ کیوں معافی مانگتی ہیں غلط حرکت انہوں نے کی ہے۔“ وہ لب چل رہی تھی۔

”میرا بھائی ایسا نہیں ہے وہ بہت سمجھ دار اور ذمہ دار ہے۔ جانے کیسے تم اسے اچھی لگی ہو، میں خود حیران ہوں کبھی کسی لڑکی کے پیچھے نہیں بھاگا ہے۔“ وہ اس کے ساتھ ہی اس کی خوبی بھی بتانے لگیں۔

”وہ تم سے محبت کرتا ہے اسی وجہ سے وہ ایسا کر گیا۔“

”واہ بہن ہو تو آپ جیسی جو بھائی کی حمایت بھی کرتی ہے اور برا بھی کہتی ہے۔“ نیل فر نے فہمائی لہجے میں طنزیہ کیا۔

کنول خفیف سی ہو گئیں۔

”بھائی ہے میرا میں نہیں چاہوں گی کوئی اسے غلط سمجھے۔“

”ایسی حرکت کے بعد بھی غلط نہ سمجھے۔“ اس نے پھر طنز کیا۔

”دیکھو میں ہاتھ جوڑ کے تم سے معافی مانگتی ہوں آئندہ وہ تمہیں تنگ نہیں کرے گا۔“

”پلیز آپ بڑی ہیں میرے آگے ہاتھ نہیں جوڑیں۔“ نیل فر کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

شہوار اور زبیدہ حالہ تو خاموش بیٹھی ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھیں۔

”نیل فر پلیر خود کو مارل کرو۔ پلیر آپ اس کے لیے پانی لائیے۔“ انہوں نے شہوار سے کہا۔

وہ تیزی سے ابھی تھی۔
نیل فر کے دل و دماغ کی بالچل میں کچھ ٹھہراؤ آیا تھا ورنہ وہ جتنا خوفزدہ ہوگئی تھی اس کا انہیں بھی اندازہ نہیں تھا۔ پانی پیا اور اپنے کھڑے بالوں کو سینا۔
”اچھا میں اب چلتی ہوں اچانک سے ہی اٹھ کے آگئی تھی۔ بچے بھی کو چنگ سے آگئے ہوں گے۔“ انہیں یہاں آئے ہوئے خاصا وقت ہو گیا تھا وہ بھی ریلیکس ہوگئی تھیں کیونکہ انہیں نیل فر کے چہرے پر اطمینان جو نظر آ گیا تھا۔

”بیٹا میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔“ زبیدہ نے کہا۔
”آئی چائے آپ سب پر ادھار رہی بعد میں آ کے پیوں گی۔ اگر نیل فر اجازت دے تو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب لہجے میں پوچھا۔
”جی ضرور۔“ آواز دہلی دہلی تھی۔
”تم اطمینان رکھو نہ کو سا تمہیں لاؤں گی۔“ وہ منہیں تھیں کیونکہ اس کی سوچ جو پڑھ لی تھی۔
”کبھی کبھی آنے کی اجازت دو گی مجھے۔“

”جی وہ آپ یہاں آ کے کیا کر لیں گی میں تو بہت بور ہوں۔“ وہ رک رک کے قدرے توقف کے بعد گویا ہوئی وہ کسی طرح بھی نہیں چاہتی تھی کہ کنول یہاں آ میں ورنہ اگر کبھی باتوں باتوں میں انہیں حقیقت کا علم ہو گیا تو یہ اس کے ابو کے لیے پریشانی اور فکر کی علامت ہوگی۔
”کوئی نہیں بور تو نہیں ہو ہاں مجھے تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے تم سب سے ناراض اور کسی چیز کی تلاش میں ہو۔“ انہوں نے اسے بغور جانچنے کے بعد مسکرا کے کہا۔
”نہیں ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔“ جھینپ کے پہلو بدلا۔ شہوار نے مسکرا کے لب بھینچے کیونکہ کنول نے اندازا بہت صحیح لگا دیا تھا۔

”ابھی تو چلوں گی میں پھر آؤں گی اب تو فریڈ ہو گئے ہم۔“ انہوں نے نیل فر کو گلے لگا کے پیار کیا اور پھر شہوار کو بھی گلے لگایا۔ زبیدہ خالہ کو سلام کرتی ہوئی وہ تیزی سے نکل گئی تھیں۔

☆.....☆

ماہ کو اس دن سے شہنیل کی ایک بات پر نشان کر رہی تھی جو اس رشتے پر ذرا بھی لگاؤ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔ صرف اور صرف وہ احسان اتار رہا تھا اور یہ تکلیف دہ تھا اس کے لیے جو شہنیل کو تمام تر شدتوں سے چاہتی تھی۔ اس کا دل و دماغ اس سے ایک لمحے کو بھی غافل نہیں ہوتا تھا اور وہ شہنیل جسے کوئی فکر ہی نہیں تھی۔
اسے کبھی کبھی لگتا شہنیل مشینی زندگی گزار رہا ہو جسے کسی کا احساس نہیں نہ کسی کے جذبوں کی قدر ہو۔
”شہنیل کب تک میں تمہارے پتھر دل سے اپنا سر پھوڑتی رہوں گی۔ کب اس پتھر میں دراڑ پڑے گی اور تم میری طرف بڑھو گے۔“ کمپیوٹر کے آگے بیٹھی تھی اور مانیٹر پر شہنیل کی تصویر تھی وہ اسے وارنٹی سے دیکھے جا رہی تھی۔

جب سے اس نے یونیورسٹی جوائن کیا تھا، فضول باتوں سے بچ گئی تھی۔ ٹی وی بھی دیکھنا تقریباً ختم ہی ہو گیا

تھا۔ زیادہ تر وقت اس کا اپنی پڑھائی یا پھر کمپیوٹر کے ساتھ گزر جاتا تھا۔ صنوبر کی شادی کے دن قریب آگئے تھے گھر میں پہلی شادی بھی ساری ہی تیاریاں اچھے طریقے سے ہو رہی تھیں۔ مگر ماہانے خود کو ان سب چیزوں سے دور رکھا ہوا تھا۔ صنوبر کے سسرال اپنی بیماری کے بعد ایک دفعہ بھی نہیں گئی تھی بلکہ کوشش یہی نہی جائے تو اچھا ہے۔

”ماہا آئی۔“ صبا کی آواز تھی۔
ماہانے جلدی سے مانیٹر سے سب کچھ غائب کر دیا وہ کسی پر بھی کچھ واضح نہیں کرنا چاہتی تھی۔
”آپ کو بلایا جا رہا ہے۔“ اس نے ماہا کو چیر سے اٹھتے دیکھا۔
جو خاصی پر سوچ بھی ہو رہی تھی۔

”کون بارہا ہے اور کیوں بلایا جا رہا ہے۔“ اپنا بلیک پرنٹ دو پڑے شانوں پر سمیٹا اور بالوں میں ڈریسنگ ٹیبل سے برش اٹھا کے چلانے لگی۔

”شہیر بھائی بلارہے ہیں اور آپ کو کہیں لے جانا چاہ رہے ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”مجھے لے جانا چاہ رہے ہیں تم کیوں نہیں چلی جاتیں۔“ ماہانے اس کا افسردہ چہرہ خاصا جا چمکتی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

”کہہ رہے ہیں ماہا کو بھی ساتھ لے کے جانا ہے۔“

”اس میں اداسی مگر کیوں؟“ وہ ہنسی تھی۔

”کہہ رہے ہیں اپنا حلیہ درست کرو۔“

”ٹھیک کرو، کپڑے تم پہنچ کر نا نہیں چاہ رہی ہوگی۔“ وہ صبا کی اس کاہلی کا جانتی تھی۔

”کیا ہے صبح بادلے ہیں بلکہ کالج سے آنے کے بعد بدلے ہیں اچھے پھلے ہیں۔“ اسے غصہ آیا۔

”اچھا یہ بتاؤ جا کہاں رہے ہیں۔“ بالوں کو پلیٹ کے کچر کیا۔

”آپ کی شادی کا کارڈ اپنی کو لیگ کو دینے جارہے ہیں۔“

”کہیں وہ تو نہیں جو ان کے اسپتال میں جاب کرتی ہے۔“ وہ سن کے خوش ہو گئی کیونکہ شہیر نے اپنی پسند اور ارادے سے سب کو ہی آگاہ کیا ہوا تھا۔

”ہاں وہی امی بھی جا رہی ہیں۔“

”چلو تو چلتے ہیں۔“ وہ خوشی خوشی روم سے باہر آئی تھیں۔

”اے لڑکی تجھے کچھ ہوش بھی ہے ہر وقت کمرے میں مسمی کیا کرتی رہتی ہے۔“

دادی جان نے ماہا کو اڑے ہاتھوں لیا جو ان کے عتاب اور خستگیوں سے بچتی رہتی تھی۔

”دادی جان اپنے کام کرتی ہوں۔ فضول کاموں میں نہ ہوتی ہوں تو پھر بھی آپ کو اعتراض ہے۔“ وہ منہ بسور کے ان کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

”ارے شکل تک نہیں نظر آتی ہے نیب کی لہن۔“ انہوں نے بشری کو پکارا۔

”جی اماں جی۔“ وہ رخشندہ بھائی سے کسی گفتگو میں مصروف تھیں چونکہ کے اور گھبرا کے اٹھ کے آئی تھیں۔
جولاؤ خیم کاؤچ پر بیٹھی تھیں۔

”اپنی بیٹی کی صورت دیکھی ہے کھاتی چہتی نہیں ہے یہ لگتا ہے۔“

”دادی جان کھاتی ہوں۔“ ماہا تو گھبرا گئی۔

بشری نے بھی ماہا کو دیکھا واقعی وہ جب سے یونیورسٹی جانے لگی تھی کمزوری لگنے لگی تھی۔

”اس کی صحت کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔“ وہ انہیں سناتے لگیں۔

”ارے ماہا آگئیں تم۔“ شہیر تک سب سے تیار ہوا مگر پینٹ پر پنک شرت میں ڈینٹ لگ رہا تھا۔

”تیار نہیں ہوئیں۔“ اس نے ماہا کو گھر کے کپڑوں میں دیکھا۔

”جانا کہاں ہے۔“ وہ دادی جان کے پاس سے اٹھ گئی۔

”امی چچی جان آپ نے اسے بتایا نہیں۔“

”شہیر اسے رہنے دو تم اور بھائی چلے جاؤ۔“ بشری نے منع کیا۔

”بشری کیوں منع کرتی ہو میں نے صبا کو بھی چلنے کو کہا ہے۔“ رخشندہ گویا ہوئیں۔

”تاکی امی کسی کے گھر پہلی دفعہ جائیں اور اتنے لوگ، اچھا نہیں لگے گا اور پھر مجھے کچھ کام بھی ہے کل اسائنمنٹ دینا ہے اسی پر کام کر رہی تھی۔“ جھٹ اس نے عذر تراش کے کہا۔

”ارے تھوڑی دیر کی بات ہے جلدی آجائیں گے۔“ شہیر نے اس کے سر پر چپٹ لگائی۔

”تاکی امی انہیں تو دیکھیں جیسے رشتہ آپ آج ہی پکا کرنے جا رہی ہیں۔“ اس نے شہیر کو معنی خیزی سے دیکھا

جو جھینپ گیا۔

”فضول حکومت۔“

”میں تو تیار ہو کے آگئی۔“ صبا، بیو ایمر اینڈری کے سوٹ میں تیار ہو کے آگئی۔

”آپ لوگ اسے لے کے جائیے میں نیکسٹ نام چلوں گی۔“ وہ ہنسی ہوئی چلی گئی۔

”ماہا ماہا۔“ شہیر نے آوازیں دیں۔

وہ اس لیے بھی اسے لے جانا چاہ رہا تھا ماہا ہر ایک سے فریج ہو کے باتیں کر لیتی تھی وہ رمعنہ سے گھر کے متعلق پوچھ گچھ کرے گی کیونکہ رخشندہ تو یہ سب نہیں کر سکیں گی۔

”شہیر چھوڑ، تم جاؤ دیر ہو رہی ہے۔“ بشری نے خود ہی ان لوگوں کو جانے کو کہا۔

شہیر نے اسے دیکھا جو سیل پر کسی سے مصروف گفتگو تھی وہ واپس پلٹ گیا۔

ماہانے گھوم کے دیکھا تھا وہ جارہا تھا خود لان میں پڑے جھولے میں بیٹھی ہوئی تھی دو آنکھیں مسلسل اس کے تعاقب میں تھیں۔

شہیر نے اپنے روم کی ونڈو سے اسے ماحول سے ٹیکس غائب دیکھا۔ بلیک کپڑوں میں ماہا کی سرخ و سپید رنگت دمک رہی تھی ہاتھ پاؤں بھی نرم و نازک اور شفاف تھے۔ بالوں کو سمیٹ کے کچر کیا ہوا تھا۔ اسی لمحے ماہا کی نگاہ اٹھی۔

ماہانے سیل آف کر کے ہاتھ میں دبا یا شہر بل پردہ چھوڑ کے ہٹ گیا۔

”مسلسل مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔“ دل میں خوشی کی لہر چلی ہوئی وہ بھی اسے چھپ کے چوری چوری دیکھتا تھا۔

جھولے میں زور زور سے جھولنے لگی تھی۔

”ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور کہاں مجھے متفق ہونا ہے میں جانتا ہوں۔“ بہت گہری سوچ کے ساتھ گویا ہوا۔

”اور میں نہیں سمجھتا ہر وقت انسان اس رشتے کے حصار میں ہی رہے۔“
 ”کون سے رشتے کے حصار میں۔“ جھولارک گیا تھا اور وہ ناہنجی کی کیفیت میں چوکی تھی۔
 ”آپ کا اور میرا رشتہ۔“ زور دے کے جتنا یا۔ آج پہلی دفعہ اس نے اس رشتے کی اہمیت کو شاید سمجھ لیا تھا۔ وہ تو گنگ سی رہ گئی۔

”زبردستی کا رشتہ ہے جو تم نے قبول کیا ہے۔“ وہ کمزری ہو گئی۔
 ”جیسے بھی کیا ہے قبول تو کیا ہے میں نبھانے کی کوشش کروں گا۔“
 ”صرف رشتہ نبھائے گا۔“ وہ شہزیل کو جیسے الجھانے ہی لگی اسے اچھا لگ رہا تھا وہ اس سے الجھا ہوا تھا۔
 ”کاش یہ محبت میں بھی اسی طرح الجھ جائے تو؟“
 ”آپ کو کیا جو آپ چاہتی ہیں وہ ہو تو کیا ہے۔“
 ”میں چاہتی ہوں تم بھی مجھ سے محبت کرو۔ میری پرواہ کرو۔ میری فکر کرو۔“
 ”پرواہ اور فکر۔“ وہ استہزاء سی لہجے کے ساتھ گویا ہوا۔
 ”آپ نے مجھے سب کی نظروں میں گرا دیا ہے۔“
 ”ٹھیک ہے ختم کرو یہ رشتہ تم مجھے اذیت دے دے کے مار دو گے۔ شہزیل کیوں احسانات کا بدلا اتار رہے ہو۔“ وہ پھٹ پڑی۔

”احسانات کا بدلہ ارے میں نے تو کچھ بھی نہیں اتارا۔“ وہ اس کے چیخنے پر ذرا سنبھلا۔
 ”بٹ اپنی دے آپ کی اور میری گفتگو اور بحث یہ لانتا ہی ہے کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے کیونکہ ساری زندگی آپ مجھے ایسے ہی برداشت کریں گی پھر کیا ہو گا آپ اکٹا جائیں گی۔“ اسے جیسے ماہا کی فطرت سے آگہی تھی۔
 ”میں نے تم سے محبت کی ہے کوئی دل کو بہلا دانی نہیں تم جتنا بھی مجھ سے بھاگو دیکھنا ایک دن تم خود میری محبت اور اہمیت کو مان جاؤ گے۔“ اعتماد یقین اور وثوق تھا۔

شہزیل نے بغور دیکھا وہ سنجیدہ اور اداس بھی ہو رہی تھی۔
 ”آپ لیپ ٹاپ چیک کر لیجئے گا اور پھر بتا دیجئے گا۔“ وہ انگوڑ کر تا ہوا مڑ گیا تھا۔
 ماہانے دانت پیسے مگر حسرت بھی جو وہ اسے جاتے دیکھتی رہی۔
 شہزیل گاڑی میں بیٹھ گیا تھا اور پھر وہ آہنی گیٹ سے گاڑی لے کے نکل گیا تھا۔
 ”اللہ کرے شہزیل تم بھی میری محبت کے لیے ترسو۔“ آنکھوں میں نمی در آئی لیپ ٹاپ اٹھایا۔ شام بھی گہری ہو چکی تھی نواداسے ڈھونڈتا ہوا لان میں آ گیا تھا۔ بشری اسے بلارہی تھیں۔

☆.....☆

”ضیاء کل میں کچھ بڑی رہوں گا آفس تم دیکھ لینا۔“ انہوں نے کہا جو ذرے کے بعد لاؤنچ میں آ گئے۔
 164 بج کی ایل ای ڈی پر نوز لگا کے بیٹھ گئے تھے۔

وہ کافی دیر تک ہرے بھرے پھولوں سے بھرے لان میں بیٹھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا میں بیٹھی رہی۔
 اتنے میں وہ بھی بلک پیٹ پر کریم لائٹنگ شرٹ میں بلیوس نکھرا نکھرا کہیں جانے کے لیے باہر آیا تھا۔ ماہا کے دل میں کچھ ہوا۔ اپنی تنقیدی نگاہیں اس پر جمائے ہی رہ گئی تھیں۔
 ”ہر وقت اکڑا رہتا ہے پتا نہیں بعد میں بھی ٹھیک ہو گا یا نہیں۔“ وہ سوچ رہی تھی۔
 شہزیل نے گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کا ڈور کھولا اور جھک کر کچھ نکالا۔ کوئی بیک نما چیز تھی۔
 وہ نکلا اور چلا ہوا آئے لگا۔

”یہ آپ کا لیپ ٹاپ۔“ شہزیل نے اس کی طرف بڑھایا۔ وہ خیالوں اور سوچوں سے باہر آ گئی۔
 ”اچھا۔“ جھٹ لپک کے لیا۔
 ”تمہاری طرف سے ہے۔“ خوش فہمی میں جھٹلا ہو کے پوچھا۔
 ”غیب انکل نے مجھ سے کہا تھا میں لے آؤں۔ آج دوپہر میں لیا تھا آپ نظر اب آئی ہیں۔“
 ”نظر تو روز آتی ہوں مگر تم ہی دھیان نہیں دیتے ہو۔“ ذومنی لہجے میں طنز کیا۔
 شہزیل نے لب بھینچ لیے وہ یہ طنز خوب سمجھ رہا تھا۔
 ”آپ چارج کر لیجئے گا اور چوبیس گھنٹے یوز کریں اگر کوئی مسئلہ ہو تو بتائیے گا چھینچ ہو جائے گا۔“ وہ اسے ہدایت بھی دینے لگا۔

”اس میں مسئلہ ہو گا تو تمہیں بتا دوں جب مجھے تو تم سے مسئلہ.....“ اس نے ترجمہ نگاہ شہزیل پر ڈالی لیپ ٹاپ اس نے جھولے میں اپنے قریب رکھ لیا تھا۔
 ”میں تو ساری زندگی آپ کے لیے مسئلہ بنا رہوں گا۔ ابھی بھی فیصلے کا اختیار آپ کو ہے اپنا راستہ بدل لیں۔“ وہ بھی ترکی یہ ترکی جھٹ گویا ہوا۔

”محبت میں فیصلے نہیں ہوتے ہیں۔“ وہ ہنسی تھی۔
 ”بغیر محبت کے بھی زندگی سہل نہیں گزرتی۔“ اس نے ماہا کے گلانی پر سوچ چہرے پر گہری نگاہ ڈالی۔
 ”یہ تو تمہیں سوچنا چاہیے۔“ وہ بھی کب ہار ماننے والوں میں سے تھی۔
 شہزیل خفیف سا ہو کے لا جواب ہو گیا۔

وہ پراعتاد بنی ایک پاؤں سے جھولا ہلا رہی تھی۔ شہزیل جانے کے لیے مڑا۔
 ”سچائی سے بھاگ کے جا رہے ہو۔“ لہجے میں طنز تھا۔
 ”سچائی سے نہیں آپ کے غصے سے بھاگ کے جا رہا ہوں۔“
 ”تمہیں کیسے پتا لگا تجھے غصہ آ رہا ہے۔“ ماہاس کے حیران رہ گئی۔
 ”یہ جو آپ مجھ پر طنز کر رہی ہیں یہ آپ کے غصے کو واضح کرتا ہے۔“ وہ اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔
 ”غصہ بھی مجھے تم پر آتا ہے جسے سوائے کسی کی فکر نہیں۔“
 ”یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں۔“ اس نے اپنی مسکراہٹ روکی۔ ماہا کا سرخ و سپید چہرہ بلیک کلر میں دک رہا تھا۔
 مگر آنکھوں اور چہرے سے غصے کے شرارے بھی واضح تھے۔
 ”تم میری نفی کرتے ہو بھی مجھ سے متفق ہوتے ہی نہیں ہو۔“ وہ تپ کے گویا ہوئی۔

”جی اچھا۔“ اس نے ٹکیل احمد پر ایک نظر ڈالی۔

”اور ہاں پانچ لاکھ کیش کروالینا۔“ ساتھ ہی ہدایت بھی دی۔

”پانچ لاکھ۔“ ضیاء نے چونک کے دیکھا۔

”ثیاملاز مہ سے ٹیکل صاف کروا رہی تھیں اور حمزہ بھی اچھلتا کودتا ہوا آگیا۔

”یار تم تو ایسے چونک کے مشکوک لگا ہوں سے دیکھتے ہو جیسے میں تمہارا باپ نہیں تم ہو۔“ وہ برہم ہو گئے۔

”ضیاء جزبز ہو گیا ثیا کو ان کی کھسیانے اور بے زاری کی عادت پر بھی افسوس ہی ہوتا تھا۔

”نہیں ابو میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ آپ کبھی اچانک سے پیسے نکالنے نہیں ہیں۔“ وہ ٹپٹاتا گویا ہوا

”کیونکہ ٹکیل احمد کا جارحانہ اور برہم لہجہ ٹکی نہیں تھا۔

”جلدی نکلوا لینا میں آفس تو جاؤں گا نہیں۔“

”ثیا کے جانچتے اور تفتیشی انداز نے حمزہ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

”ای آپ ابو کو ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے ابو پیسے اپنی گرل فرینڈ کے لیے لے رہے ہوں۔“ اس نے بے

ساختگی سے کہا۔

”فضول مت ہانکا کرو۔ ابھی سن لیا تو تمہاری بھی شامت آجائے گی۔“ انہوں نے حمزہ کے سر پر چپٹ

لگائی۔

”ارے بھئی آپ فارغ ہو گئی ہوں تو ذرا ادھر آ کے تو بیٹھیے۔“ ٹکیل احمد نے رخ موڑ کے ثیا کو دیکھا جو

ڈانٹنگ ہال میں حمزہ سے باتوں میں لگی تھیں۔

”ضیاء نے ایک نگاہ اٹھائی اس کا ذہن بہت کچھ سوچ رہا تھا۔ فہر کی مہم ہی وہ بات ضرور کچھ تو ہے جو ٹکیل احمد

چھپا رہے تھے کون سا فلیٹ ہے اور کہاں ہے؟ اس کے ذہن میں سوالیہ نشان تھا۔

”نئی آتی ہوں۔“ ڈانٹنگ ٹیکل کو صاف کرواتے وہ خود بھی ہاتھ دھو کے آگئی تھیں۔

”ای ابو نے آپ کو بلایا ہے کچھ تو ہے۔“ حمزہ کو بھی تجسس ہوا وہ ان سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔

”ثیا کا ڈیوچ بریڈ گئی تھیں جب کہ ضیاء کی نگاہ ایل ای ڈی کی اسکرین پر غائبانہ ہی تھی۔

”آپ ضیاء کی شادی کب تک کریں گی۔“

”کیا شادی.....!“ حیرانگی سے اچھلنے کی ضیاء کی باری تھی۔

”ارے واہ! ابو آپ نے تو چھکا مار دیا۔“ حمزہ کو تو سن کے ہی مزہ آیا۔

”اس کی شادی بہت ضروری ہے کیونکہ یہ اپنی بیوی اور بچوں میں مصروف رہے گا تو باپ کی ٹوہ میں نہیں

رہے گا۔“ ضیاء تو ٹکل ہو گیا۔

”ثیا ہنسنے لگیں جب کہ حمزہ کا تو زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

”آہستہ ہنسوانا توں کی طرح۔“ ٹکیل احمد نے اسے سرزنش کی حمزہ کی تپسی اندر ہو گئی۔

”آپ اس کے بارے میں سوچیے۔“ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھے۔

”ثیا نے چونک کے ان کے چہرے کے تاثرات دیکھے جب کہ ضیاء تو لب بھینچ کے رہ گیا۔

”صاحبزادے سے پوچھ لیں اگر کوئی پسند ہو تو۔“

”میری کوئی پسند نہیں ہے اور مجھے شادی کرنی بھی نہیں ہے۔“ وہ تو تنک گیا۔

”سنو شادی تو تمہیں کرنی ہوگی کیونکہ تمہارے باپ کی بھی ہوئی ہے۔“ وہ سختی سے گویا ہوئے۔

”ابو آپ تو میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں۔“ وہ کھسیا گیا۔

”میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو آپ اس کے لیے لڑکی دیکھیں اور جلد سے جلد شادی کریں۔“

”ابو اتنی جلدی لڑکی ملنا مشکل ہے۔“ حمزہ نے پھر اپنی مداخلت ضروری سمجھی۔

”تم تو چپ کرو۔“ ضیاء نے بھی سے ڈانٹ دیا کیونکہ اس کی رو نے جیسی صورت ہو رہی تھی۔

”ثیا کو ہنسی تو آ رہی تھی مگر وہ خود پر کنٹرول کیے بیٹھی تھیں۔

”میں جارہا ہوں کہیں ضروری میٹنگ ہے۔“

”رات میں بھی میٹنگ ہے؟“ ثیا نے ناگوار سے پوچھا۔

”ہوں آج اوں گا گیارہ بجے تک۔“ وہ اپنا سیل اور گاڑی کی چابی اٹھا کے چل دیئے۔

”انہیں اگر اپنے کسی کام سے جانا ہوتا تھا تو سلام کو ساتھ نہیں لے جاتے تھے بلکہ گاڑی خود رانہ کرتے تھے۔

”ضیاء کوئی پسند ہے لڑکی؟“

”امی کیا ہے آپ بھی۔“ وہ چڑ گیا۔

”بیٹا تمہاری عمر شادی کی ہو گئی ہے۔ اچھا ہے ہو آجائے گی۔ مجھے بھی آسانی ہوگی پورا دن اکیلی ہوتی

ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”میں کنول سے کہوں گی زہرہ بھی فہر کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ اچھا ہے تم دونوں ساتھ منٹ جاؤ

گے۔“ حمزہ کی تو اس کی صورت پر کھی کھی ہو رہی تھی۔ ضیاء تو الگ مسئلوں میں الجھا ہوا تھا یہ شادی کا گھڑاک پھیلا

دیا تھا۔

”امی رشتے کروانے والی سے بھی رجوع کر لیں۔“ حمزہ نے پھر شرارت سے لقمہ دیا۔

”اپنی شادی کے لیے کر لینا رجوع۔“ وہ اس کے سر پر چپٹ لگا کے غصے میں اٹھ گیا۔

”ثیا الگ پریشان تھیں ٹکیل احمد کی سرگرمیاں بڑھتی ہی جارہی تھیں زیادہ تر وقت ان کا باہر گزرنے لگا تھا۔

”امی مجھے پتا ہے آپ کیا سوچ رہی ہیں۔“

”کچھ نہیں سوچ رہی، تم اٹھو اور زہرہ کا نمبر ملا کے دو۔“

”کیوں پھو پھو کو کیوں۔“ اس نے حیرانگی سے استفسار کیا۔

”خیر خیریت لوں گی بہت دن سے وہ آئی بھی نہیں ہے اور میں ضیاء کے لیے بھی بات کر لوں گی۔“

حمزہ نے پی ٹی وی ایل سے نمبر ملا دیا تھا۔ ثیا زہرہ سے باتوں میں لگ گئی تھیں اور حمزہ ضیاء کو تنک کرنے اس

کے رد میں جارہا تھا۔ ابو کا کریڈٹ کارڈ ٹیکل پر پڑا نظر آیا وہ رک گیا۔

”ثیا نے اشارے سے اس سے لے لیا۔

”کنول سے کہنا ضیاء کے لیے بھی کوئی لڑکی دیکھ لے۔“

”ہاں ہاں ارادہ کر لیا ہے۔“ ثیا نے انہیں بتا رہی تھیں۔

”امی لڑکی کی خوبیاں بھی تو بتائیے۔“ حمزہ نے بغیر شرارت سے کہا۔
”تم اپنے روم میں جاؤ مجھے بات کرنے دو۔“ انہوں نے اسے گھموراہہ ہنستا ہوا چلا گیا تھراپا کافی دیر تک زہرہ سے باتوں میں لگی رہیں۔
”تم فہر کے لیے بھی تو کوئی لڑکی دیکھ رہی تھیں؟“
”کنول سے کہا تھا کہ کنبے لگی کہ ابھی رک جائیں۔“ زہرہ نے بتایا۔
”زہرہ میں تو اکیلی رہتی ہوں سارا دن ان کے ابو نے کہا نیا ہی شادی کرو۔“
”نیا سے پوچھی کوئی لڑکی تو پسند نہیں ہے؟“
”اسے میں جانتی ہوں بالکل اپنے ابو کی طرح ہے صرف آفس، آفس اور کچھ نہیں۔“ ثریا نے انہیں بتایا۔
حمزہ مسلسل درمیان میں انہیں لٹھے دیے جارہا تھا۔
”اچھا زہرہ میں تم سے بعد میں تفصیلی کسی دن ٹھہر آ کے بات کروں گی یہ حمزہ بہت جگ کر رہا ہے۔“ انہوں نے پھر ان سے اجازت لی تھی۔
”ذرا تیز چھو کے نہیں گزری۔ بات بھی نہیں کرنے دی۔“ انہوں نے حمزہ کو سرزنش کی۔
”میں یہ بتانے آ رہا تھا بھائی جان کو دیکھیں جا کے گم سم سے بیٹھے ہیں لاؤنج میں۔ پوچھیے ان سے جا کے۔“ اس نے بتایا۔
”اچھا! وہ انہیں اور نیا کے پاس چلی آئی تھیں۔“
”امی پلیر شادی پر کوئی بھی ڈسکس نہیں کیجے گا۔“ وہ چڑا ہوا تو پہلے ہی تھا۔
ثریا کو ہنسی آگئی۔
”اچھا نہیں کر رہی مگر صورت ٹھیک کر دو تمہاری پسند کا خاص خیال رکھوں گی۔“ انہوں نے اس کی پشت پر تھکی دے کے شرارتی انداز میں یقین دلایا وہ جھینپ گیا حمزہ کو دیکھ کر وہ اٹھا کیونکہ مسلسل تنگ جو کیے جارہا تھا۔
☆.....☆
آرکیہ کی مانی گئی تھی حنین نے بھی چپکی سادھ لی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کسی طرح تو اس سے بات ہو جائے۔ مگر وہ تو رانداری اور سیڑھیوں کی صفائی تک کرتی نظر نہیں آتی تھی یا پھر اس نے جان بوجھ کے کرنی چھوڑ دی تھی۔ کبھی شمر تو کبھی ناہید آئی صفائی کرتی تھیں۔
شادی کے دن اس تیزی سے گزر رہے تھے کچھ وقت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ حنین کی چاب بھی بہت اچھی تھی۔ تا صرف گاڑی ملی تھی بلکہ اس کی سیلری میں بھی معقول اضافہ ہوا تھا۔ انیسہ تو بہت خوش تھیں کیونکہ آرکیہ ان کے گھر میں آنے سے پہلے ہی خوشی میں اضافہ کا باعث تھی۔
”بھائی اپنے روم کے پردے تو چینچ کر ڈالیں۔“ حرا نے کہا۔
”مجھے کیا پتا تم لوگ جانو پردے چینچ کرنے میں یا نہیں۔“ وہ انبار کے مطالعے میں منہمک تھا۔
”میں آرکیہ کو ساتھ لے لوں گی وہ اپنی پسند سے لے لے گی۔“ انیسہ نے ڈانٹنگ ٹینل پر روئی کا ہاٹ پاٹ رکھا۔

”امی آپ ہر معاملے میں اس سے کیوں پوچھتی ہیں۔“ وہ خواہ مخواہ ہی جڑ کے بولا تھا۔
”ارے ابھی تک میں نے اس سے پوچھا ہے اور اس نے ابھی تک بھی نہ تو اپنی کوئی پسند بتائی اور نہ ہی شاپنگ کرنے گئی ہے۔ تم کیوں اتنا چڑ رہے ہو۔“ انہوں نے تاسف اور حیرانگی سے کہا۔
”اتنے میں حسن بھی کھانے کے لیے آگیا۔ حرا گلاس اور جگ رکھ رہی تھی۔“
”ظاہر ہے مجھے تو چڑ ہوگی آپ اتنا سر چڑھا رہی ہیں۔ اپنی مرضی اور پسند سے کریں شاپنگ۔“
”بھائی جان کول کول۔“ حسن بھی اس کے غصے سے بولنے انداز پر گویا ہوا۔
”ارے میں تو اس لیے پوچھ رہی ہوں اچھا ہے اپنی پسند سے لے تو میری ذمہ داری ختم ہو۔“ وہ خاصی تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔
وہ تینوں کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ انیسہ کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ انہوں نے حنین کے سامنے اپنی طبیعت ظاہر نہیں کی تھی مگر حسن نے انہیں بغور دیکھا۔
”امی..... امی کیا ہو رہا ہے آپ کو۔“ وہ چیڑ سے اٹھا۔ حنین بھی چونکا حرا نے تو ہاتھ میں پکڑی روٹی پلیٹ میں رکھی۔
”امی امی کیا ہو رہا ہے۔“ حرا تو رونے لگی تھی۔ اتنے میں انیسہ بے ہوش ہو گئیں حنین بھی گھبرا گیا۔ اچانک سے ان کی طبیعت خراب ہو گئی تھی۔
وہ دوڑ کے قریبی کلینک سے ڈاکٹر کو لے آیا۔ رات تھی، ڈاکٹر بھی آنے میں نخرے کر رہا تھا۔
”بی بی بالی ہے۔ کوئی ٹیبلٹ تو لینی ہوگی۔“
”روزانہ ناشتے کے بعد کھاتی ہیں۔“ حنین نے بتایا۔
”گلتا ہے آج نہیں کھائی ہے انہوں نے فوراً ٹیبلٹ کھلائیں اور انہیں جوس وغیرہ دیں آرام کروائیں کچھ ٹینشن بھی لگ رہی ہے۔“ ڈاکٹر نے تفصیلی چیک اپ کرنے کے بعد کہا تھا۔
حرا تو اوپر سے ناہید آئی کو بھی بلا کے لے آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اپنے سامنے ہی ٹیبلٹ کھلوائی تھی۔
”امی آپ ذرا خیال نہیں رکھتی ہیں۔“ وہ ڈاکٹر کے جانے کے بعد ان پر ناراض ہونے لگا۔
”بیٹا آج ہی بھول گئی تھی ٹیبلٹ کھانی۔“
”تم دونوں تو کم از کم ان سے پوچھ لیا کرو یہ دوائی کھاتی بھی ہے یا نہیں۔“ وہ انیسہ کا سر دبا رہا تھا۔ ناہید کو دیکھ کر وہ ذرا سنبھل گیا۔
”باجی کیسی طبیعت ہے۔“
”ٹھیک ہوں۔“ انیسہ نے کہا۔
”ناہید میں تو جلدی کی ہی شادی کی تاریخ رکھ رہی ہوں کافی دن لگ رہے ہیں شادی میں۔“
حنین کو ان کی جلد بازی پر ذرا غصہ بھی آیا۔
”امی..... امی آپ کیا کر رہی ہیں؟“
”تم چپ کرو۔“ انہوں نے حنین کو ڈانٹ دیا۔



ہماری ضرورت پوری ہو رہی ہے اللہ تعالیٰ نے ہمارا کام چار رکھا ہے اور ہمارے لئے ہمارا اللہ کافی ہے۔ وہ مطمئن انداز میں بولے۔

”لیکن گھر میں جانے کی پتی‘ کافی‘ چینی نہیں ہے رمضان تو جیسے تیسے گز رہی گیا ہے تقریباً اور اس مہینے نے ہمارے فاقوں کا بھرم رکھ لیا کہ گھر میں کھانے کو کچھ نہیں بچا تو روزے رکھ لئے عبادت بھی ہو گئی اور عزت بھی جچ گئی، لیکن دو تین روز میں عید الفطر ہے تب کیا کریں گے؟ پہلی بار ایسا ہو گا کہ ہم عید ملنے کے لئے آنے والے مہمانوں کی خاطر مدارات نہیں کر سکیں گے، مجبور اور شربت پر ہی عید مبارک کہنا پڑے گا اور تو اور اس بار ہم چوڑیاں جھسکے نیاز پور بھی نہیں خرید سکیں گے بھلا ایسی ہوتی ہے عید آپ ہمیشہ ہمیں عیدی دیا کرتے ہیں تختہ دیا کرتے ہیں وہ بھی اس بار ملتا دکھائی نہیں دے رہا۔“ عفت آراء کا دکھ اور غم کی طور پر کم نہیں ہو رہا تھا بولتی چلی گئیں نواب خبیب الحسن زری سے سمجھانے لگے۔

”اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھو وہ ضرور کوئی نہ کوئی سبب پیدا فرما دیں گے اور آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں عفت آراء بیگم کے بچپن سے لے کر آج تک آپ ہر عید بہت شان اور اہتمام سے منائی ہے ان شاندار اور خوشگوار عیدوں کا شکر یہ ادا کیا آپ نے؟ نہیں نا؟“ سینکڑوں خوشگوار عیدوں کا شکر یہ ادا نہیں کیا آج تک اور ایک عید ذرا سی مفلسی میں آ رہی ہے تو آپ نے شکوے شکایتوں کی زبان کھول لی ہے بلکہ دکان کھول لی ہے تو بہت غلط بات ہے بیگم صاحبہ

”عفت آراء! آپ کیوں منہ بنائے بیٹی ہیں؟“ نواب خبیب الحسن نے انہیں منہ بسورے بیٹھے دیکھ کر پوچھا تو وہ ساٹ لہجے میں بولیں۔

”ہمارا منہ تو پہلے سے بنا بنا ہوا ہے ہم کیوں بنانے لگے؟ ہم سے تو عید کے لئے شیر خرما بھی نہ بن سکے گا اب کے۔“

”کیوں بھی عفت آراء! ایسا کیا ہو گیا؟“

”جیسے آپ تو کچھ جاننے ہی نہیں ہیں؟ نام کی نوابی میں صرف چار دن کی عزت ملا کرتی ہے پیٹ نہیں بھرا کر نواب صاحب ساری عمر جس دپور کو ہم نے باں اور جس بھائی کو آپ نے باپ بن کر پالا پوسا، اعلیٰ تعلیم دلوائی شادی کرائی وہی ہماری پیٹھ میں پھرا گھونپ کر چلے گئے ساری دولت تھیلی نہیں پیسے پیسے کو محتاج کر دیا اور آپ چاہتے ہیں کہ ہم اب بھی چین کی بانسری بجا سکیں۔“ عفت آراء نے آزر دگی سے کہا تو وہ تھک چکی تھی۔

”نہیں لیکن رمضان کی رحمتوں برکتوں والے ماہ مبارک میں نا امید ہونا دل بردارنا تو اچھی بات نہیں ہے نا، ہمیں یقین ہے کہ چھوٹے بھائی صاحب کو جلد احساس ہو جائے گا کہ انہوں نے ہمارے ساتھ غلط کیا نا انصافی کی وہ خود واپس بھی لوٹے تو بھی ہمارے حصے کی جائداد ہمیں ضرور لوٹا دیں گے۔“ نواب خبیب الحسن نے خوش قسم اور پر امید لہجے میں کہا تو وہ مسک کر بولیں۔

”بھول ہے آپ کی کوئی واپس لوٹانے کے لئے تو نہیں لوٹنا نواب صاحب۔“

”چلیں خیر وہ بد خوش ہیں ہمیں کوئی غم نہیں ہے

”انیہ بانی آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں تین مہینے تو رہ گئے ہیں۔“

”ناہید مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔“ انیہ نے نگر زدہ لہجے میں کہا۔ جن دن وہاں سے اٹھ گیا جب کہ حرات اور جلدی شادی کا سن کے خوش ہو گئی۔

”باجی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”میں جانتی ہوں آریک جلدی آ جائے۔“ وہ ان کا ہاتھ تھام کے گویا ہوئی۔

”ناہید تہذیب کا شکار ہو گئی تھیں انیہ اتنی پریشان ہو رہی تھیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دیں۔“

”میں آریک کے ابو سے بات کروں گی ویسے بھی ہال بک کروائے جانے والے ہیں آج کل میں۔“

”تم ایسا کروا گلے مہینے کی میں تاریخ کار کھ لو۔“

”اچھا اچھا آپ اتنی پریشان نہیں ہوں۔“ وہ انہیں تسلی دینے لگیں۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ ان سے اجازت لے کے چلی گئی تھیں۔

”جنین نے تو اپنا سر ہی تھام لیا تھا۔“

”جنین مجھے تمہاری طرف سے فکر ہے۔ تمہارے موڈ کی کوئی خبر نہیں ہے کسی کی بچی کو میں نے بڑی چاہو سے مانگا ہے۔“ انہیں تو اندیشے ستانے لگے تھے۔

”جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ میں آپ کو شرمندہ نہیں کرواؤں گا پھر کیوں آپ نے ان سے اتنی جلدی کا کہا۔“ وہ خاصا سنجیدہ لگ رہا تھا۔

”جانے کیوں دن مجھے پہاڑ کی طرح لگنے لگے ہیں مجھ سے تو بازار بھی نہیں جایا جا رہا آریک چلتی نہیں ہے۔“

”کیوں آپ جا رہی ہیں اسے جو کچھ لینا ہو گا آ کے لے لے گی خود۔“ اس نے انیہ کا کزور اور نحیف چہرہ خاصی فکر مندی سے دیکھا۔

”بیٹا دلہن کے جوڑے اور چیزیں ضروری ہوتی ہیں پھر دلہن کے رشتے دار وغیرہ بھی تو پوچھتے ہیں بری میں کیا آیا۔“

”اف امی ایک تو آپ عورتوں کی سمجھ نہیں آتی بری چیز پنا نہیں کیا کیا نہیں بنائی ہوئی ہیں کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو بازار جانے کی جو ہو گئی شاپنگ بہت ہو گئی ہے۔“ اس نے بھی قطعیت بھرے لہجے میں انہیں کہا۔

”بیٹا تھوڑی بہت رہ گئی ہے۔“

”میں سمجھ گیا آپ نے شادی کی تیاری کی ٹینشن لے لی ہے۔“ وہ بولا۔

”میرے پہلے بیٹے کی شادی ہے کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رہنے دینا چاہتی۔“

”بس امی رہنے دیں جو کچھ آپ کو چاہیے مجھے بتا دیں میں خرا کو ساتھ لے کے آؤں گا۔“ اس نے بھرا پنی خدمات پیش کیں۔

”شادی ولیم کا سوٹ رہ گیا ہے میں نے کہا وقت کے وقت لوں گی تو زیادہ اچھا ہے۔“

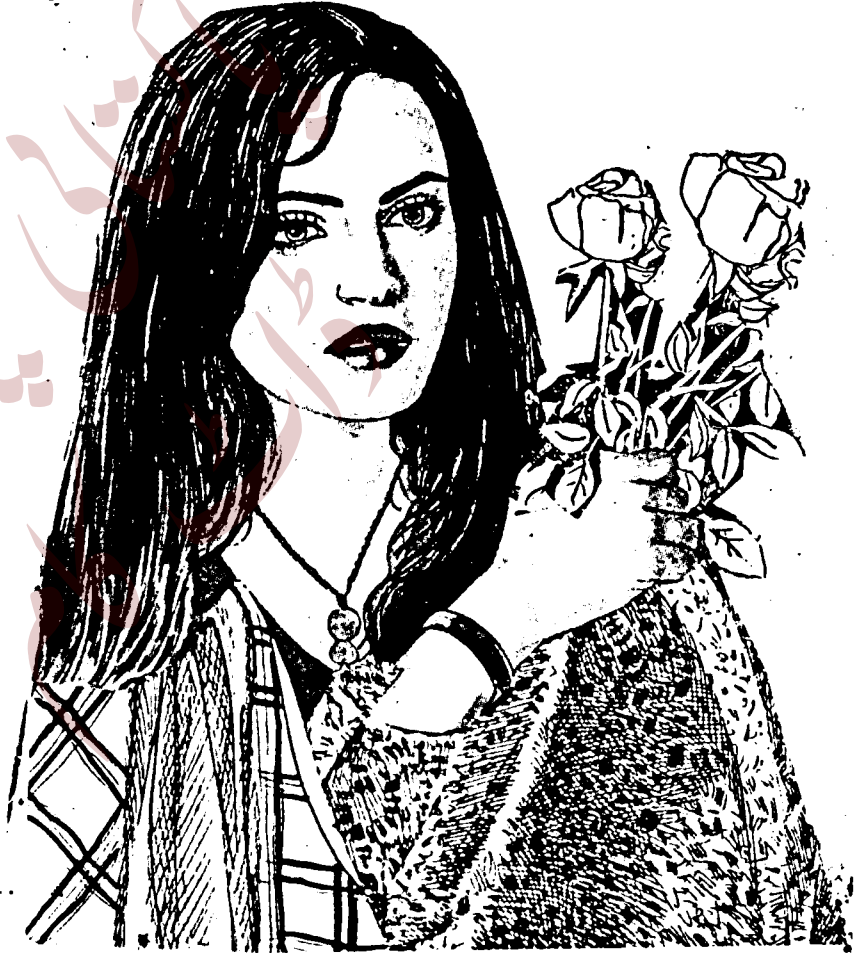
(جاری ہے)

انسان اگر شکر ادا کرتا رہے تو زبان کو شکوہ کرنے کی عادت نہیں پڑتی۔“

”ہاں درست فرمایا آپ نے ہم نے تو یہ سوچا ہی نہیں کہ آج تک ہم ساری عیدیں ہنسی خوشی اپنی ہر خواہش کو پورا کرتے ہوئے بڑے اہتمام سے مناتے رہے ہیں کیا ہوا اگر ایک عید پر ہاتھ تنگ ہو گیا تو عید تو جھکیوں میں رہنے والے ہی مناتے ہیں پھر ہم کیوں نہیں ہم تو اپنے گھر میں رہتے ہیں ہاتھ تنگ ہے سوچ اور دل کیوں تنگ کریں ہم۔“ عفت آرام نے ان کی بات کو سمجھتے ہوئے شرمندہ ہو کر کہا تو وہ

مسکراتے ہوئے بولے۔

”ہاتھ تنگ ہو تو ہاتھ پھیلا دیں اللہ کے سامنے پھر دیکھیں کیسے آپ کے ہاتھ اپنی نعمتوں سے اور جھولی اپنی رحمتوں سے بھر جائے۔“ نواب فیب الحسن مسکرا کر نرم دھیمے لہجے میں بولے تو وہ پریم آنکھوں کے ساتھ انہماک میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دیں۔ نواب فیب الحسن اور بیگم فردوس نواب مزید الحسن کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے نواب فیب الحسن اور ان سے دس برس چھوٹے نواب اریب الحسن تھے نواب مزید الحسن ریاست بہاولپور کے نواب تھے رحم دل



تھے جدی پشتی نواب ہونے کے باعث سب ان کا احترام کرتے تھے عفت آرام میں برس کی تھیں جب وہ کہیں بن کر نواب حویلی آئی تھیں اور نواب فیب الحسن اس وقت بائیس برس کے تھے بیگم فردوس نواب مزید الحسن کو نمونیا ہوا اور جابر نہ ہو سکیں ایسے میں بارہ سالہ اریب الحسن کو عفت آرام اور نواب فیب الحسن نے خاص توجہ دی ماں اور باپ دونوں بن کر بالآخر وقت گزرتا چلا گیا نواب فیب الحسن اور عفت آرام کو اللہ تعالیٰ نے ایک بیٹے اور ایک بیٹی سے نوازا تھا دونوں کی شادی کے بعد وہ عمرہ کر کے لوٹے نواب اریب الحسن کی شادی ان کی پسند سے کرائی گئی تھی ان کی بیوی نائلہ چونکہ نواب خاندان سے نہیں تھیں لہذا وہ ”نواب حویلی“ میں رہ کر ان کے طور طریقے اپنانے میں بالکل بھی اضطراب نہیں تھیں انہوں نے نواب اریب الحسن کو شہر میں اچھا سا بنگلہ خریدنے پر رضامند کر لیا اور ان کے بچاؤ سے اس آ کر ہی وہ اپنے ماں باپ جیسے شفیق بھائی بھابی کو دھوکا دے گئے ساری جائیداد بہت ہوشیاری سے اپنے نام کرائی تھی یہ بھی غیبت تھا کہ ”نواب حویلی“ انہوں نے رہنے دی گئی باپوں کہہ لیں کہ ”نواب حویلی“ چونکہ عفت آرام کے نام کردی گئی تھی اس لئے نواب اریب الحسن ”حویلی“ اپنے نام کرانے میں ناکام رہے تھے اور اپنی بیوی کو لے کر رحیم یار خان شفٹ ہو گئے تھے نواب فیب الحسن نے ایک اشاعتی ادارے میں کتابوں کے ترجمے کر کے دینے کا کام شروع کر دیا تھا جو معاوضہ ملتا اس سے گھر کے اخراجات پورے ہو جاتے اور کچھ عفت آرام کو اپنے ذاتی زیورات فروخت کر کے اپنی نوابی شان کو قائم رکھنا پڑا تھا ایک سال ہونے کو آیا تھا پچھلے سال عید الفطر کے روز چھوٹے نواب ”نواب اریب الحسن اور ان کی بیگم نائلہ انہیں اور حویلی کو چھوڑ کر چلے گئے تھے اور پلٹ کر خبر تک نہ لی تھی کہ بڑے بھائی بھابی کس حال میں ہیں عفت آرام اور نواب فیب

الحسن کے چچا بیٹی شادی کے بعد کینیڈا شفٹ ہو گئے تھے انہیں ماں باپ کی پریشانی کی فکر ہی نہیں تھی اللہ وہ سب کچھ گنوائے پر ماں باپ کو ہی مورد الزام ٹھہرا چکے تھے کہ ان کی بے وفائی اور امداد سے اعتبار نے انہیں یہ دن دکھائے ہیں اولاد کے اس رویے نے الگ انہیں دیکر کیا تھا مگر وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں سرخرو رہے تھے اس بات کا اطمینان تھا انہیں۔

☆☆☆☆

”بیگم صلیب! شیر خرمنے بنانے کا سارا سامان لے آئے ہیں ہم اور مٹھائی نمکو بھی۔“ نواب فیب الحسن ہاتھوں میں شاپراٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔

”اتنا کچھ بچ بتائیے بیسوں کا بندوبست کس نے کیا؟“ رفت آرام پینتالیس برس کی عمر میں پینتیس برس کی خوبصورت خاتون لگتی تھیں تو نواب فیب الحسن سینتالیس برس کی عمر میں بہت باوقار اور شاندار شخصیت کے مالک تھے دونوں کی جوڑی خاندان بھر کی سرائتی نظروں کا مرکز رہی تھی ہمیشہ سے۔

”اللہ تعالیٰ نے۔“ نواب فیب الحسن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”وہ تو سے ہی مگر سبب وسیلہ تو بتائیں؟“

”ارے بیگم صلیب! ہم نے ایک انگلش ناول کا ترجمہ کیا تھا آج اسی کی رائٹنگ ملی تھی سو ہم یہ سامان خرید لائے ہیں کچھ اور ضروری سامان بھی آجائے گا ہم نے کریمانے والے کو پیسے اور سامان راشن کی لسٹ بھیج دی تھی وہ شام تک سب سامان دے جائے گا۔“

”یا اللہ شکر ہے پروردگار تو واقعی بڑا مہربان ہے رحیم و کریم ہے تیرا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔“ عفت آرام نے ہاتھ پھیلا کر ب کا شکر ادا کیا تو نواب فیب الحسن خوشی سے مسکرا دیے۔

”اریب میاں خوش نہیں ہیں بیوی سے بھی ناراضی چل رہی ہے اور اپنے کئے پر نادم بھی بہت

ہیں۔ اگلے روز نماز ظہر کے بعد مسجد سے گھر آ کر نواب زیب الحسن نے عفت آراء کو بتایا۔

”آپ سے یہ سب کس نے کہا؟“

”حنیف احمد ہیں ناں وکیل وہ جو رحیم یار خان میں پریکٹس کرتے ہیں عید کی چھٹیوں پر زرات ہی یہاں پہنچے ہیں گھر والوں کے ساتھ عید منانے کے لئے وہی بتا رہے تھے ان کی ملاقات ہوئی تھی اریب میاں سے بیوی کو طلاق دینے کا سوچ رہے ہیں اسی مسئلے میں وکیل صاحب سے ملاقات ہوئی تھی ان کی۔ انہوں نے تفصیل سے بتایا عفت آراء کو زیادہ حیرت نہ ہوئی۔

”وہ لڑکی ہمارے اریب کی دولت نوابی شان اور ٹیک حاصل کرنا چاہتی تھی اس کو عبت اریب سے نہیں تھی ان کے ساتھ جڑے حسب نسب سے تھی جو اس نے حاصل کر لیا اب اریب میاں کو وہ کس حد تک لوٹ چکی ہیں اللہ جانے مگر معاف کیجئے گا نواب صاحب اس لڑکی کے چھن گھر بٹانے والے ہرگز نہیں تھے اللہ اسے ہدایت دے ہمارے اریب میاں کے ساتھ بسنے کا احساس ان کی عبت نائلہ کے دل میں ڈال دے۔“ عفت آرام نے دل سے دعا کی۔

”آمین۔“ نواب زیب الحسن نے دل سے کہا۔

☆☆☆☆

آج عید کا دن تھا عفت آراء نے گھر کو تو ملازمہ کے ساتھ مل کر سناور لیا تھا شیر خرمہ اور منمن تو رمہ بھی صبح کھانا کھا تھا نواب زیب الحسن عید کی ہناز ادا کرنے مسجد گئے ہوئے تھے ان کی واپسی تک عفت آراء ہرے رنگ کی گولڈن ٹیس تار کے کام والی ساڑھی پہن کر تیار ہو گئی تھیں ہلکا سا لکٹ سیٹ پہنا مناسب میک اپ کیا اپنے پسندیدہ گولڈن جوتے پہنے اور خوش خوشی نواب صاحب کی آمد کا انتظار کرنے لگیں۔

”عفت آراء بیگم! دیکھئے تو ہمارے ساتھ کون

آیا ہے؟“ نواب زیب الحسن کی خوشی سے چمکتی آواز پر وہ اپنے کمرے سے دوڑی چلی آئیں اور شوہر کے ہمراہ دیوڑھی کد کھینچ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

”یہ ہے آپ کا عید کا تحفہ پسند آیا؟“ نواب زیب الحسن پوچھنے لگے۔

”نواب اریب الحسن آپ.....“ عفت آراء نے خوشی اور حیرت میں ڈوبے لہجے میں کہا تو وہ شرمندہ سے ان کے پاس چلے آئے اور دونوں ہاتھ جوڑ کر بولے۔

”بھائی بیگم! آپ ہماری ماں جیسی ہیں اور ہم نے اپنی ماں کو دکھ دیا، گناہ گار ہوئے اس کی سزا بھی مل گئی ہے ہمیں آپ پلیز ہمیں معاف کر دیں ہم لوٹ آئے ہیں آپ کے اور بھائی جان کے پاس ہماری جنت ہمارے ماں باپ تو آپ دونوں ہیں ہماری ہر خوشی آپ کی دعاؤں کی مرہون منت ہے پلیز ہمیں معاف کر دیں ہم نے آپ دونوں کو بہت دکھ دیا ہے بہت برے حالات سے دوچار کیا ہے ہم نے۔“

”آپ کو احساس ہو گیا آپ نام ہیں تو ہم نے بھی آپ کو معاف کر دیا ہے عید کے دن تو دشمن بھی گھر آ کر معافی مانگتے تو اسے معاف کر دینا چاہئے جبکہ آپ تو ہمارے اپنے ہیں ہماری اولاد کی طرح ہیں اللہ بھی آپ کو معاف کر دیں۔“ عفت آراء نے ان کے بندھے ہاتھ پکڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”بہت بہت شکر یہ بھائی بیگم! آپ اور بھائی جان بہت عظیم ہیں بہت اعلیٰ ظرف اور کشادہ دل کے مالک ہیں اور میں بہت ہی۔“ نواب اریب الحسن ایمانداری سے پر لہجے میں ان کی عظمت اور اپنی کم ظرفی کا اعتراف کر رہے تھے۔

”آپ بھی بہت اچھے ہیں چلے اب مسکرا دیجئے صبح کا بھولا شام کو بلکہ عید کی صبح کو گھر لوٹ آیا ہے ہمیں اور کیا چاہئے۔“ نواب زیب الحسن نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر

خوشگوار لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دیئے۔

”ایک منٹ۔“ نواب اریب الحسن یہ کہہ کر باہر گئے اور چند لمحوں میں واپس آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک سفید رنگ کی فائل تھی۔

”بھائی بیگم! یہ لیجئے۔“ فائل انہوں نے عفت آراء کی طرف بڑھا دی۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ فائل پکڑتے ہوئے حیرانگی سے گویا ہوئیں۔

”آپ کی عیدی۔“

”عیدی۔“ عفت آراء نے خیر آمیز نظروں سے نواب زیب الحسن کو دیکھا تو وہ بھی حیران دکھائی دے رہے تھے۔

”جی بھائی بیگم! یہ اس پر اپریل کے کاغذات ہیں جس کے لئے ہم نے اپنے ماں باپ کو چھوڑ دیا تھا اس ساری جائیداد کے اصل حقدار آپ دونوں ہیں ہم نہیں ہم یہ سب کچھ آپ دونوں کو واپس لوٹا رہے ہیں اس پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے بس ہمیں خود سے الگ مت کیجئے گا۔“

”ارے میاں! بھلا کبھی گوشت بھی ناخن سے جدا ہوا ہے آپ ہمارے بھائی ہیں بیٹے ہیں آپ کو ہم کبھی الگ کر سکتے ہیں کیا؟ ہرگز نہیں اور وہ آپ کی زوجہ محترمہ کہاں ہیں۔“ نواب زیب الحسن نے سنجیدگی سے کہا تو وہ بولے۔

”جہاں انہیں ہونا چاہئے تھا۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ بھائی جان کہ نائلہ کو ہم سے نہیں ہماری دولت سے پیار تھا وہ ہم سے جتنی دولت ہتھیار سکتی تھیں ہتھیالیں ہمیں جلدی ان کی حقیقت کا علم ہو گیا اور ہم نے انہیں طلاق دے دی ہے اب ہم وہاں شادی کریں گے جہاں آپ دونوں کی مرضی اور خوشی ہوگی ہم نے یہ جان لیا ہے کہ جو رشتے بڑوں کی مرضی کے خلاف ان کی نافرمانی کر کے بنائے جائیں وہ زیادہ دیر نہیں چلتے ہم آپ کی دعاؤں میں اپنی آئندہ

کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔“ نواب اریب الحسن نے سنجیدگی سے جواب دیا تو وہ دونوں مسکرا دیئے۔

”ہماری دعا میں تو ہمیشہ سے آپ کے ساتھ تھیں آپ کے یہاں سے چلے جانے کے بعد بھی ہم آپ کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔“ نواب زیب الحسن نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بولے۔

”اسی لئے تو میں لوٹ آیا ہوں عید کی شام ہونے سے پہلے۔“

”بہت اچھا کیا آپ نے ہمیں تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ صبح عید ہمارے لئے اتنا خوبصورت اور خوشیوں بھرا تحفہ لے کر آئے گی ہم سچ میں آج بہت خوش ہیں اتنی خوشی شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اس عید پر ہمارے دور جانے والے رشتے جو ہم سے آن لے ہیں۔“ عفت آراء نے مسکراتے ہوئے نواب اریب الحسن کے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے خوشی سے کہا۔

”تو بیگم صاحبہ! آپ کو عید ہی نہیں صبح عید بھی مبارک ہو جو ہمارے لئے ایک خوشگوار بہار شام کی نوید لے کر آئی ہے۔“ نواب زیب الحسن نے عفت آراء کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولیں۔

”آپ کو بھی عید مبارک ہو۔“

”خیر مبارک! اب شیر خرمہ ملے گا ہمیں؟“

”جی جناب بالکل ملے گا آپ دونوں تشریف رکھیے ہم ابھی شیر خرمہ لے کر آتے ہیں۔“ عفت آراء نے خوشگوار مڑوٹ میں مسکراتے ہوئے کہا اور کچن کا رخ کیا وہ دونوں بھائی ایک دوسرے کو عید مبارک کہتے ہوئے بغل گیر ہو گئے۔

”رنگ خوشی کے لائی ہے صبح عید آئی ہے ہر شے مسکرائی ہے صبح عید آئی ہے۔“

☆☆☆☆



”نہیں ارحم!“ فلک نے دو ٹوک لہجے میں کہا تھا ”کچھ دیر کے لئے خاموشی چھا گئی تھی۔“
 ”آخری دفعہ ریکویسٹ کر رہا ہوں جان۔“ فلک اس کے لہجے پر خشکی تھی۔
 ”مطلب ورنہ کیا کرو گے.....؟“ جواباً وہ ہنسا تھا۔

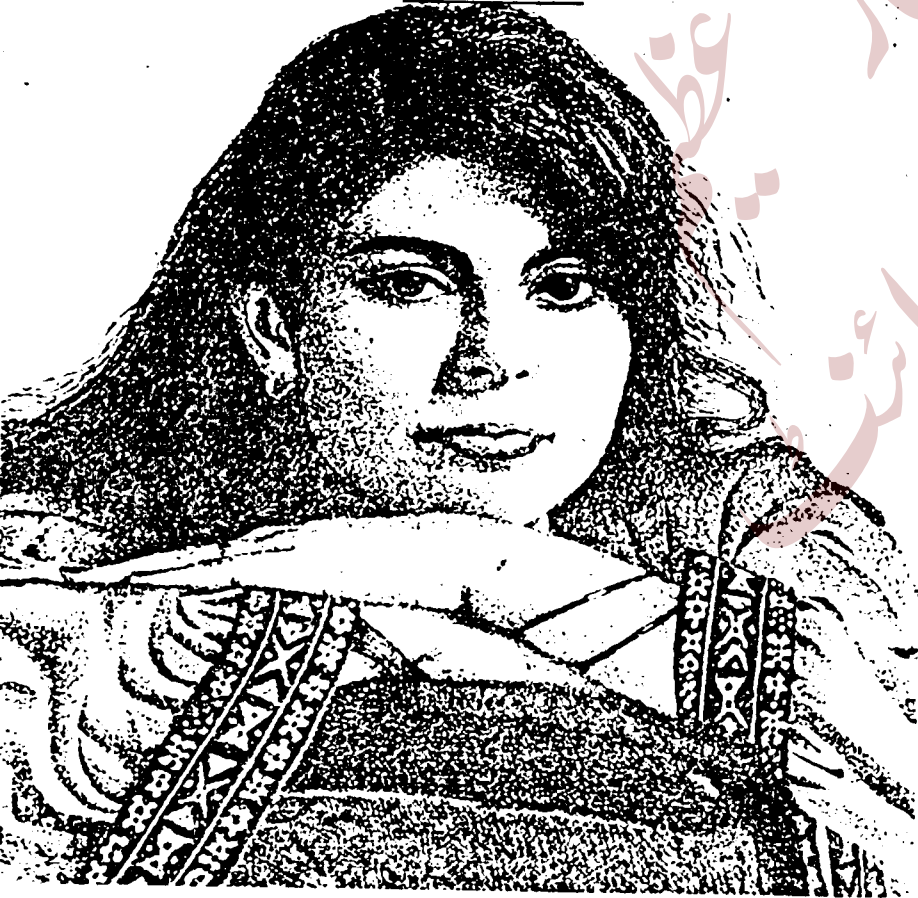
”وہ وہ یڈ بولیک کر دوں گا جس میں تم میرے گلے لگی بکھر جانے کی بات کر رہی ہو اور وہ والی جس میں تم واقعی بکھر بھی چکی ہو۔“ فلک اندر تک لرز کر رہ گئی وہ کیا کہہ رہا تھا اسے سانس لینے میں بھی دشواری محسوس ہو رہی تھی۔

”ارحم.....“ وہ کچھ اور نہیں بول پائی تھی۔
 ”سنڈے یاد رکھنا! میں انتظار کروں گا۔“ وہ زمین پر ڈھے سی گئی تھی ساڑھتی شروع ہو چکی تھی بد قسمتی کا منہس دور۔

☆☆☆☆

وہ بھابی کے ساتھ شاپنگ پر آئی ہوئی تھی ابھی کچھ دیر پہلے ان کو کوئی دوست مل گئی تھی تو وہ دونوں اب ساتھ تھیں ”ندا ان دونوں کے ساس بھی، بھوٹی بھی، ناپ فضل ناپک سے پور ہونے لگی تو الگ ہو کر مال کے اوپر بیٹھے جھے میں آگئی اور وہیں اسے وہ دکھائی دیا تھا۔“

بیسری فصط



”پرنس چارمنگ“۔ وہ جینٹل جسے میں کپڑے دیکھ رہا تھا وہ کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی تھی وہ دو ماہ بعد اسے دیکھ رہی تھی اس رات جب گڈ ٹائٹ کے ایس ایم ایس کے جواب میں ”کون“ کا جوابی پیغام آیا تھا تو ندانے دوبارہ کوئی بھی ایس ایم ایس نہیں کیا تھا۔

”السلام علیکم!“ وہ کسی ان دیکھی دور سے بندھی اس کے پاس آئی اس نے چونک کر دیکھا اور لمحوں میں پہچان گیا۔

”ندا..... ٹائٹس ٹومیٹ پو!“ ندا کے دل میں لڈو پھونٹنے لگی وہ اب تک اسے جانتا تھا۔

”کافی.....“ اس نے ندا کو آفر دی۔

”شیور“ کچھ دیر بعد وہ نرود کی کافی شاپ میں تھے۔

”میں نے آپ کا نمبر اسی دن ڈیلیٹ کر دیا تھا ندا ایونو دوست وغیرہ ایسے لڑکی کے نمبر سے آئے پیغامات دیکھیں تو تنگڑ بناتے ہیں پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں“۔ کافی کے سب لیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”آئی ہوپ آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہوگا مطلب یہ بھی تو ٹھیک نہیں ہے نا کہ کسی رشتے کے بغیر رات تک ایس ایم ایس ایس ایم ایس کھیلوں“۔ وہ مرعوب ہو رہی تھی۔

”نہیں نہیں آئی ڈونٹ مائنڈ! میں سمجھ رہی ہوں“۔ بھی بھائی آگئیں۔

”ارے ارجم! کیسے ہو ٹھیک ہو تم پھر آئے ہی نہیں.....؟ ہم انتظار کرتے رہ گئے تمہارا“ آئی کی ساتھ آؤ ناں۔ سوال پر سوال۔

”جی بھائی جلد آؤں گا“۔ وہ مسکرایا۔

☆☆☆☆

فلک نے جبر جبری لی ساٹنے اسکرین پر وہ ویڈیو چل رہی تھی جس میں وہ انتہائی شرمناک حالت میں ارجم کے ساتھ تھی اس نے بے معنی سے پاس بیٹھے ارجم کو دیکھا جو اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور آکھ ماری۔

”تم مجھے سے محبت کرتے ہو ارجم! تم نے کہا تھا“۔ اس کی آواز رندہ گئی تھی۔

”یقیناً کرتا ہوں میری جان! اور یہی چاہتا ہوں کہ تم ہمیشہ میرے پاس رہو بہت پاس“۔ اس کی کمر کے گرد بازو حائل کرتے ہوئے وہ بولا۔

”میں مر جاؤں گی ارجم!“ وہ رو پڑی اور دونوں ہاتھ اس کے سامنے جوڑ دیئے۔

”مجھے معاف کر دو! اس ویڈیو کو ضائع کر دو پلیز“۔

”ریلیکس جان! اتنی خوبصورت لڑکی میری وجہ سے روئے مجھ سے یہ ہرگز برداشت نہیں ہوگا“۔ وہ اسے گلے لگا کر بولا۔

”مجھے رسوا مت کر دارجم! جنہیں محبت کا واسطہ“۔

”نہیں کرتا، تم میری پیاس بجھاتی رہو“۔ ایک سروی لہر فلک کے وجود سے گزر گئی۔

”ٹھیک ہے مجھ سے شادی کرلو“۔ وہ جتہ مار کر ہنسا اور ہنستا چلا گیا۔

”جب شادی کے بغیر تم مجھے مل رہی ہو میرے پاس ہو تو پھر میں یہ طوق کیوں پہنوں آئندہ ایسا مذاق مت کرنا“۔ وہ ششدر رہ گئی وہ فلک ایسا کو ایک کھلونا سمجھ رہا تھا ایک ٹشو پیپر۔

”خدا کے لئے مجھ پر رحم کرو“۔

”اور تم مجھ پر رحم کرو“۔ وہ اس کے پیروں میں پڑنا چاہتی تھی وہ اسے اپنے اندر کہیں سمولینا چاہتا تھا اس کے دیکھنے لکس اب فلک ایسا کو دوزخ کے شعلوں جیسے محسوس ہو رہے تھے۔

☆☆☆☆

”ایک لقمہ اور.....“ حمزہ نے لقمہ اس کے منہ میں دیا تھا۔

”بس حمزہ! بہت کھا لیا میں نے اب مزید میں الٹ جاؤں گی“۔

”چلو ٹھیک ہے اب یہ جوس لے لو“۔ جوس کا گلاس اسے دے کر اب وہ برتن سینے لگا تھا۔

”میری عادتیں بگاڑ رہے ہو تم“۔

”سو تو ہے پر خیر ہے مجھے بگڑی ہوئی عادتوں والی بیوی بھی قبول ہے“۔ وہ مسکرایا اور برتن لئے کمرے سے نکلا اور باورچی خانے میں آیا برتن دھو کر ریک میں لگائے بیجا ہوا کھانا فریزر میں رکھا اور واپس کمرے میں آیا۔

”زنہب“۔ جوس کا گلاس فریش پر پڑا تھا وہ بے سدھ تھی اس نے آگے بڑھ کر اس کا گال تپتپایا تھا۔

”زنہب ہوش کرو!“ اس کے پیروں تلے سے زمین ٹھکے لگی تھی۔

☆☆☆☆

وہ بخار میں پھنک رہا تھا سر میں شدید درد تھا ایسے میں ابواسے بائو کا ٹیسٹ یاد کرنے کو دے گئے تھے وہ بشکل بیٹھا پڑھ رہا تھا آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا سردرد سے بوجھل تھا اور آنکھوں کے سامنے لفظ بھاگے دوڑے پھر رہے تھے۔

”احمد! ای کہہ رہی ہیں کھانا کھا لو آکر“۔ احمد اندر آیا تو وہ بے سدھ پڑا تھا۔

”احمد!“ وہ پریشانی سے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ اسے نزدیکی اسپتال لے آیا تھا اسی اسپتال کے دوسرے فلور پر حمزہ ڈاکٹر کے سامنے بیٹھا تھا۔

☆☆☆☆

نئے سمسٹر کی فیس جمع کروانی تھی اس کے پاس کل 32 روپے تھے ماموں کے روز روز کے اصرار پر اس نے 40 ہزار انہیں ادا کر دیئے تھے اب وہ خالی ہاتھ تھا اب وہ سر جھکا پائے اٹھوں کی طرح یہی سوچ رہا تھا کہ فیس کی رقم کہاں سے لائے.....؟

”ہائے عثمان“۔ حمزہ پاس آ بیٹھا تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو.....؟“

”اپنا کٹڈ بیچنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں اندازاً کتنے کا بکے گا.....؟“ حمزہ سمجھا شاید وہ مذاق کر رہا ہے لیکن وہ سنجیدہ تھا۔

”کیا ہو گیا اتنا مایوس کیوں ہے.....؟“ اس نے حمزہ کو ساری پریشانی بتادی تھی۔

”نور! اہم میں ادرج کر دیتا ہوں تو اپنا گردہ رکھ سنبھال کر“۔ عثمان طنز یہ ہنسا۔

”دوستی سچ دوں گردہ رکھ لوں.....؟“ حمزہ خاموش رہ گیا۔

”اتنی سی بات پر دوستی تک جائے گی تیرے خیال میں؟“

”ہاں“۔ عثمان اٹھ کھڑا ہوا۔

”پاکل ہے تو“۔ حمزہ بھی اس کے برابر میں چلنے لگا تھا۔

”کیوں بتاتے ہیں ہم دوست عثمان! تاکہ دکھ سکھ میں کوئی ہو جو ہمارے ساتھ ہو جب ہمیں مدد چاہئے ہو تو وہ کہنے سے پہلے اپنی جان حاضر کر دے اور جب اسے مدد چاہئے ہو تو ہم دیر نہ کریں۔“ عثمان خاموش رہ گیا۔
”آئندہ اگر تو نے مجھ سے مدد مانگنے سے پہلے گروہ پیچھے کا سوچا تو میں گولی بار دوں گا تجھے۔“ اگلی صبح اس نے پچاس ہزار کا وہ چیک عثمان کو دیا تھا۔
”مجھے اچھا لگتا اگر یہ قرض نا ہوتا“ خیر اسے اتارنے میں جلدی نہ کرنا کم از کم سو سال بعد ادا کرنا۔“ عثمان ممنونیت سے مسکرایا۔

”تھینک یو کے علاوہ کوئی اور لفظ ہوتا تو میں ضرور کہتا۔“
”بھائی پلیز!! یو کو روکیں انہیں کہیں مجھے مزید ری پیٹ نہیں کرنی میں مر جاؤں گا بھائی پلیز۔“ وہ اصرار سے لپٹ کر رو رہا تھا ابو فیصلہ سنا چکے تھے ایک اور سال اسے FSC کے مارکس امپروو کرنے ہوں گے۔
”میں نہیں کروں گا بھائی پلیز انہیں روکیں۔“ اصرار نے بے بسی سے اسے دیکھا اور اس کے بال سہلائے۔
”بس ممبر کارڈ ایس جیکبوں میں گزر جائے گا یہ سال بھی محنت اور زیادہ کرنا میں تمہیں نئے نوٹس لادوں گا۔“
”نہیں بھائی۔“ آسان ہے بھلا.....؟ قطرہ قطرہ کامیابی چننا اور پھر سے مٹی کھول دینا دوبارہ چننے لگنا۔ وہ لائبریری میں بھی جب کتاب لئے حزمہ سامنے آ بیٹھا۔

”ہیلو۔“ فلک نے سر اٹھایا اور ناہی جواب دیا۔
”میرے بیٹے کو آپ پسند آئیں پوچھ رہا تھا کہ آپ کو وہ اچھا لگا کر نہیں.....؟“ فلک نے سر اٹھایا۔
”کسی کو یہ بتانے کا کہ وہ بہت اچھا ہے سب سے اچھا طریقہ ہے۔“ حزمہ نے کندھے اچکا دیئے وہ پھر سے بڑھنے لگی۔

”اور مسز کیسی ہیں آپ کی.....؟“ اس کے سوال پر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہ گیا اس کی یادوں سے وعدہ لیا تھا کہ اس کے ذکر پر غمزہ نہیں ہوا کرے گا اس کے نام پر اس کی بات پر مسکرا دیا کرے گا قسم کھائی تھی سو اب بھی مسکرا دیا۔
”وہ مر چکی ہے۔“

☆☆☆☆

ٹی وی نیٹ گیمز پہلے ہی بند ہو چکی تھی اب کمرے سے نکلنا بھی بند ہو گیا تھا اکیڈمی بھی بند بس وہ اس کی کتابیں اور اس کا کمرانا شیشہ دوپہر کا کھانا اور رات کا کھانا اس کے کمرے میں اب خود اس سے شیٹ لیتے تھے۔ قید تباہی بھی ایسے ہی دیتے ہیں ناں سونے کے پیچھے میں مقید پرندے کو اس سونے سے کیا لیتا دینا جس سے پیچھے بنایا گیا ہے دوسری طرف احمر کے فلیٹ میں خاموشی تھی خدا سونے کے لئے لیٹ چکی تھی احمر پاس ہی کتابیں لئے بیٹھا تھا۔

”اب بھی اسے یاد کرتی ہو.....؟“ نجمانے کیوں سوال کیا تھا وہ خاموشی سے لیٹی رہی تھی وہ اس کی بہت ساری باتوں کے جواب نہیں دیتی تھی مہینوں تک وہ بنا کوئی بات کہے رہتے تھے۔ ان سے دور حزمہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑا تھا سامنے شہر روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا جب بھی کوئی اس کا ذکر کرتا تھا تو وہ اور زیادہ شدت سے یاد آئے لگتی تھی۔

”نہن! تم نے بہت جلدی کی یار۔“ وہ ہولے سے بولا وقت ہولے ہولے سرک رہا تھا وقت وہ بھی بیت

گیا تھا وقت یہ بھی گزر جاتا تھا۔
”ہمت کرنا یار وقت جلدی گزر جائے گا۔“ احمد کے کانوں میں بھائی کے الفاظ گونج رہے تھے وہ ہاتھ میں پکڑے مار کر سے کتاب پر لکیریں لگا رہا تھا۔
”ناک کنواڈی ڈیل نے۔“ لکیریں لگاتے لگاتے اس نے مار کر پر زور ڈالا ورق اب پھٹنے لگا تھا اس کے ہونٹ کے زخموں پر اب کھرٹھ جم چکی تھی۔
”یہ مر جاتا تو بہتر تھا۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے اشتعال میں آ کر اس نے وہ صفحہ پھاڑ ڈالا تھا۔

☆☆☆☆

خدا خاموشی سے بیٹھ پر بیٹھی تھی سامنے چلتے ٹی وی کی اسکرین پر بے تو جہی سے نظر ڈال لیتی تھی پھر اس نے پاس بڑا رجسٹر اٹھایا اور انجانے لگی۔ ایک ادھورا سا چہرہ مسکرائی آنکھیں بکھرے بال وہ اسے دیکھتی رہ گئی وہ نجمانے کہاں تھا اس نے سل اٹھایا اور وہ بھر ملایا ہمیشہ کی طرح وہ بھر آج بھی بند تھا۔
”ارسل۔“ وہ سکی۔

☆☆☆☆

ویک اینڈ پر وہ زین کو لے کر گاؤں آیا تھا سب تیاک سے ملے تھے جیسے ہمیشہ ملتے تھے وہ اپنے خاندان کے لئے ایک مثال تھا اس کے رشتے دار زبان سے نہیں کہتے تھے لیکن ان کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ اس سے مرعوب ہیں وہ اسے مان گئے تھے وہ اس کے فیصلے کو مان چکے تھے زین اگر گاؤں میں پلٹا تو یقیناً ویسا نہ ہوتا جیسا آج تھا وہ اس بات کو مان چکے تھے اس دن ناشتے کے بعد اماں نے اس سے کہا تھا۔
”حزمہ پتر شادی کر لے۔“ اس نے کھیلنے ہوئے زین کو دیکھا۔
”نہیں اماں! میری زندگی مکمل ہے۔“

”ساری حیاتی نسیب کے سوگ میں گزاردے گا.....؟“

”ہاں اماں۔“ وہ ہولے سے بولا۔

”اس کے بعد میں نے اپنے دل کے دروازے کس کے بند کر دیئے ہیں اب کوئی آنا بھی چاہے تو نہیں آئے گا۔“ وہ خاموش رہ گئیں۔

”یہ وقت میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ گزار لیا۔ آنے والا وقت بھی گزار لوں گا۔“ نہن پہلی محبت تھی اور پہلی محبت یونہی تھوڑی بھلا دی جاتی ہے۔

☆☆☆☆

دور تک ہنزہ تھا پہاڑی ڈھلوانیں ہنزے سے بھری پڑی تھیں ان گت رنگوں کے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے وہ دونوں وہیں تھے ہاتھوں میں ہاتھ لئے آس پاس..... ساتھ ساتھ..... پھر اچانک سے وہ پھٹلی اور ہاتھ جھوٹ گئے..... ساتھ ٹوٹ گئے..... وہ اسے پکارنے لگی۔
”ارسل..... ارسل.....“

”نندا! خود کو سنبھالو۔“ احمر اس کے گال تھپتھپارہا تھا وہ یکدم اٹھ بیٹھی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی احمر نے گلاس میں پانی اٹھایا اور اسے دیکھتا رہ گیا۔
”اسے یاد کر رہی ہو جو خوابوں میں بھی تمہیں چھوڑ جاتا ہے.....؟“ وہ ششدر رہ گئی۔

وہ طنز نہیں تھا، حقیقت تھی، وہ واقعی ہر دفعہ کھوجا جاتا تھا، خوابوں میں بھی اور حقیقت میں بھی۔

☆☆☆☆

پہلے کیوں نا ملے ہم۔

آج یونی سے آف تھا اسی لئے زمین کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ فارغ تھا، پہلے تو سارے گھر کی صفائی کی پھر چینج کر کے گرمی وغیرہ خریدنے اسٹور آ گیا، وہ والوں کے پیکٹ ٹرائی میں رکھ رہا تھا، جب پیچھے سے شناسا کی آواز آئی۔

”حزہ کریم! ایک قابل اسٹوڈنٹ! ایک اچھے فادر اور اب ایک گھڑ باورچی بھی..... جان کر اچھا لگا۔“ وہ چونکا اور مڑا، سامنے فلک کھڑی مسکراہٹ دباتے کہہ رہی تھی۔

”ایک البیہ ہمارے معاشرے کا یہ بھی ہے، مگر فلک بیوی کی قدر اس کے مرنے کے بعد آتی ہے۔“ وہ ٹرائی کھینٹا ہوا کاؤنٹر تک آیا، وہ ساتھ میں چل رہی تھی، کاؤنٹر پر کھڑے وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی جب کسی نے پکارا۔

”فلک۔“ وہ کرنٹ کھا کر پٹلی اور پھر جیسے حرکت کرنا بھول گئی وہ بوڑھا آدمی بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”فلک.....؟ تم فلک یوناں.....؟“ فلک کے ہاتھ سے شاہزادہ بیک سب چھوٹ گیا، وہ تیر کی طرح اس بوڑھے آدمی کی طرف بڑھی تھی۔

”ابو.....“ حزہ تعجب سے سارا معاملہ سمجھنے میں مصروف تھا، فلک ہچکیاں لے رہی تھی۔

”فلک! میری بیٹی۔“ اسٹور میں کئی لوگ حیرت سے مڑ کر انہیں دیکھ رہے تھے وہ دونوں سب سے بے نیاز آنسو بہا رہے تھے، حزہ نے فرش پر گھرے شاہزادے کھٹے کئے اور اس کے پاس آیا۔

”فلک! سب دیکھ رہے ہیں۔“ گھر چلے۔“ فلک چونکی وہ بوڑھا آدمی اب فلک سے نظریں ہٹا کر حزہ کو دیکھنے لگا تھا، پھر سے فلک کو دیکھا سوا یہ نظروں سے۔

”یہ ہے وہ فلک.....؟ اس کے ساتھ آئیں تمہیں گھر سے.....؟“ فلک اندر تک لڑ گئی وہ کیا سوچ رہے تھے.....؟ وہ کیا سمجھ رہے تھے.....؟ کاش وہ کسی کے ساتھ گھر سے آئی ہوتی تو آج کوئی ”گھر“ ہوتا کاش! حزہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا، فلک اسے ہی دیکھ رہی تھی کیا تھا ان نظروں میں.....؟ صرف التجا..... صرف اور صرف ایک التجا! التجا کر کے وہ نظریں جھک گئیں حزہ ہولے سے بولا تھا۔

”چلیں! انکل! گھر چلتے ہیں۔“ کاؤنٹر پر آ کر اس نے بل کیئر کئے شاہزیادے اور ان دونوں کو لئے باہر نکل آیا۔

☆☆☆☆

اس کے سامنے کتاب کھلی پڑی تھی وہ بے توقعی سے بیٹھا دور کی غیر مرئی نکتے کو گھور رہا تھا، مسلسل بغیر جھٹکنے کئی گھنٹے یونی بے مقصد بیٹھے بیٹھے اس کی گردن جھٹکنے لگی تو اس نے نظروں کا زاویہ موڑا، کتاب کے منحنے پر لکھا پہلا حرف ہی اسے سمجھ نہیں آیا، عجیب سی شکل یہ کیا لکھا ہوا ہے بھلا.....؟ اس نے سوچتے سوچتے سوچا، آدمی جھٹکنے سوچنے کے بعد اسے یاد آیا، وہ انگلش کا پہلا حرف A تھا اب وہ ایک ایک کر جوڑ توڑ کرنے لگا۔

☆☆☆☆

وہ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا، چھوٹا سا گھر شکر ہے صبح ہی صاف کیا تھا، اس کے برابر میں فلک چل رہی تھی جیسے خواب کے عالم میں وہ کن اکھیوں سے حزہ کو دیکھ رہی تھی جو ان دونوں باپ بیٹی کو

ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر کچن میں چلا گیا تھا۔ اب ڈرائنگ روم میں وہ دونوں تھے، وہ باپ کے سامنے سر جھکا کر بیٹھی تھی وہ بھی خاموش بیٹھے تھے، لفظ جیسے ختم ہو گئے تھے، پانچ سال پہلے کا منظر الیاس صاحب کے ذہن کے پردے پر تھا، وہ اپنی چھوٹی بیٹی نمرہ کے ساتھ شادی سے واپس لوٹے تو گھر میں ایک نیا ہی فساد برپا تھا، سب باسافرقان۔

”آپ کی بیٹی نے عزت رول دی ہماری! خدا جانے کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے، کل مجھے کسی نے اس کی ویڈیو بھیجی ہے اس میں وہ انتہائی شرمناک حالت میں نجانے کس کے ساتھ۔“ الیاس صاحب نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اس کے منہ پر پھنڈرے مارا تھا۔

”میری بیٹی کے بارے میں کیوں مت کر۔“ وہ جلدی سے موبائل میں سے وہ ویڈیو نکالنے لگا لیکن..... رات کسی وقت اس کا موبائل فارمیٹ ہو چکا تھا، موبائل کا سارا ڈیٹا ڈیلیٹ ہو چکا تھا، وہ ہانگوں کی طرح موبائل کھنکال رہا تھا، وہ ویڈیو نہیں تھی۔ الیاس صاحب سچ سے مسکراتے ہوئے ادھر آئے، فلک کو پکارا، فلک نہیں تھی ان کے کمرے میں ایک پرچہ پڑا تھا۔

”مجھے معاف کر دیجئے گا ابو! جس سے محبت کرنے کا گناہ ہوا اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا جرم کر رہی ہوں، سمجھ لیجئے گا کہ فلک مر گئی۔“ وہ ہانگوں کی طرح سارے گھر میں فلک فلک چلاتے پھرتے رہے تھے فلک ہوتی تو جواب دیتی ناں۔

منظر بدل گیا۔

ان کے سامنے بیٹھی فلک بے آواز آنسو بہا رہی تھی، خدا نے کسی لاج رکھی تھی اسے یہ تھا وہ معافی مانگ لے گی، ابھی تو ایک سال بعد کی جانے والی تو باس نے ایک سال پہلے قبول کر لی تھی۔ وہ کیسا رحیم ہے ناں.....؟ وہ کیسا غفور ہے ناں! اور وہ کیسا پرہیزگار ہے ناں! اب نے کیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”چھوٹی..... نمرہ کیسی ہے.....؟“ ابو نے کیلی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”گھر سے بھاگ جانے والی لڑکیوں کی چھوٹی بہنیں کن حالات میں ہوتی ہیں، فلک ان کی تعلیم چھڑوا دی جاتی ہے گھر میں قید کر دی جاتی ہیں کسی بھی لوہے لنگڑے سے بیاہ دی جاتی ہیں۔“ وہ دھک سے رو گئی۔

”لیکن اس کا خدا بھی وہی تھا فلک جو تمہارا جب تم قصور وار ہوتے ہوئے خوش ہو، سکون سے ہو تو وہ بے گناہ کیوں دل جاتی، BA کر رہی ہے میری بیٹی۔“ فلک کے سینے سے ایک اور بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اتنے میں حزہ کو لڈو ڈنگس لے آیا تھا، وہ پاس ہی بیٹھ گیا، ابو حزہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے تھے۔

”میں نے تمہیں کہیں تلاش نہیں کیا فلک! کہیں بھی نہیں، تم نے کہہ دیا تھا کہ سمجھ لوں کہ تم مر گئیں میں نے سمجھ لیا، دل پر پتھر رکھ کر مان بھی لیا اور آج تک اپنی بات پر قائم ہوں کہ میری صرف ایک بیٹی ہے۔“ فلک نے سر جھکا لیا۔

”آپ رکیں گے ناں.....؟ میں کھانا تیار کرتی ہوں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی، حزہ نے گھڑی دیکھی زمین کے اسکول کی چھٹی ہونے میں ایک گھنٹہ تھا، وہ آ جاتا تو لے لے سیدھے سوال کرتا۔

”نہیں میں بس اب چلوں گا۔“ فلک نے رنکے پر اسرار نہیں کیا تھا۔

☆☆☆☆

وہ یونی سے گھر آیا تو حسب معمول خاموشی تھی اس نے کمرے میں جھانکائی دی بند اور وہ لحاف لئے

لینی تھی۔

کے کنارے آسان تھوڑی ہوتے ہیں کفاروں میں یونہی زندگیاں دان کرنا پڑتی ہیں۔

☆☆☆☆

رات کے ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا وہ لیٹ شفٹ سے فارغ ہو چکا تھا دھیر سارے برتن دھونے اور کچرا سینے کے بعد اسے اپنے آپ سے آنے والی بدبو سے نفرت ہو رہی تھی وہ شاور لے کر سوجانا چاہتا تھا کھر کی طرف جاتے ہوئے اس سنبان سڑک پر کسی نے راستہ روک لیا تھا۔
”موبائل اور والٹ.....“ کسی نے کچنی پر پستول رکھ دی اس نے جیسے خالی کر دیں چند ہزار دیکھ کر اس راہزن کو ٹپس آ گیا اس چور نے مکوں اور لاتوں سے مار مار کر عثمان کا حلیہ بگاڑ دیا تھا حواسوں کی دنیا سے رابطہ ٹوٹنے سے پہلے اس نے مدد کے لئے آوازیں بلند کی تھیں۔ اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا ارم ماموں خالہ اور خالو۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں بینڈ بیج کر دی ہے ابھی تھوڑی دیر میں ان کو ڈسپارچ کر دیں گے۔ اس نے تھکان سے آنکھیں موند لیں نجائے کیوں سارا زمانہ آزمائش لینے پر تلا ہوا تھا مصیبت در مصیبت..... بھی اسے ہاتھ پرزی کا سا احساس ہوا ارم فکر مندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔
”کاش ارم! میں تم سے ان سب مشکلات کے بعد ملتا تو تمہیں میری وجہ سے یہ سب نا سہنا پڑتا۔“ اس نے کرب سے سوچا تھا۔

☆☆☆☆

الیاس صاحب کو چھوڑ کر وہ واپس آیا تو وہ وہیں کارپنٹری پر بیٹھی رو رہی تھی وہ پاس آ بیٹھا وہ روتے روتے اس کے کندھے سے آگئی تھی۔
”مجھے معاف کر دو حمزہ۔“ روتے روتے وہ اسے اپنا ہر گناہ بتاتی چلی گئی ارم سے دوستی سے لے کر بارش تک وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر زنی سے اس کے آنسو صاف کئے۔
”جو ہو چکا ہے فلک! اسے بھول جاؤ ان چند گھنٹوں کو اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لئے ڈیلیٹ کر دو اینڈ ٹرسٹ می میرے دل میں اب بھی تمہارے لئے وہی عزت ہے جواول روز بھی میرے حوالے سے کچھ بھی سوچ کر پریشان مت ہونا۔“ اسے وہ ہاتھ چھوڑ آیا تھا اس رات زین کے سوجانے کے بعد اس کے پاس سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا وہ کمزوری لڑکی جواں در تک کرچی اور خود کو چٹان جیسا بنائے رکھتی تھی۔
”میری بیٹی کا خیال رکھنا۔“ اس نے آنکھیں موند لیں۔
”کاش..... فلک! میں تم سے بہت پہلے ملا ہوتا بہت پہلے جب ناں ارم ہوتا اور ناں کوئی زینب! تب شاید تم آج کے دن کی طرح محرومی سے روند رہی ہوتیں“ کاش بہت پہلے ہم مل جاتے تو میں آج تمہارے باپ کے حکم کی تعمیل کے قابل ہوتا۔“

☆☆☆☆

وہ یونی جانے کے لئے کمرے سے نکلا تو ندا کمرے میں نہیں تھی وہ کچن میں آیا وہ ناشتہ بنا رہی تھی وہ جلدی سے اندر آ چوہا بند کیا اور اس کو ہاتھ سے پکڑ کر کمرے میں بستر تک لایا۔
”پاکل ہو تم، مرنے نہیں جاؤں گا میں اگر ناشتہ نہیں کروں گا تو۔“ وہ چکراتے سر سے ویسے ہی بیٹھی رہ گئی دس منٹ بعد وہ کمرے میں آیا اور ایک ٹرے پاس رکھ دی۔

”اس وقت سورہی ہے مہارانی خیر ہے۔“ وہ سر ہانے کے پاس آیا۔
”ندا! آ رہی آ رات.....؟“ وہ جواب دیئے بنا لیٹی رہی کئی اصرار نے ہوئے سے لحاف سر کا یا اس کی رنگت نماز جیسی لال ہو رہی تھی اور سارا وجود پسینے میں بھینکا ہوا تھا وہ بخار میں پھنک رہی تھی۔
”اوہ مائی گاڈ! تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔“ اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے پھر اچانک رکا۔
”اوہ میں بھی تو ڈاکٹر ہی ہوں..... بابا بابا۔“ جلدی سے کٹ کھولی تھرما میٹر چند ادویات بخار وغیرہ چیک کیا اور دوا دی لحاف اوڑھا کر جب وہ کمرے سے نکل رہا تھا تب وہ ہولے سے بولی تھی۔
”کھانا ڈانٹنگ پر رکھا ہے۔“
”اف.....“ وہ فکر مندی سے پلٹا۔
”کیا ضرورت تھی اتنے بخار کے ساتھ چولہا چوکی کرنے کی میں خود کر لیتا یا! ملازمہ نہیں ہوں تم۔“ لائٹ آف کر کے وہ کمرے سے نکل آیا۔

☆☆☆☆

کتاب گود میں دھرے وہ ہولے ہولے سرگوشی میں بول رہا تھا۔
”بابا! مجھے مارتے ہیں میرے ٹیٹ میں غلطیاں ہوتی ہیں ناں تمہیں نہیں مارتے ہوں گے تمہارے ڈیڈ یو کلی تم فرسٹ آتے ہو میں جتنی مرضی محنت کروں فرسٹ نہیں آ پاتا تم مجھے اپنے جیسا بنا لو گے ناں دوست.....
ہاں ہاں۔“ ای دی پھر کا کھانا دینے آئیں تو وہ لینا کچھ بڑا ہوا تھا۔
”کیا کہہ رہے ہو.....؟“ انہوں نے پوچھا بھی لیکن وہ کی ان کی کر گیا۔

☆☆☆☆

حمزہ نے بانیک کی چابی اٹھائی وہ ابوکوس اسٹینڈ تک چھوڑنے جا رہا تھا وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر آئے بیڈ روم کے کھلے دروازے سے اندر لگی زین کی بڑی سی تصویر دیکھ کر وہ مڑے اور مسکرا کر فلک کو دیکھا۔
”یہ تمہارا بیٹا ہے ناں.....؟“ فلک گنگ رہ گئی اس کا بیٹا اس کا بچہ اس کی اولاد۔
”آئی ایم سوری! بارش کی وجہ سے آپ کو بہت نقصان ہوا ہے ٹیکسٹ پر ٹیکنیسی کا کوئی چانس نہیں ہے آپ کبھی ماں نہیں بن سکیں گی۔“ وہ لب کاٹنے لگی۔
”جی..... یہ ہمارا بیٹا ہے۔“ حمزہ نے بتایا تھا وہ اب آخری دفعہ اس سے ملنے کے بعد حمزہ کو گلے لگا رہے تھے۔
”میری بیٹی کا خیال رکھنا۔“ وہ انہیں لئے باہر نکل گیا اور وہ سائیکل پر بیٹھی رہ گئی تپتے صحرا میں وہ جس شجر کے نیچے آج وہ بھی کٹ گیا تھا وہ ہمیشہ کے لئے بے سہارا ہو گئی تھی سامنے دیوار پر لگی زین کی تصویر دیکھ کر وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

”مجھے یہ بچہ نہیں چاہئے مجھے بارش کر دانا ہے۔“ اس کے کانوں میں اس کے اپنے الفاظ گونج رہے تھے وہ کسی کی موت کا حکم دے رہی تھی اور ایک حکم اوپر والے نے بھی دیا تھا اس سے ہمیشہ کے لئے زندگی دینے کا شرف جھین لیا گیا تھا وہ جنت کو ٹھوکر مار کر گھر سے نکلی تھی اس کے قدموں تلے سے جنت کھینچ لی گئی تھی وہ رحمان اور رحیم ہے لیکن ظالموں کے لئے وہ جہار اور قہار بھی ہے فلک الیاس زندگی میں جہاں جہاں ظالم بنی تھی اس کا رحیم رب قہار بن گیا تھا وہ کارپنٹری پر بیٹھی دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے گناہوں

”دو توں آسٹریلیا کے نقشے جیسا پراٹھا اور آلیٹ‘ دودھ کا گلاس۔ ناشتے کے بعد میڈیسن لے لینا اور کھانا پکانے مت کھڑی ہو جانا وہ دایات دے کر نکل گیا۔ وہ ایک تک ناشتے کی ٹرے کو دیکھتی رہی پھر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆☆

اس نے روٹی کے دو حصے کئے اور ٹکڑا برابر میں رکھ دیا۔
”کھاؤ ناں یہ نہیں تم میرے دوست ہو کچھ نہیں ہوتا تم جلدی سے کھاؤ پھر ہم نے پڑھنا بھی ہے۔“ سامنے لگے شیشے میں زمین پر بچھا میٹر لیس دکھائی دے رہا تھا جس میں وہ اکیلا بیٹھا کھا رہا تھا۔
”کاش..... تم پہلے مجھ سے ملے یا زہم دوست بن جاتے میں بھی تمہاری طرح فرسٹ آیا کرتا۔“ امی کچھ دیر بعد برتن لیے آئیں تو وہ کتابوں پر سوراہا تھا، بستر پر آدھی روٹی پڑی مٹی کی کل کی طرح۔

☆☆☆☆

وہ یونی سے لوٹا تو وہ کمرے میں سو رہی تھی وہ کچھ دیر کھڑا خاموشی سے اس کا پرسکون چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا وہ معصوم امی کزن احمر صدیقی کو ہمیشہ سے بہت عزیز بھی وہ اس کے لئے بہت خاص تھی۔
”کاش..... خدا ہم ایسے ناٹے ہوتے۔“ وہ کمرے سے باہر نکل آیا، ہول سے لائی ہوئی بد مزہ روٹی چباتے ہوئے وہ خدا کے ہاتھ کی روٹی کو مس کر رہا تھا وہ ذائقہ جس کا وہ عادی ہو چکا تھا محبت ایسا ہی کرتی ہے عادت کا لبادہ اوڑھ کر آتی ہے اور پھر ہمیشہ کے لئے ڈیرے ڈال لیتی ہے۔

☆☆☆☆

ابو نے ٹیٹ پر کراس کا نشان ڈالا اور جسٹ ڈا سے دے مارا۔
”کیا پڑھتے ہو سارا دن‘ اسپینگ کی غلطیاں ہی ختم نہیں ہو رہی تمہاری..... یہ سب کیا ہے؟“ وہ خاموش کھڑا رہا۔
”کل میں یہ ٹیٹ پھریوں گا اور اب اگر غلطیاں ہوئیں تو چوڑی او میز دوں گا۔“ وہ زور سے دروازہ بند کر کے چلے گئے تھے وہ اکیلا میٹر لیس پرسر جھکاے بیٹھا رہ گیا تھا رجسٹر سامنے پڑا تھا جس پر ان گنت مارکیٹ تھے لال لال..... غلطیاں ہی غلطیاں.....
”تم مجھے یہ سمجھا دو گے؟ مجھے یاد نہیں ہو رہا۔“ وہ ہولے سے بولا۔

☆☆☆☆

وہ ریکورڈ بھی جو منزل کی ابتدا تھی۔
وہ یونی کے لان میں بھی اسائنمنٹ بنارہی تھی جب وہ دو ڈسپوزبل کپ لئے پاس آ بیٹھا۔
”ہیلو۔“ عرصہ ہوا فلک کو اس لفظ سے نفرت ہو چکی تھی۔
”آئی ہیٹ ورڈ ہیلو.....“ حمزہ نے منہ بتایا۔
”کیا کر رہی ہو.....؟“ حمزہ نے سوال کیا۔
”فٹ بال کھیل رہی ہوں۔“ وہ ہنس پڑا اور ایک کپ اس کے سامنے کیا۔
”کافی لایا ہوں تمہارے لئے۔“
”آئی ہیٹ کافی!“ حمزہ جی بھر کر بد مزہ ہوا تھا۔

”تم ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ مجھے ایک فہرست بنا دو ان سب چیزوں کی جو تمہیں پسند ہیں ویسے اس لسٹ میں صرف تمہارا نام ہوگا۔“

”آئی آسو ہیٹ مائی سیلف!“

”ابھی بات ہے۔“ حمزہ نے کافی کا کپ منہ سے لگایا وہ سمجھ نہیں سکا کہ کافی زیادہ کڑوی ہے یا وہ۔
”یار پی لواب تو لے آیا ہوں قسم سے 80 روپے کا کر دیا ہے ایک کپ اس تھو تھائی کی اولاد نے۔“ فلک نے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا تھا۔
”میری طرف سے لی لو دوسرا کپ بھی 20 روپے واپس کر دو۔“ وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔
”خلوص‘ ہمدردی‘ تشکر..... یہ سب کتے بلیوں کے نام نہیں ہیں مس فلک!“
”خلوص‘ ہمدردی‘ تشکر..... ان سب نے جانوروں سے برا سلوک کیا ہے میرے ساتھ سر حمزہ!“ وہ کچھ لمبے کے لئے خاموش رہ گیا تھا۔

”آئی ایم سوری حمزہ! میں تمہاری بات نہیں کر رہی تھی۔“

”مجھے پتہ ہے۔“ حمزہ نے سب لیا اور دوسرا کپ اس کی طرف بڑھایا۔

”تمہیں کسی نے بتایا بھی کہ تم بہت بڑی چمک ہو.....؟“ وہ ہنس پڑا۔

”تعریف کے لئے شکر یہ میڈم!“

”اچھا سنو میری اسائنمنٹ بھی بنا دو گی.....؟“

”کس خوشی میں.....؟“

”کسی بھی خوشی میں۔“

”No.....“ فلک کا ٹریڈ مارک۔

”میرا دل توڑ دیا تم نے ظالم!“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر پیچھے کو ہوا۔

”میرے جو 20 روپے تم نے واپس کرنے ہیں ان سے سی پلاسٹ لے کر لگالینا بڑ جائے گا۔“ حمزہ نے قہقہہ لگایا۔
”تمہیں کبھی کسی نے بتایا تم انتہائی خود سر لڑکی ہو.....؟“ وہ ہنسی۔
”تعریف کے لئے شکر یہ سر!“

☆☆☆☆

ابھی ابھی اس کی ابو کے ہاتھوں پٹائی ہوئی تھی وہ پیٹ کے بل میٹر لیس پر بے خس و حرکت لیٹا ہوا تھا باہر امی ابو سے جھگڑ رہی تھیں۔
”میرے بیٹے کو ایسے جانوروں کی طرح مارنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“
”اور شہہ دو! ABC تک لکھنا بھول گیا ہے تمہارا بیٹا ایک اسپینگ تک ٹھیک نہیں لکھ پاتا۔“ وہ خاموش لیٹا اپنے آپ سے سرگوشیاں کر رہا تھا۔

☆☆☆☆

خدا کی حالت اب قدرے بہتر تھی بخار اتر چکا تھا صحت بھی اب بہتر ہو رہی تھی اس دن چھٹی تھی جب احمر نے اسے تیار ہونے کو کہا تھا۔

روحانی ڈائری

شہلاگل حصر صالح کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

چلو چل کے سارے
دکھ کے سیپ سے
سکھ کے موٹی چنتے ہیں
چلو چل کے سارے
مصرفیات کے جنگل سے
فراغت کے گوہر تلاش کرتے ہیں
چلو چل کے

اداسیوں کے بادل سے
خوشی کی بارشیں، برساتے ہیں
چلو چل کے

رمضان کی نیک ساعتوں میں
اپنے رب کا قرب تلاش کرتے ہیں
چلو چل کے

عید کی خوشی میں
اپنے لمحات اپنے محسوسات
اور اپنی نیک خواہشات
ایک دوسرے کے نام کرتے ہیں

شہر بانو شہزاد کی ڈائری سے

پروین نور کی غزل

پوئی دور یوں میں گزر گئی
بھی وہ جدا بھی میں جدا

اِن چاہتوں کے موڑ پر
بھی وہ رکا بھی میں رکا
وہی راستے، وہی منزلیں
نہ اسے مبر نہ مجھے پتہ
اپنی اپنی آگ میں
بھی وہ جلا بھی میں جلا
یہ قدرت کا عجیب سا کھیل تھا
نہ وہ بے وفا نہ میں بے وفا
پھر یہ کیسا انصاف ہے
نہ وہ مجھے ملانے میں اسے ملا

منہ جیس بلال کی ڈائری سے

ایک غزل

ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک
بہت ہیں مرحلے پاتی ہیں زنجیر کرنے تک
ہمارے ہجر کے قصے سمیٹو گے تو کھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک
ہمارا ذل ہے پیمانہ سو پیمانہ تو جھلکے گا
چلو دو گھونٹ نم بھر لو ہمیں تاثیر کرنے تک
پرانے رنگ چھوڑ دو آنکھ کے اک یہی رنگ کافی ہے
محبت سے چشم بھر لو ہمیں تصویر کرنے تک
ہنر تکمیل سے پہلے مصور بھی چھپاتا ہے
ذرا تم بھی چھپا کر رکھو ہمیں تعمیر کرنے تک
وہ ہم کو روز لوٹتے ہیں اداؤں سے بہانوں سے
خدا رکھے لیرے کو سلامت ہمیں فقیر کرنے تک

ایم جے قریشی کی ڈائری سے

نامعلوم شاعر کی غزل

شام کو یوں تیری پلکوں کو لرزتے رہنا
ذوب جائے جو یہ منظر تو برستے رہنا
میں اگر ٹوٹ بھی جاؤں تو آئینہ ہوں
تم میرے بعد بھی ہر روز سنو رتے رہنا
اُس کی عادت وہی ہر بات ادھوری کرنا
اور پھر بات کا مفہوم بدلتے رہنا
آج سے سیکھ لیا ہے یہ فریضہ ہم نے
بجھ بھی جانا تو بڑی دیر سلگتے رہنا
جانے کس عمر میں جائے گی یہ عادت اپنی
روحنا اس سے تو اوروں سے اچھے رہنا

شبانہ عزیز میرانی کی ڈائری سے

پروین شاہ کی نظم

پھر وہی بستر سخاف یہ کائناتوں کی بہار
پھر سے شبِ خوابی کے ملبوسِ حریری میں
تن زار کی آگ
پھر تری یاد میں جلنے دل کو
کسی پہلوئیں آتا ہے قرار
اے مرے خواب چراغ
تیرا پیرا ہن آبی بھی اسی طرح شرر بار ہے کیا
اور تر چشم سبک خواب سے بھی
نیند بیزار ہے کیا
یا ہمیشہ کی طرح
تیرے لیے رخص دل آرام ہے رات
نیند کے شانوں پر سر رکھے ہوئے سوتا ہے
سے کے اور سانی محفل کے اثر سے تیری
آنکھ میں ملکی گلابی ڈوری
مسکراتا ہوا تنہائی پر

تومری یاد غلط کرنے کو جانا ہے

مصباح مسکان رؤف کی ڈائری سے

ایک خوب صورت نظم

خوشیوں کے قص
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ
بہار جب بھی حیات چمن کی چھائی خزاں میں اترے گی
میرے دل آنگن سے بھی گزرے گی
اگرچہ بات یہ بھی ہے کہ
خوشیوں کے مسافر کو گزرتا پڑے گا
بہت ہی پر دشوار رستوں سے
مگر ان دشوار رستوں کی منزل خوشیوں کا مگر ہوگی
خوشیوں کا مگر ہوگا جو میرے دل آنگن کا حصہ ہوگا
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ حیات چمن پہ چھایا داس موسم
چند لمحوں میں ہی خوشیوں کے قص میں گم ہوگا
اب تو دل کو یہ اعتبار ہے کہ
خوشیوں کے مسافر کو میرے چمن تک
پہنچنے کو
محض چند لمحوں کی ساعت باقی ہے

فوزیہ کریم کی ڈائری سے

ایک غزل

ادھورے پن کی یہ رفتہ رفتہ تکمیل کرتی تھی
محبت زندگی کو حسن میں تبدیل کرتی تھی
بھی سوچا بھی ہے تو نے کہ وہ مغرور سی لڑکی
نہ جانے کیوں تیرے ہر حکم کی تعمیل کرتی تھی
نہیں روٹی ہے اب وہ بند کمرے میں گھٹ کر
وہ اپنے آنسوؤں کو شہر میں نمٹیل کرتی تھی
ساغر ذوب جاتے تھے بنا سوچے بنا سمجھے
وہ اپنی آنکھ کو جب خاموشی سے جھیل کرتی تھی

اشعار

فرزانہ شوکت ————— کراچی
رات سر پر ہے پرندوں مستقر مت بھولنا
آسمانوں میں اڑو لیکن شجر مت بھولنا
اک نئی رُت کے سفر پر جانے والے قافلہ
اپنی مٹی اپنے موسم اپنے گھر مت بھولنا
سباس گل ————— رحیم یار خان
عید کے رنگ دیکھنے کے لیے
چاند اُترا ہے میرے آنکھن میں
سعدیہ عابد ————— کراچی
خمارِ غم ہے مہکتی فضا میں جیتے ہیں
ترے خیال کی آب و ہوا میں جیتے ہیں
فراقِ یار میں سانسوں کو روکے رکھتے ہیں
ہر ایک لمحہ گزرتی فضا میں جیتے ہیں
سیدہ فرزانہ حبیب فرزین ————— کراچی
ماں کی آغوش اور اس کی دعائیں
خوش قسمت ہے وہ جس کو مل جائیں
پاؤ گے عزت اور جنت کی ہوائیں
چوم لو ماں کے قدم لو اس کی بلائیں
سیدہ عروج فاطمہ ————— ملتان
آگ محبت کی خود ہی سیلگ اُشتی ہے
بہا کر دیکھ لو آنسو نہیں بجھتی نہیں بجھتی

مسز نگہت غفار ————— کراچی
کبھی چاند راہوں میں کھو گیا کہیں چاندنی بھٹک گئی
میں چراغ وہ بھی بجھا ہوا میری رات کیسے چمک گئی
میری داستان کا عروجِ قاتریں زمِ پلکوں کی چھاؤں میں
میرے ساتھ تھا تجھے جاگنا تیری آنکھ کیسے جھپک گئی
حناعلیٰ ————— ملتان
میں بھی ہوں اگر خاموش آج ہنسنا تو بھی نہیں
مجھ سے پچھڑ کے کسی سے ملا تو بھی نہیں
امبرین ————— اسلام آباد
کوئی حرف وفا نہ حرف سادہ
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں
میں بچپن کے کسی لمحے میں رک کر
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں
نگہت توقیر ————— چیچہ وطنی
چند دن تو اگر میرے ساتھ رہے
تو کسی قدر جیسے پھر سفرِ حیات رہے
جہاں چاہے تو چلا جا اے ہمسفر
کوئی منتظر ہے اتنا گھر یاد رہے
ثناء حیات ————— کراچی
کوشش کے باوجود بھی تو بھولتا نہیں
تیرے بغیر کیا کروں کچھ سوچتا نہیں
ہوئی ہے صبح و شام مگر اس کے باوجود
ہے چاند تیری یاد کا جو ڈوبتا نہیں

دھنک ناز ————— کراچی
اک ناقص خواب مکمل نہ ہو سکا
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے
رابعہ منیر ————— سرگودھا
وہ جذبوں کی تجارت تھی دل کچھ اور سمجھا تھا
اسے ہنسنے کی عادت تھی دل کچھ اور سمجھا تھا
مجھے اس نے کہا آؤ نئی دنیا بساتے ہیں
اُسے سوچھی شرارت تھی یہ دل کچھ اور سمجھا تھا
نوشین مدرثر ————— لاہور
مل ہی جائے گا کبھی دل کو یقین رہتا ہے
وہ اسی شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا ہے
روز ملنے پر بھی لگتا تھا کہ جگ بیت گئے
عشق میں وقت کا احساس نہیں رہتا ہے
مریم نواز ————— فیصل آباد
تمہارے ساتھ ہی موسم بھی رُخ بدلنے لگے
ہوا تھمی ہے تو بارش کے تیر چلنے لگے
رو حیات میں یوں تم نے میرا ساتھ دیا
کہ جیسے چاند مسافر کے ساتھ چلنے لگے
حمین علی ————— سالکوٹ
کچھ دنوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے جو کچھ ہو سکیں باتیں بہت اچھی لگیں
بعد مدت اس کی دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں مدارائیں بہت اچھی لگیں
ریمل تنویر ————— اوکاڑہ
رسمِ خندہ بھی اٹھا دی ہم نے
عظمتِ عشق بڑھا دی ہم نے
دل کو آنے لگا بسنے کا خیال
آگ جب گھر کو لگا دی ہم نے

فرح قیصر ————— گجرات
زرد موسم کے اجالہ لمحوں میں
ہم رو پڑے یونہی ہنسنے ہنسنے
یارب اب تو کوئی تعبیر بخش دے
تو تھک گئیں آنکھیں خواب ہنسنے ہنسنے
شازیہ تبسم ————— کراچی
دل اس قدر اداس بھی پہلے کبھی نہ تھا
غم میرا اک رفیق تو تھا زندگی نہ تھا
بکھری ہوئی تھی شہر میں چہروں کی بازگشت
جس شخص کی تلاش تھی بس اک وہی نہ تھا
طبیہ نسیم ————— وہاڑی
اتنا آساں بھی نہیں اپنی ہستی سے گزر جانا
اترا جو سندھو میں تو دریا بہت رویا
جو شخص نہ رویا تھا جتنی ہوئی راہوں میں
سایہ دیوار میں بیٹھا تو بہت رویا
نہیب بلال ————— کوئٹہ
ملا تھا ہجر کے رتے میں صبح کی مانند
پچھڑ گیا تھا مسافر سے رات ہونے تک
میں اس کو بھولنا چاہوں تو کیا کروں آخر
وہ مجھ میں زندہ ہے میری ذات ہونے تک
صباحر ————— ہارون آباد
کیا خبر کون سی خوشی کے لیے
دل یونہی گنوائے جاتا ہے
رنگ پیلا ہے تیرا کیوں ناصر
تجھے کیا رنگ کھائے جاتا ہے
نورمانو ————— کوئٹہ
ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک
لاکیوں کے چلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہوگی
بات سے مکرانے میں دیر کتنی لگتی ہے

اس ماہ میں

اس ماہ کا شاعر

دینہ (جہلم) میں جنم لینے والے سپورن نگہ گلزار شاعر ہیں، افسانہ نگار ہیں، فلمی ہدایت کار اور اسکرپٹ رائٹر ہیں۔ مکالمے لکھتے ہیں اور بچوں کا ادب بھی تخلیق کرتے ہیں۔ کئی ہندوستانی زبانوں کی شاعری کے اعلیٰ پائے کے اردو تراجم کر چکے ہیں۔ پدم بھوشن ایوارڈ، ساجتہ ادکامی ایوارڈ، گزریلی ایوارڈ، آسکر ایوارڈ کے علاوہ انڈین آسٹی ٹیوٹ آف ایڈوانس اسٹڈیز، شملہ لائف ٹائم اچیومنٹ فیلوشپ کے ساتھ بیس بار فلم فیئر ایوارڈ اور سات بار نیشنل ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ گلزار کا ٹیلی ڈراما ”مرزا غالب“ ایک کلاسیک کی حیثیت رکھتا ہے۔

سعدیہ عابد۔ کراچی

اس ماہ کا شاعر

اُنسے بھی کھڑکیاں کھولے زمانہ بیت گیا مجھے بھی شام و سحر کا پتا نہیں چلتا سب اس گل۔ رحیم یار خان

اس ماہ کے اقوال زریں

☆ علم حاصل کرنا ہر مرد و عورت پر فرض ہے۔
☆ محنت کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔
☆ کسی سے اتنا پیار مت کرو کہ جدائی سہنا

مشکل ہو جائے۔

☆ محبت ایسا جذبہ ہے سخت سے سخت دل کو نرم کر دیتا ہے۔
☆ دھوکا دینے سے پہلے ہزار بار سوچو کہ اس میں ہمارا نقصان تو نہیں۔

سمیرا یوسف۔ کراچی

اس ماہ کا یقین

کبھی بھی کسی انسان کی طرف سے اپنی ناقدری پر نہ کڑھنا، کیونکہ قدر و قیمت کا تعین ہمیشہ وقت کرتا ہے اور دروجات اور برتتین ہوتے ہیں۔ اگر انسانی رویوں میں الجھو گے تو زندگی بھر اچھے کر رہ جاؤ گے۔ بس عیب اور غیب کے جاننے والے کے ساتھ اپنے معاملات سلجھائے رکھو۔

ساری الجھنیں اور مسائل دور ہو جائیں گے۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

اس ماہ کی شوخ سطرین

☆ ڈاکٹر..... وہ ہے جو آپ کی بیماری کو دواؤں سے مارتا ہے اور آپ کو دواؤں کے بل سے۔

☆ شادی..... وہ سلسلہ ہے جس میں مرد اپنی بیچلر کی ڈگری کو کھو دیتا ہے اور عورت ماسٹر کی ڈگری حاصل کرتی ہے۔

☆ طلاق..... شادی کا زمانہ مستقبل کہلاتا ہے۔

☆ دشمنی..... جہاں ڈائی ورس پہلے آتا ہے اور میرج بعد میں۔

☆ کانفرنس..... جہاں ہر کوئی بولتا ہے اور کوئی نہیں سنتا اور بعد میں کوئی بھی متفق نہیں ہوتا۔

☆ معیاری کتابیں..... جن کی لوگ تعریف تو کرتے ہیں مگر پڑھتا کوئی نہیں۔

☆ آئس..... جہاں آپ زیادہ آرام سے رہ سکتے ہیں اپنی سخت گھریلو زندگی سے۔

☆ بھائی..... یہ وہ لہجہ ہوتا ہے جہاں پر ایک شادی شدہ آدمی کو منہ کھولنے کی اجازت ہوتی ہے۔

☆ اینٹیم بم..... وہ ایجاد ہے جس سے تمام ایجادات ختم کی جاسکیں۔

☆ کنجوس..... وہ آدمی جو ساری زندگی غربت میں گزارتا ہے تاکہ امیر ہو کر مر سکے۔

☆ باپ..... قدرت کا دیا ہوا خزاں ہے۔

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

اس ماہ کے اقوال زریں

☆ بھوکے کو کھانا کھانا، حاجت مند کی حاجت روائی کرنا اور دشمن کے ساتھ اچھا سلوک کرنا نفس کی زینت ہے۔

☆ حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے کافی ہے تمہیں انتقام کی ضرورت نہیں وہ خود ہی اپنی آگ میں جل رہا ہے۔

☆ سستی اور عدم دونوں لفظوں کے معنی گویا ایک ہی ہیں۔

☆ انسان کی زندگی دنیا میں اس شمع کی مانند ہے جو ہوا میں رکھ دی گئی ہو۔

☆ دیو کی طرح طاقت ور ہونا بڑی اچھی بات ہے لیکن طاقت کو دیو کی طرح استعمال کرنا ظلم ہے۔

☆ مجھے ہر اس چیز سے لگاؤ ہے جو پرانی ہو، پرانے دوست، پرانی کتاب، پرانے زمانے، پرانی بیوی۔

☆ اونچے پہاڑ پر جانے کے لیے آہستہ آہستہ چڑھنا پڑتا ہے۔

☆ احمق کا دل منہ میں اور عقلمند کی زبان دل میں ہوتی ہے۔

☆ لباس اس طرح کا پہنو کہ کوئی شخص یہ تمیز نہ کر سکے کہ تم دولت مند ہو یا گنگال۔

☆ دانا وہ ہے جو دنیا کی چمک دمک سے دھوکا نہ کھائے اور دولت مندہ جو خدا کی تقسیم پر راضی ہو۔

☆ جس کا انجام موت ہو اس کے لیے خوشی کا کون سا مقام ہے دشمن کو نیک مشوروں سے شکست دو۔

☆ دولت کی کمی آسانی سے پوری کی جاسکتی ہے مگر روح کا افلاس ناقابل تلافی ہے۔

☆ پھول نے وقت سحر آسمان سے فریاد کی مجھ سے میری بنیم چھنی جا رہی ہے اسے کیا معلوم کہ آسمان ستارے کھو رہا ہے۔

☆ دنیا کی ہر خوشی والدین کے دم سے ہے جس گھر میں والدین نہیں وہ قبرستان سے بھی بدتر کھنڈر ہے۔

☆ راستوں کی ذیرانی اور چلچلاتی دھوپ سے ڈرنے والے منزل پر نہیں پہنچتے۔

☆ مرزنگھت غفار۔ کراچی

اس ماہ سچی بات

☆ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ مرد عورت پر ظلم کرتا ہے یا مرد نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے میں تو اس بات سے بھی انکار کرتا ہوں



کرتے ہیں۔

قرآن کی باتیں

- 1- اول یہ کہ جو لوگ اذان کی آواز سن کر جواب دیں ان کے تمام گناہ خدا بخش دیتا ہے۔
- 2- دوسرے یہ کہ جو لوگ نعرہ تکبیر بلند کر کے میدانِ جہاد میں کود جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کو اور ان کے گھوڑوں تک کو بخش دیتا ہے۔
- 3- تیسرا یہ کہ وہ لوگ جو رزق حلال کھاتے ہیں اور کھاتے ہیں۔
- 4- چوتھے وہ جو فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد آفتاب طلوع ہو جانے تک اپنی جائے نماز پر بیٹھے ذکر الہی کرتے رہتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ ان پر ان کے عزیزوں اور رشتے داروں تک پر اپنی رحمتوں کا اتنا نزول کرتا ہے، کچھ شمار نہیں۔

انمول موتی

- ☆ ڈرو۔ صرف خدا سے۔
- ☆ لڑو۔ صرف برائی سے۔
- ☆ مرو۔ صرف اللہ کی راہ میں۔
- ☆ کرو۔ صرف نیک کام۔
- ☆ چلو۔ صرف سیدھے راستے پر۔
- ☆ ہسو۔ صرف اچھے کام پر۔
- ☆ بڑھو۔ صرف نیکی کی طرف۔
- ☆ آؤ۔ صرف اللہ کے گھر میں۔
- ☆ بتاؤ۔ صرف سچی بات۔

مسنجیت غفار۔ کراچی

- ☆ بے شک اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ (سورہ آل عمران: 19)
- ☆ ہر قوم کے لیے ہادی ہے۔ (سورہ الرعد: 7)
- ☆ اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور بچو! اس کے ساتھ رہو۔ (سورہ التوبہ: 119)
- ☆ اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔ (سورہ الاحزاب: 41)
- ☆ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ (سورہ التوبہ: 111)
- ☆ کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو۔ (سورہ فاطر: 24)
- ☆ سعید عابد۔ کراچی

نعتیہ قطعہ

اُن کے عشاق میں ہو گیا ہوں
کیا بتاؤں تمہیں میں کہ کیا ہوں؟
میری اوقات کیا پوچھتے ہو
میں گدائے درِ مصطفیٰ ہوں
راؤ تہذیب حسین تہذیب۔ رحیم یار خان

چار اعمال

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابلیس کو افسردہ اور محکمین دیکھا۔ وجہ دریافت کی تو بولا۔ آپ کی امت کے چار اعمال بہت عملیں

آپ کو تیار کر لو۔

☆

چور کی بیوی۔ ”گھر میں راشن ختم ہو گیا ہے۔“
چور غصے سے بولا۔ ”لے آؤں گا پہلے دکانیں
تو بند ہونے دو۔“

☆

مبشریٹ نے چور لڑکے کے باپ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”آخر تم اپنے لڑکے کی اصلاح کیوں نہیں کرتے اسے کیوں نہیں بتاتے کہ درست راستہ کیا ہے چور لڑکے کے باپ نے جواب دیا۔ ”جناب میں نے اس کو بہت دفعہ سمجھایا اور تربیت دی لیکن ایسا بے وقوف ہے کہ ہر دفعہ ہی پکڑا جاتا ہے۔“

☆

ایک وکیل دوسرے سے۔ ”تم نے دیکھا میں نے ایک شخص کو جعلی کرنسی کے مقدمے سے بری کروا دیا لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔“
دوسرے وکیل صاحب نے پوچھا۔ ”کیا کیا؟“
پہلے وکیل نے جواب دیا۔ ”وہ مجھے قس میں جعلی کرنسی ہی دے گیا۔“

نمرہ احسن۔ کراچی

اس ماہ کی پیاری بات

دل میں محبت اور چہرے پر ناراضی دوسروں کو بہت اذیت میں مبتلا کرتی ہے۔ اکثر ناراضی بھانپ کر رخ بدل کر چھوڑ جاتے ہیں اور زندگی بھر دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا اگر محبت ہو تو دل میں بھی اور چہرے پر بھی محبت کے آثار رکھو جو دوسروں کی خوشی کا باعث بنے اور وہ ہزاروں سال آپ کو بھول نہ پائیں۔
ایم یعقوب مدنی۔ حیدر آباد

☆.....

کہ مرد ظالم ہوتے ہیں اگر مرد ظالم ہوتے اور مرد نے عورت پر ظلم کرنا سیکھا ہے تو دنیا کی ہر ایک عورت مظلوم ہوئی۔ ہر عورت پر ظلم ہوتا ہے شک انسانی تاریخ کے ساتھ عورت پر ظلم کی داستان ملتی ہیں لیکن کیا ہر عورت کے ساتھ ظلم ہوا؟ یقیناً نہیں کیونکہ ظلم صرف اور صرف ان پر ہوا ہے جو ظلم کے خلاف خاموش رہی ہیں۔

خولجہ حسین جاوید۔ منجی آباد شی

اس ماہ میری بیٹی

میری سوچ کی محور میرے پیار کا سبب اثاثہ میری سچی بری تجھ سے منسوب ہے
تو میرے دل کی وہ کلی ہے
جودل کے ہر گوشے میں آباد ہے
میرا سارا پیار صرف تم سے ہے
تو میری ہر پوری آرزو
میں اپنی زندگی کا تصور تیرے بنا کر ہی نہیں سکتا
میری ہر خواہش تیرے روپ میں پوری ہوئی
اک عجب احساس
سوچ کے دل شاد ہو جاتا ہے
تیرے صدقے میرا جہان آباد ہے
میری مالک دو جہاں سے دعا ہے
ایسی خوشی کائنات میں سب کو ملے
وفا صدام حسین غازی تیمو۔ حیدر آباد

اس ماہ کے شگوفے

امتحان میں فیل ہونے کے بعد ایک لڑکے نے گھر جانے سے پہلے بہن کو فون پر کہا۔ ”میں فیل ہو گیا ہوں میرے آنے سے پہلے ابا کو تیار کر لو۔“
بہن نے کہا۔ ”ابا کو اطلاع مل چکی ہے اپنے

مسلم کی حاجت روائی کرنا

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ کون سی ان دونوں باتوں میں سے میرے لیے زیادہ قابلِ عظمت ہے یہ کہ ایک آدمی نے اپنے چہرے کا سچ رخ اس لیے میری طرف کیا کہ مجھے اپنی حاجت روائی کے لیے خیال کیا اور اللہ پاک نے اس کی حاجت کو پورا کر دیا یا اس آدمی کے لیے میرے ہاتھوں آسانی ہو گئی اور اگر میں کسی مسلمان کی حاجت روائی کروں یہ بات مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے کہ میرے پاس زمین بھر کر سونا اور چاندی ہوئی۔

سیدہ عروج فاطمہ۔ ملتان

اقوال زریں

☆ اپنے اعمال کو دعا کے سہارے سے محروم نہ ہونے دیا کرو۔
☆ سال وہ کچھ سکھاتے ہیں جن سے دن واقف نہیں ہوتے۔
☆ صوفی وہ ہے جس کا کردار موافق گفتار ہو۔

☆ دوسروں کو عزت دینا بھی سخاوت ہے۔
☆ مشکل ترین کام بے کار رہتا ہے۔

سیراگل ناز شہرہز۔ کراچی

چاند ادھورا تھا!

دن کے اجالوں کی سائیس ٹوٹنے لگیں تو وہ بے جان ہو کر رات کی آغوش میں لینے لگے۔ اجالوں کی موت پر ماتم کرتی ہوا کا شور بڑھا تو سچے بھی عالم دل گیری میں نوحہ خواں بن گئے۔ اداس شام میں سفر کرتے قافلہوں کے قدم بھی ڈمگمانے لگے۔ شام کے پھلتے دھندلوں میں

انجانی منزل کی جانب رواں ستارے بھی کھوئے کھوئے سے تھے۔

درختوں کی اوٹ سے نکلتے چاند میں آج وہ بات نہیں تھی۔ آج اس کی چمک میں بے روٹی تھی۔ آج کہیں کچھ کمی تھی، جو چاند کا حسن ماند کیے جا رہی تھی۔ شاید اس کے دامن میں دکھ کی کک اور کسی درد کی جھن تھی، تب ہی تو رات کے ماتھے پر چمکتا چاند ایک بدنما دھبہ لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں آج اپنے دکھ کا عکس مجھے چاند میں نظر آیا، جہاں شاید آج چاند ادھورا تھا..... میری طرح!

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

قابل غور

☆ ہر گندہ چیز وہاں سے ملتی ہے جہاں وہ کھوتی ہے۔
☆ خاموشی عظیم نعمت ہے، بالخصوص اس مقام پر جہاں اختلاف زیادہ، آواز بلند، علم کی شدید کمی اور دلیل کی کوئی اوقات نہ ہو۔
زندگی کیا ہے؟

ایک قبہ، خوبصورت خواب ہے۔ پانی کا بلبلہ ہے۔ کبھی یہ پھولوں کی طرح نرم ہے اور کبھی اس قدر تلخ کہ سانس لینا بھی سزا ہو جاتا ہے۔ بے شک یہ ایک نعمت ہے مگر کبھی بھی یوں ہوتا ہے کہ یہ نعمت کانٹوں کی بیج بن جاتی ہے۔

آخری پیار

کسی کا پہلا پیار بڑا کوئی خاص بات نہیں، بڑا ہے تو کسی کا آخری پیار بنو، اس لیے بھی یہ مت سوچو کہ تم سے پہلے وہ کسی اور سے پیار کرتا تھا، کوشش یہ کرو کہ تمہارے بعد اسے کسی اور کے

پیار کی ضرورت نہ رہے۔

فرزانہ شوکت۔ کراچی

پیار

پیار وہ ہے جب ماں سر جوئے۔
پیار وہ ہے کہ ابو ہر غلطی پر نہیں اب نہ کرنا۔
پیار وہ ہے جب بہن کام کرنے کے بعد کہے کہ بس میں (تم ہی تو ہو) نہ تو زونگ جیسا ہے کہ سب کہہ دو۔

ہمارا رشتہ تو اسٹیٹ لائف انشورنس جیسا ہے یعنی

زندگی کے ساتھ بھی

زندگی کے بعد بھی

کیا سوچا تھا

کیا ہو گیا

قدیل شازیہ۔ لیہ
دل کے گلداں میں پھول

خلیل جبران:
ہم اپنی خواہشوں کو دل میں اس طرح سجاتے ہیں جیسے گل دان میں پھول کی طرح ہوتی ہے۔ ہم لمحہ لمحہ اس کے حسن سے آنکھوں کو سیراب کرتے ہیں۔

شمن مروت۔ ڈپرہ غازی خان
وصال یار

”محترمہ! میری دلچسپی فقط ایک لڑکی میں ہے۔ فرمائیں آپ کا سبق کس غزل پر ہے؟“
جواب میں رضیہ نے ایک غزل کے پہلے مصرعے پر انگلی رکھ دی لیکن منہ سے کچھ نہ بولی۔
میں نے دیکھا تو غالب کی مشہور غزل تھی۔
”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا“

میں نے کہا:

”یہ تو بڑی لا جواب غزل ہے۔ ذرا پڑھیے تو۔“

”میرا خیال ہے آپ ہی پڑھیے۔ میرے پڑھنے سے اس کی لا جوابی پر کوئی ناگوار اثر نہ پڑے۔“

مجھے محسوس ہوا کہ ولایت کی پڑھی ہوئی رضیہ صلابہ باتونی بھی ہیں اور ذہین بھی۔ اردو پڑھنے میں غالباً ناٹری ہی ہیں۔ میں نے کہا۔ ”میرے پڑھنے سے آپ کا بھلا نہیں ہو گا۔ آپ ہی پڑھیے۔ تلفظ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔“ رضیہ نے پڑھنا شروع کیا اور سچ سچ جیسے پہلی جماعت کا بچہ پڑھتا ہے۔

”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصل“
میں نے ٹوک کر کہا۔ ”یہ وصل نہیں وصال ہے۔ وصل تو سینی کو کہتے ہیں۔“

رضیہ نے ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ہم ذرا سا مسکرائے اور ہمارا اعتماد بحال ہونے لگا۔ رضیہ بولی:

”اچھا وصال سہمی، وصال کے معنی کیا ہوتے ہیں؟“

”وصال کے معنی ہوتے ہیں ملاقات۔ آپ پھر مصرعہ پڑھیں۔“

رضیہ نے دوبارہ مصرعہ پڑھا۔ پہلے سے ذرا بہتر تھا۔ لیکن وصال اور یار کو اضافت کے بغیر الگ الگ پڑھا۔ اس پر ہم نے ٹوکا۔

”یہ وصال، یار نہیں وصال یار ہے۔ درمیان میں اضافت ہے۔“

”اضافت کیا ہوتی ہے؟ کہاں ہوتی ہے؟“

فدا کی شمع

اپنے کاموں میں لگ گئے تھے
تمہیں خبر بھی نہیں ہو سکی کہ
تمہارے لہجے کی سرد مہری
تمہارے رویے کی بے نیازی و بے حس نے
کیسے میرے دل و روح کو بے بار ڈالا
تمہیں محبت ایک مشغلہ اور کھیل لگتی ہے
سو تم نے کھیلایہ کھیل مجھ سے
اور
بدل لیا ہے یہ مشغلہ اب
سو مر گئی ہوں میں جاناں!
تمہاری دنیا سے جاری ہوں
تمہارے رستے سے
ہٹ رہی ہوں
کبھی اب واپس پلٹ کے آنا نہیں ہے ممکن
تمہیں تمہاری محبتوں کے کبھی وعدے
بخش دیئے ہیں۔
وہ اشک جو تم نے مجھ دیئے ہیں
وہ سب بہا کے
وہ معاف کر کے میں جاری ہوں
تمہیں بھی آزاد کر رہی ہوں
خود بھی دنیا سے جاری ہوں
تمہاری دنیا سے جاری ہوں

سباس گل

عید کی خوشیاں صرف ساجن کے سنگ

عید کے لمحات ہیں ساجن
دل میں لاکھ خواہشات ہیں ساجن
ہونٹوں پر زرب لب ہر دم
تیرے نام کی شہبہات ہیں ساجن
یادوں کا سادہ کن من بر سے
پل پل تیرے خیالات ہیں ساجن
ہجر کا سورج آگ بر سائے
دل کے عجب حالات ہیں ساجن
ہر خوشی جیسے روٹھ گئی ہم سے
پریم کے عجب معاملات ہیں ساجن
پائل چوڑی تنگ پائونٹوں
دل کی راکھ مناجات ہیں ساجن
عید کے لمحات ہیں ساجن
دل میں لاکھ خواہشات ہیں ساجن
شہلا گل حرم صالح

میں جاری ہوں

میں جاری ہوں
مجھے اب تم سے کبھی بھی ملنے کی چاہ
نہیں ہے
میرے حوالے سے سارے وعدے
تمہارے دعوے فریب تھے بس
مجھے محبت کی سرد مہری میں جھونک کر تم

اور پھر بولا۔

”میں ہر روز نہیں اپنے برش صاف کرتا ہوں۔“
خرم علی۔ کوئٹہ

کیا ملا محبت سے

کیا ملا محبت سے
خواب کی مسافت سے
وصل کی تمنائت سے
روز و شب ریاضت سے
کیا ملا محبت سے؟
ایک ہجر کا صحرا
اک شام یادوں کی
اک تھکا ہوا آنسو.....

شاعرہ: نوشی گیلانی
شمرہ شہباز۔ پشاور

عورت اور عشق

عورت صرف شادی کرتی ہے یا شادی کی
غرض سے عشق کو اپنے اوپر طاری کر لیتی ہے۔
اپنے اوپر کسی مرد کا بھوت سوار کر لیتی ہے۔
عورت سامنے کی چیزوں سے پیار کرتی ہے جب
کہ عشق تو دل کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کا
نام ہے۔ عشق کی کوئی چار دیواری نہیں ہوتی۔
جب کہ عورت چار دیواری ڈھونڈتی ہے۔ عشق کا
افزائش نسل سے بھی کوئی تعلق نہیں، اس میں فنا
ہے۔ جب کہ عورت بقا ڈھونڈتی ہے۔ عورت
ایک چھت ڈھونڈتی ہے جب کہ عشق کی چھت
آسمان ہے۔

محبت مردہ پھولوں کی سمفنی از مظہر الاسلام
غزل خان۔ شورکوٹ

☆.....

”یہ چھوٹا سا زیر نظر آ رہا ہے آپ کو! اس کو
اضافت کہتے ہیں۔“
”تو سیدھا دھالے یار کیوں نہیں لکھ
دیئے؟“

”اس لیے کہ وہ علماء کے نزدیک غلط ہے۔“
یہ ہم نے کسی قدر رعب سے کہا۔
”علماء کا دھال سے کیا تعلق ہے! اچھا جانے
دیں علماء کو مطلب کیا ہوا؟“
”شاعر نے کہا ہے کہ یہ میری قسمت میں ہی
نہ تھا کہ یار سے دھال ہوتا۔“
”قسمت کو تو غالب صاحب درمیان میں
یوں ہی مٹھیت لائے ہیں۔ مطلب یہ کہ بے
چارے کو دھال نصیب ہی نہیں ہوا۔“
”جی ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات تھی۔“
”کیا وجہ؟“

”میں کیا کہہ سکتی ہوں؟“
”کیوں نہیں کہہ سکتے؟ آپ ٹیوٹر ہیں۔“
”شاعر خود خاموش ہے۔“
”تو شاعر نے وجہ نہیں بتائی مگر یہ خوش خبری
سنائی کہ دھال میں قیل ہو گئے۔“
(کرٹل محمد خان کی بزم آرائیاں سے اقتباس)
حفصہ رحمن۔ فیصل آباد

ماڈرن آرٹ

نئے نئے ایک آرٹ کے دلدادہ ناقد نے
بڑے جوش سے کہا۔
”واہ صاحب کیا تصویر ہے۔ کیا رنگوں کی
آئینہ ہے۔ خطوں کی کھیاوت تو بس انتہا ہے۔
صاحب میں تو بس ایسے ہی آرٹ کا قائل ہوں۔“
آرٹسٹ نے بڑی حیرت سے انہیں دیکھا

نظم

میر انجھ میں تو
کچھ بھی نہیں رہا باقی
آنکھیں میری ہیں مگر
ان میں خواب تمہارے ہیں
میری شاعری کے سب
خیال تمہارے ہیں
مجھے جانتے ہیں سب
میرے الفاظ سے مگر
میں سب کو کیسے بتاؤں
یہ محبت کی کہانی ہے
سب ہی بھید
میرے دل کے
یہ شاعری کھول دیتی ہے
تمہارا نام میں اکثر
لکھ کر کاغذ پر
منانا بھول جاتی ہوں
جلانا بھول جاتی ہوں
مگر یہ بھولتی نہیں ہوں میں
ہوں میں شرتی لڑکی
رداجوں میں قید رہتا ہے
کسی سے یہ نہیں ہے کہنا
مجھے تم سے محبت ہے
تمہارا نام پھر مجھ کو
منانا پڑتا ہے
جلانا پڑتا ہے
مگر یہ بھی حقیقت ہے
میں یہ سب دل سے نہیں کرتی

سیدہ عروج فاطمہ

نظم

تیرے بن چنی نہیں تھی
میری شاعری
سوئی، سوئی
ریت کی خوشبو
دے رہی ہے ململی روپ
تپش ہوئی نہیں
اب سورج کی محسوس
جبین دیتی نہیں اب
سورج کی کرنیں
آنکھوں کو بسلی لگتی ہیں
اب سرد راتیں
پوری نہیں ہو پاتی
اب اکثر ہر بائیں
وقت کی کمی بھی
ہوتی ہے اب
شدت سے محسوس

زردہ و صمان

نظم

بہت سے عام لوگوں میں
بہت ہی عام سے ہیں ہم
کہ بالکل شام سے ہیں ہم
کہ جیسے شام ہوتی ہے
بہت چپ چاپ اور خاموش
بہت ہی پرسکون لیکن
کسی پہ مہربان جیسے
مگر بے چین ہوتی ہے
کوئی ہو راز داں جیسے
خفا صبح کی کرنوں سے

رداؤ انجسٹ 214 جولائی 2017ء

کہ جیسے شام ہوتی ہے
یوں بالکل شام سے ہیں ہم
بہت ہی عام سے ہیں ہم
مگر ان عام لوگوں میں
دل حساس رکھتے ہیں
بہت کچھ خاص رکھتے ہیں
اگر چہ عام سے ہیں ہم

فرزانہ شوکت

خوابیدگی

کوئی تم کو چھپ کے دیکھے
تو پلک نہ جھپکے
دیر تک دیکھتا ہی رہے
اور توجہ بے خبر اپنے خند و خال سے
ظریف احسن وہ باخبر
تیرے حسن جمال سے
انگڑائی کے کمال سے
سر تا پا وصال سے
خلوت کے پاتال سے
مر مر میں مثال سے
حسن لازوال سے
نازنین کے حال سے

ظریف احسن

غزل

راتوں کو خواب دیکھتے ہیں
دن کو عذاب دیکھتے ہیں
ہو گئے ہیں ہم بدنام سے
پھر بھی سراب دیکھتے ہیں
کون جنے گا تیرے انتظار میں
پھول پھر زیر آب دیکھتے ہیں

مسکراتا ہے کوئی کوئی جہاں میں
کسی کے گھبراتا آفتاب دیکھتے ہیں
وہ رہتا ہے شہر کے کونے میں جاوید
ہزار اس میں عیب دیکھتے ہیں
محمد اسلم جاوید

غزل

عین وصل کی رات میں جب وہ کچھ کہتا نہیں
میں ہجر کی آہٹ سنتا ہوں اور رو دیتا ہوں
وصل امید جب کرتی ہے بین میرے اندر
میں ہجر باراں سے کچھ نہیں کہتا اور رو دیتا ہوں
جنون عشق کی روٹی رت لگاتی ہے جب گلے
حسین رت کی آس میں بکھرتا ہوں اور رو دیتا ہوں
رت ہو بہار کی، پیار کی، کسی کے انتظار کی
گزرے عشق کو کرتا ہوں یاد اور رو دیتا ہوں
کچھ بھی نہ بچا پاس میرے مٹ گئے احساس میرے
ہجر کی دلیز پر جلاتا ہوں دیا عشق کا اور رو دیتا ہوں
سعدیہ عابد

نظم

وہ حسین راتیں رم، جھم کی برساتیں
تیری پیار بھری بائیں ساون کی ملاقاتیں
میں کیسے بھلا دوں؟
وہ بہاروں کی منزل وہ پیار کا نقش
وہ حسین نغمے اور موسم کا پائین
میں کیسے بھلا دوں؟
وہ تیری شرارتیں اور مجھ کو سنا
اچانک آکر مجھے گد گدانا
میں کیسے بھلا دوں؟
کبھی آنکھوں پر رکھ کر ہاتھ مجھے ڈرانا
اور پھر پیار سے مجھ کو گلے سے لگانا

رداؤ انجسٹ 215 جولائی 2017ء

میں کیسے بھلا دوں؟

ہاں میں کیسے بھلا دوں؟

وہ دسمبر کی سرد راتیں وہ جلتا آتش دان

وہ سادوں کا مہینا اور باغوں کی مہکتی فضا

موسم بہار کی رعنائیاں وہ شام کا منظر

وہ چودھویں کے چاند کا منظر وہ گنگائی فضا میں

میں کیسے بھلا دوں؟

ہاں میں کیسے بھلا دوں؟

مزن گہت غفار

نظم

تمہاری طرح

دل کی گہرائیوں سے

کسی کو بھی

ہم نے تو چاہا نہیں

اور تمہارے علاوہ

کسی کو بھی

کیونکر یہ حق دیں؟

کہ ہم اس کو چاہا کریں اس طرح

جس طرح میری جاں!

ہم نے چاہا تھے

ہاں!

ہمارے علاوہ

جسے چاہو تم

اس کو چاہا کرو

اور اپنی محبت کی کلیاں بھی اس پہ

نچھاور کرو

دم اسی کا بھرو

پر ہمیں جان جاں!

فخر ہے ناز ہے کہ

تمہاری طرح دل کی گہرائیوں سے

کسی کو بھی ہم نے تو چاہا نہیں

ایس امتیاز احمد

ہلال عید

ہلال عید دیکھ کر

میری آنکھوں میں

تمہاری یادوں کے چراغ

جل اٹھتے ہیں

اور میں

تمہیں بہت مس کرتی ہوں

گہت اکرم

غزل

کوئی وعدہ کوئی امید دلاتے جاتے

دل دھڑکنے کا سبب مجھ کو بتاتے جاتے

میری نظروں نے کیا اس کا تعاقب لیکن

اس نے دیکھا نہ پلٹ کر مجھے جاتے جاتے

کچھ تو رہ جاتا مجرم میری محبت کا بھی

چند آنسو ہی وہ آنکھوں سے بہاتے جاتے

میرے جذبات میں بھر جاتے محبت اپنی

میرے ہر خواب کو تعبیر دلاتے جاتے

آ ہی جائے گا کسی روز وہ راہ پر اپنی

کٹ گئی عمر اسی آس میں آتے جاتے

سامنے بیٹھا تھا چپ چاپ وہ پتھر کی طرح

اور ہم تھے کہ اسے شعر سناتے جاتے

میری تربت پر کبھی پھول چڑھائے نہ مگر

یہی کافی تھا کہ مرقد پہ وہ آتے جاتے

ساتی بزم تھا مصروف پلانے میں حکیم

اور ہم تھے کہ تہی جام اٹھاتے جاتے

حکیم خان خان

غزل

وہ ادھر پڑھتا رہا اور میں ادھر لکھتا رہا

کچھ جواب خط نہ آیا میں مگر لکھتا رہا

اک اک حرف قلم کو تول کر لکھتا رہا

مختصر تھا خط مگر میں رات بھر لکھتا رہا

ہر نئی تحریر کا اندازہ رکھنا تھا جدا

سوچ کر انجام کو آغاز پر لکھتا رہا

تا کہ ممکن کر سکے مجھ کو نہ دریا کا سکوت

پھینک کر دریا میں کنکر آب پر لکھتا رہا

اک اسیر جاں کو یاد آشیاں آتی رہی

اور وہ اپنے آپ کو بے یال و پر لکھتا رہا

اشک میرے گر پڑے امتیاز سر فرحاس پر

حال سے اپنے میں ہو کر بے خبر لکھتا رہا

ایس امتیاز احمد

نظم

کبھی میں ایک خوب صورت درخت تھا

پرندے مجھ پر گھونسلے بتاتے تھے

میں بھی خوش تھا کہ اب اکیلا نہیں ہوں

مگر یہ ظالم انسان جو

چیروں کے لیے مجھے ختم کر رہا ہے

اور میرے دوست پرندے بھی مجھے

تہا چھوڑ کر جا رہے ہیں

اے معلوم نہیں

کہ مجھ جیسے بے جان درخت پر بھی

جب آرا چلتا ہے تو کتنی

تکلیف ہوتی ہے

آہ! ظالم نے مجھے قتل کر دیا اور

میرے دوست پرندے بے گھر ہو گئے

فیضان احمد فیضی

غزل

تیری چاہت سنبھال رکھی ہے

جان حزیں میں وبال رکھی ہے

آنکھ کے دائرے میں رہتے ہو

جان تم پر کمال رکھی ہے

دھڑ بجانے کو ہر معزز نے

اپنی پگڑی اچھال رکھی ہے

سردیاں میں بھلا نہیں سکتا

یاد نے تیری شال رکھی ہے

خس دعا کا اثر ہے یہ ابرار

ہر مصیبت جو ٹال رکھی ہے

ڈاکٹر ایم ابرار

نظم

دن ڈھلتا نہیں

دن گزرتا نہیں

کچھ بھی اب نہیں

بھاتا ہے مجھ کو

سب کچھ ادھورا ادھورا

سا

لگتا ہے

نہ بھوک لگتی ہے

نہ ہی پیاس لگتی ہے

نہ آنکھ لگتی ہے

نہ ہی نیند آتی ہے

نہ سکون ملتا ہے

نہ ہی چین ملتا ہے

جاناں، جب تم مجھ سے

رودھ جاتے ہو

افسانہ آفتاب کاوش

☆.....

فوشنگ کے پیرے

شازیہ مصطفیٰ کے نام

ہماری بہت ہی پیاری اور ہر دلچیز رائٹر شازیہ مصطفیٰ کی والدہ کا انتقال پر ملال 13 رمضان کو ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں بلند مقام عطا فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ شازیہ کی والدہ ایک نہایت شفیق اور مہربان خاتون تھیں ان سے جب بھی ملاقات ہوئی ان کے حسن اخلاق نے ہمیشہ سے حد متاثر کیا۔ میرے کانوں میں اب تک ان کی آواز کی نرمی گھل رہی ہے۔ بہت ہی نفیس اور شائستہ خاتون تھیں۔ اللہ تعالیٰ شازیہ کو صبر عطا فرمائے، آمین۔

آپی

دوستوں کے نام

السلام علیکم! میری بہنوں دوستوں اور شاگردوں سب سے پہلے صالحو آپی ہاؤ آر یو؟ نورین آپی تمہی کیسے ہو جناب امید ہے فٹ فٹ ہی ہوں گے۔ افشاں علی عرف فوزیہ علی میری پیاری دوست بہن ہمز کیسی ہو اور آج کل کیا ہو رہا ہے۔ میری طرح صرف کہانیاں لکھ رہی ہو یا پھر پڑھ بھی رہی ہو۔ سچ یا میرے گھر میں رائٹر کی تو کوئی قدر ہی نہیں ہے کام کام اور بس کام ہی کرتے رہو۔ (کیا تمہارے ساتھ

بھی ایسا ہے؟) ویسے یہ تو تھانداق اور تھوڑا سا سچ بھی دل میں بڑی خواہش تھی کہ کبھی تم سے فرصت سے باتیں کر لوں تو بس پھر آج قلم کا سہارا لے لیا ہے۔ شاید تم میرا یہ پڑھ کر مسکرا رہی ہو تو پلیز اس وقت دعا کرو کہ میں جو چاہتی ہوں وہ بس مجھے مل جائے آمین دعا کا اس لیے کہا ہے کہ شاید اوپر والا تمہاری سن لے۔ میں تم سے ڈھیروں باتیں کرنا چاہتی ہوں تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں اگر قسمت مجھے پنجاب سے کراچی دوبارہ لے گئی تو سچ میں تمہارا گھر ضرور دیکھوں گی خدا تمہیں ایک اچھا اور نیک ہمسفر عطا کرے۔ سنو اس دوستی کو کبھی مت توڑنا سچی۔

میری قلم صرف تمہارے نام

میرا اور تمہارا اک رشتہ ہے جاناں

اور یہ رشتہ ہر رشتے سے سچا ہے جاناں

سنو جاناں! اس رشتے کو مت توڑنا

پلیز میرے دل کو مت توڑنا تم وہ لڑکی ہو

جس سے دوستی کرنے کو

دل چاہا ہے تو سنو لڑکی

اس دل کی خطا بڑی سہی پر تم اسے مت توڑنا

اس رشتے کو مت توڑنا افشاں علی

ثناء کنول اللہ دتہ۔ لودھراں

جیون ساتھی کے نام

میرے جیون ساتھی ساتھ نبھائیں گے
ہماری رحوں کو سہرا ب کر جائیں گے
جب بھی خودی ستائے چندہ کشکش نظر آئے

دھیرے سے گداز لبوں پہ

پیار کی مٹھاس جگائیں گے

مانا نا پرست ہوں پر ہوں وفادار

گرفت میں تیری سہا کے

چھاتی پہ تیری سراپا نکائیں گے

میرے نام کے لگا کر بوئے مہندی کے

اس پرنگن نام

کے تیرے چڑھائیں گے

کنگنا بھرے ہاتھ

کانوں کی لونگ لے جائیں گے

پھر احساس محبت دلائیں گے

برکھاتی شام کی پون رت کی بدلیاں

میرے جیون ساتھی جب بھی روٹھ جاؤ

محض اک فریاد کرنا

ہر انداز سے منائیں گے

ہم اپنی محبت کو ہم

Happy Birthday R.G

میکان علی۔ کراچی

اپنی زندگی کے نام

جب بادل خوب صورت ہو

جب ہوا کے سنگ خوشبو آتی ہے

جب رات کے آخری پہر چاندنی

چاند کے سنگ شرمائی ہے

بادلوں کے اوٹ میں چھپ چھپ کر

نکل آتی ہے

ایسے میں

ہم سفر جی تمہاری یاد بہت آتی ہے

نینا خان۔ حیدر آباد

ردا کے قارئین ورائٹرز کے نام

دل و جان سے عزیز صالحو اپنا جی السلام علیکم! آپ توج میں منفرد ہیں۔ میں آپ کی دل سے Respect کرتی ہوں۔ اینڈ آل اسٹاف نورین آپی آپ سب کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عید مبارک ہو۔ تمام سینئر اینڈ جونیئر نے لکھنے والے جو کسی مصروفیت کی وجہ سے اس ماہ نہیں شامل ہو سکے جو خاموش قاری ہیں سب کو عید مبارک ہو۔ امید واثق تعالیٰ ہے کہ دن اور رات امن و سلامتی صحت و تندرستی نئی امنگوں، نئے سپنوں کو سچ کرتے گزریں۔ نئے پھولوں کی کھلاہٹ سا ہر منظر جگمگائے ہمارے گھروں میں۔ (آمین)۔ جو مجھے پڑھتے ہیں پسند کرتے ہیں میں سچ میں دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ان کی شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ سب کو کامیابی عطا کرے۔ خصوصاً (ریما نور) آپی کی میں دل سے شکر گزار ہوں انہوں نے سینئر اعلیٰ لکھنے والوں میں مجھے جیسی ادنیٰ رائٹر کو بھی یاد رکھا۔ (سچ میں ریما باجی)

I Love you and thank you so much.

Allah bleuse u.

ہماری سینئر رائٹر بہت ہیں۔ شازیہ آپی تو ٹاپ آف دی لسٹ ہی رہتی ہے ماشاء اللہ زور قلم اور زیادہ۔ روشنائی عبد القیوم، رحمانہ تخلیق کار ہیں آفتاب جی بہترین تعلقی ہے آپ کو۔ ایک خاموش قاری ہے۔

پیارے ردا کی تمام پیاری رائٹرز اور پیاری قارئین! ہیلو کے نام اگر کسی کے پاس کچھ ہو تو دنیا جلتی ہے اگر کسی کے پاس کچھ نہ ہو تو دنیا ہستی ہے ہمارے پاس آپ کے لیے دعا ہے جس کے لیے دنیا ترستی ہے اللہ تعالیٰ آپ سب کو نام میں، کام میں، گھر میں، عزت میں، صحت میں، زندگی میں، حلال مال میں ہمیشہ خیر و برکت عطا فرمائے اور آپ سب پیاریوں کو ہمیشہ تندرست اور سلامت رکھے، اس عید پر (آمین)۔

ایمیز روڈ، مصباح مکان روڈ - جہلم دوستوں کے نام

السلام علیکم! امید ہے ردا فیملی سے منسلک تمام افراد خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک سب کی عبادات قبول فرمائے اور رمضان کریم کے بابرکت مہینے کے صدقے ہماری تمام خطائیں معاف کر دے، آمین۔ بخار، فلو اور کھانسی کے باعث میری طبیعت کافی نامناسب ہے لیکن جس طریقے سے تمام دوست احباب نے میری خیریت پوچھی اور بے شمار دعاؤں کے تحفے دیئے مجھے یقین واثق ہے کہ میں انشاء اللہ بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گی۔ میں دوستوں کی محبتوں کی ہمیشہ مقروض رہوں گی۔ میری بہترین دوست اماہیہ سردار خان جو کہ ایک بہت اچھی رائٹر بھی ہے۔ میری خاموشیوں کو بھی سن لیتی ہے۔ میں کب ادا اس ہوتی ہوں اسے معلوم ہو جاتا ہے۔ رائٹر عشنا کوثر سردار کی بھی جتنی تعریف کی کم ہے۔ بے پناہ مقبولیت کے باوجود ان کی طبیعت

میں عاجزی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لہذا غزل آبی میری بہنوں جیسی ہیں۔ ان سے بات کر کے دل کو بہت سکون ملتا ہے اور ماشاء اللہ سے اب تک لکھی غزل آپ کی متعدد تحریریں منظر عام پر آچکی ہیں۔ میری دوست آیت آصف کو جب سے ڈاکٹروں نے جواب دیا ہے تب سے میں اس کے لیے بے حد فکرمند ہوں۔ پینائٹس سی اور آخری اسٹج! اس خبر نے مجھے بہت حساس کر دیا ہے۔ آپ سب پڑھنے والوں سے دعاؤں کی درخواست ہے۔ صبا جلال بھی بہت خوب لکھتی ہے اور مجھے اچھا لگتا ہے کہ جب وہ ہر روز صبح صبح بخیر کا پیارا سا مسیج بھیجتی ہے۔ اب ذکر کروں گی اس معزز ہستی کا جس نے مجھے شاعری پیش کروانے کا مشورہ دیا تھا اور وہ پیارا سا نام ہے رائٹر زہت جبین ضیاء آبی۔ ان کی لکھائی بہت خوب صورت ہے اور زہت آبی کا حسین سا آٹو گراف میرے پاس موجود ہے۔ سباس گل آبی کے قلم میں جو جادو ہے وہی جادو ان کے اخلاق میں بھی ہے جو ایک بار ان سے بات کر لے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ اب میں مزید جو خاص نام لکھنے جا رہی ہوں وہ سب بھی بہت خاص ہیں اور مجھے آخری سانس تک یاد رہیں گے۔ نادیہ احمد، سارہ خان، سحر فاطمہ، ریمہ نور رضوان، شاعرہ کنول خان، جیاز میری، صدف آصف، آمنہ حسن، مایہن خان، دانیہ آفرین امتیاز، سعدیہ عابد، ناہید اختر بلوچ، کشف بلوچ، انم عباس، بشری ایوب خان، صائمہ قریشی، جہانہ آفتاب، طیبہ عنصر، منہا آرائیں، ماہ نور شاہ اور ان کے علاوہ بھی بہت سے نام ہیں اگر کوئی نام رہ گیا تو

معذرت کیونکہ پیغام کافی طویل ہو رہا ہے۔ سیدہ عروج فاطمہ۔ ملتان

ردا کے رائٹرز کے نام

عید کے اس پر مسرت موقع پر میری جانب سے ردا کی تمام رائٹرز و قارئین کو عید کی خوشیوں بھری ساعتیں مبارک ہوں اور میری دعا ہے کہ یہ عید سب کے لیے بہت سی خوشیاں لے کر آئے، آمین۔

حناعلی۔ ملتان

قمر و ش اور شازیہ مصطفیٰ کے نام

قمر و ش آبی اور شازیہ آبی آپ دونوں میری فیورٹ رائٹرز ہیں۔ آپ کے سلسلے وار تمام ناولز میں نے پڑھ رکھے ہیں اور بہت سے کرداروں سے مجھے دلی وابستگی اور محبت ہے۔ آپ دونوں بہت خوب صورت لکھتی ہیں میری جانب سے عید مبارک ہو۔

دھنک ناز۔ کراچی

رائٹرز و قارئین کے نام

تمام ردا رائٹرز و قارئین کو میرا پیارا بھرا سلام الفت اور عید کی ڈھیروں مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ یہ عید آپ سب کے لیے بہت سی خوشیاں اور برکتیں لائی ہو اور آپ سب سدا ہستی مسکراتی اور خوش رہیں، آمین۔

نور بانو۔ کوئٹہ

گھر والوں کے نام

امی، ابو اور اریہ علی کو میری جانب سے عمر کے سعادت حاصل کرنے کی بہت بہت مبارک باد۔ اللہ سے دعا ہے کہ جلد ہی آپ

لوگ حج پر بھی جائیں، آمین۔ میں نے آپ سب کو بہت مس کیا اور ریان بھی نانو، نانو کرتا رہا ہر وقت۔ انشاء اللہ عید کے بعد میں چکر لگاؤں گی۔ آپ سب کو عید کی بھی بے حد مبارک باد۔ اللہ پاک میرے میکے کی خوشیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے، آمین۔

فریحہ شہروز۔ ملتان

ردا کے دوستوں کے نام

میں ہمیشہ ردا کے پیغام کے سلسلے کو بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھتی ہوں۔ بہت دل چاہتا ہے آپ سے دل کی باتیں کرنے اور ملنے کا۔ سب رائٹرز اور قارئین نے جس طرح ردا کو سجا یا سنوارا ہے یہ ایک بہت ہی قابل تحسین بات ہے مگر اس میں سب سے اہم شخصیت صالحہ آبی کی ہے جنہوں نے ہم سب کو یہ خوب صورت پلیٹ فارم دیا۔ جہاں ہم سب اپنی اپنی بولیاں بولیں۔ (ہالیا)۔ خیر جی ہنڈل آف ٹھیکس۔ افشاں علی، یکتی آراء، فریدہ فرید، رابعہ افضال، ریمہ نور، فرح ناز، ثناء کنول کے آپ سب لوگ نہ صرف مجھے یاد رکھتی ہیں بلکہ میری آراء کو اہم بھی جانتی ہیں ورنہ مجھ ناچیز میں کچھ بھی خاص نہیں یہ سب آپ لوگوں کی محبت اور خلوص ہے۔ آپ سب خود اتنی پیاری ہیں کہ میرے دل سے بے ساختہ آپ سب کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ خوش رہیے اور سدا مسکراتی رہیے۔

عانیہ نیازی۔ ربوہ

☆.....



شای کلڑے رنگین سویوں کے ساتھ

اجزاء
رنگین سویاں : ڈیڑھ کپ
دودھ : ایک لیٹر
چینی : آدھا کپ
بادام، پستہ (کترے) : حسب ضرورت
ہوئے)

ڈبل روٹی کے سلائس : آٹھ عدد
تیل یا کھی : تیلنے کے لیے
چینی : آدھا کپ
پانی : آدھا کپ

ترکیب: دودھ کو ابال لیں اور چینی اور سویاں ڈال کر پکائیں۔ سویاں نرم ہو جائیں تو چولہا بند کر دیں اور ڈش میں نکال لیں۔ ڈبل روٹی کو حسب پسند حسیب میں کاٹ کر تیل لیں۔ چینی میں پانی ڈال کر پکائیں کہ چینی کھل جائے۔ اب تیلے ہوئے سلائس سیرے میں ڈال رک نکال کر سویوں پر رکھیں۔ سلائس پر کھویا، بادام، پستہ رکھ کر پیش کریں۔

سویوں کا زعفرانی زردہ

اجزاء
سویاں : ایک پیکٹ
کھی : آدھا کپ
الابچی (کھلی ہوئی) : چھ عدد
چینی : ایک کپ

دودھ : ایک کلو
(پکا کر گاڑھا کر لیں)
کھویا : ایک پاؤ
زعفران : ایک چائے کا چمچ
زعفرانی پسنس : آدھا چائے کا چمچ
زعفرانی رنگ : ایک چٹلی

ترکیب: ایک کڑا ہی میں کھی گرم کریں۔ الابچی ڈالیں پھر سویوں کو ڈال کر ہلکی آگ پر بھونیں۔ اب چینی، زعفران، زعفرانی رنگ، دودھ ڈال کر مکس کریں اور پانچ منٹ پکا میں۔ اب کھویا مکس کر دیں اور دم پر رکھ دیں۔ سویاں الگ الگ ہو جائیں تو زعفرانی پسنس، ناریل، کشمش مکس کر دیں اور ڈش میں نکال لیں۔ کھوئے، پستہ، بادام، ناریل، کشمش سے سجاوٹ کر دیں۔

کشر ڈفڈ کریم پسنس

اجزاء:
ہف پیسٹری کا آٹا : ایک پاؤ
کشر ڈیفیٹر پاؤڈر : آدھی پیالی
تازہ دودھ : آدھا کلو + ایک پیالی
چینی : آدھی پیالی
تازہ کریم : ایک پیالی
بادام، پستہ (باریک) : آدھی پیالی
کٹے ہوئے)

ترکیب: آٹے کو بلیں اور اسے کون کے سانچے پر پٹیشن۔ اس عمل کو دہراتے ہوئے 6 کونیں تیار کریں۔ انہیں بیکنگ ٹرے میں رکھیں اور پہلے سے گرم اودن میں 180 سینٹی گریڈ پر 15 منٹ پکا کر نکال لیں۔ تھوڑا ٹھنڈا ہو جائے تو کون کو سانچے سے علیحدہ کر لیں۔ ایک پیالی دودھ میں کشر ڈیٹ پاؤڈر کھولیں۔ باقی دودھ دہتی میں ڈال کر ابالیں، اس میں چینی شامل کریں، چینی حل ہو جائے تو چمچ چلاتے ہوئے تھوڑا تھوڑا کشر ڈیٹ پیسٹ ملا میں، آمیزہ گاڑھا ہونے لگے تو کریم ملا کر پھینٹیں، پھر ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ کشر ڈیٹ کے آمیزے کو چمچے کی مدد سے کونوں میں بھریں اور بادام اور پستہ چھڑک کر پیش کریں۔

دودھ سویاں

اجزاء
سویا : ایک کلو کا پیکٹ
دودھ : دو کلو
چینی : حسب ذائقہ
کھی : آدھا پاؤ
سبز الابچی کے دانے : چائے کا ایک چمچ
بادام : دس بارہ عدد
کھویا : ایک پاؤ

ترکیب: دودھ کو ابالیں، کھویا بھون لیں، چینی کا قوام تیار کر لیں۔ کھی میں الابچی ڈال کر کڑکڑائیں اور اس میں سویاں ڈال کر سرخ کر لیں، پھر اس میں چینی کا قوام ڈالیں، ساتھ ساتھ دودھ اور کھویا بھی ڈال دیں۔ دودھ خشک ہو جائے تو بادام کاٹ کر ڈال دیں۔ گرم گرم نوش فرمائیں۔

بیف دم بریانی

اجزاء
بیف : ایک کلو
چکن : ایک کلو
کھو (درمیانے کٹڑے کاٹ لیں)

چاول (بھگولیں) : تین پاؤ
آئل : حسب ضرورت
نمک : حسب ذائقہ
میرینیشن کے لیے :
دہی : ایک پاؤ
خشخاش : ایک کھانے کا چمچ
لیموں کارس : ایک کھانے کا چمچ
نمک : ایک کھانے کا چمچ
ہرا دھنیا (چوڑی) : ایک کھانے کا چمچ
پودینہ (چوڑی) : ایک کھانے کا چمچ
کچا پیتا پیسٹ : دو کھانے کے چمچ
سرخ مرچ پاؤڈر : دو کھانے کے چمچ
سفید مرچ پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ
ادرک پس پیسٹ : دو چائے کے چمچ
جائفل : پون چائے کا چمچ
آئل : حسب ضرورت

ہری مرچ (کٹی ہوئی) : چار عدد
پیاز (فرائیزڈ) : ایک عدد

ترکیب: میرینیشن کے تمام اجزاء بیف پر لگا کر کم از کم 6 گھنٹے تک میرینٹ کریں۔ پھر پانی ڈال کر ہلکی آگ پر گلا لیں۔ چاولوں کو اچھے ہوئے پانی میں نمک اور 1 کھانے کا چمچ آئل شامل کر کے تھوڑا کھل جانے تک ابالیں پھر چھان کر الگ کر لیں۔ ایک بڑی دہتی میں آئل لگا کر گوشت پھیلائیں اور اوپر ابلے ہوئے چاول ڈال کر ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ اور فرائیزڈ پیاز چھڑک کر 10 منٹ کے لیے ہلکی آگ پر پکھنے دیں۔ تیار ہونے پر گرم گرم سرور کریں۔

کرہی چکن

اجزاء
چکن : ایک کلو
کھو (درمیانے کٹڑے کاٹ لیں)

سنگینا

ہے جب موسم تبدیل ہوتا ہے تو ایسے میں ہاتھوں اور ناخنوں کو معمول سے زیادہ نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔ موسم سردی کا ہو یا گرمی کا دوسروں کی نظر آپ کے ہاتھوں اور ناخنوں پر ضرور پڑتی ہے۔ ہاتھوں اور بیروں کی خوب صورتی کو بڑھانے کے لیے ہاتھوں کو دھونے سے پہلے ہمیشہ گولڈ کریم یا ماسچرا کر استعمال کریں۔ ہتھ میں دو بار ہاتھوں پر گیموں کا رس ملیں۔ دس منٹ سادہ پانی سے ہاتھ دھوئیں اور ہینڈ لوشن لگائیں اس سے ہاتھوں کی جلد صاف اور ملائم ہو جاتی ہے۔ جب بھی آپ کو فرصت کے اوقات ملیں اپنی انگلیوں کو اس طرح حرکت دیں جیسے آپ ٹائپ کر رہی ہیں یہ ورزش ہاتھوں کی لچک برقرار رکھنے کے لیے بہترین ہے۔

بالوں کو خشکی سے بچائیں

بال خشک ہوں تو نہ صرف روکھے پھیکے اور بے جان لگتے ہیں بلکہ کمزور ہو کر گرتا اور ٹوٹنا بھی شروع ہو جاتے ہیں۔ سر کی جلد میں ایسے گینڈے ہوتے ہیں جو جلد اور بالوں کو قدرتی نمی فراہم کرتے ہیں جس سے بال چمکدار اور صحت مندرہتے ہیں اگر کسی وجہ سے یہ گینڈے ٹھیک کام کرنا چھوڑ دیں تو خشکی پیدا ہونے لگتی ہے۔ سرد موسم میں عام طور پر خشکی کی شکایت زیادہ ہو جاتی ہے جس کی بہت سی وجوہات ہیں تاہم تھوڑی محنت اور احتیاط سے بالوں کو خشکی سے بچایا جاسکتا ہے۔ زیادہ گرم پانی سے سر دھونا خشکی کی ایک بڑی وجہ گینڈے ٹھیک کام کرنا چھوڑ دیں تو خشکی پیدا ہونے لگتی

ہلدی اور لیموں سے جلد کی حفاظت
آج کل خواتین ہلدی اور لیموں کے مساج سے اپنی جلد کو بہترین غذا نیت مہیا کرتی ہیں جس سے ان کی جلد چمک دار اور نرم و ملائم ہو جاتی ہے۔ ایسی جلد ہر قسم کے دانوں سے محفوظ رہتی ہے۔ ہلدی سے چہرے پر مساج کرنے سے چہرے کا رواں ختم ہو جاتا ہے اور تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑتی اس کے علاوہ رنگت الگ نکھر آتی ہے۔ جلد سے بالوں کا خاتمہ کرنے کے لیے ویس بھی چینی اور لیموں کو ایک خاص مقدار میں کس کر کے تیار کی جاتی ہے۔ مین کا بھوسا اور آٹا بھی جلد کی کلیننگ میں بے حد کارآمد ثابت ہو رہے ہیں۔ ان قدرتی اشیا کو استعمال کرنے سے جلد کی کم عمری اور صحت و کشش میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب کہ صابن اور دیگر مصنوعی اشیاء کی پروڈکٹس مارکیٹ میں ملتی ہیں اور انہیں گھر پر بھی مختلف طریقوں سے تیار کیا جاسکتا ہے۔ شہد کے مساج سے چہرے کی رنگت ایسی نکھرتی ہے کہ آپ کو بیوی پارلر جانے کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔

ہاتھوں اور پیروں کی حفاظت

خوب صورت ہاتھ اور پاؤں آپ کی شخصیت کو پرکشش بناتے ہیں۔ چہرے کی خوب صورتی کے ساتھ ساتھ ہاتھ پاؤں کی خوب صورتی بھی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہاتھوں کی جلد بہت حساس ہوتی

ہاتھوں اور پیروں کی حفاظت

پیاز (تلی ہوئی) : دو کھانے کے چمچے
خشخاش، بجھے ہوئے پنے : دو دو چائے کے چمچے
پسی ہوئی لال مرچ نمک : ایک، ایک چائے کا چمچ
چاول (الے ہوئے) : آدھا کلو
مصالحے کے اجزاء :
پسا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچ
پسی ہوئی لال مرچ، سفید زیرہ : ڈیڑھ ڈیڑھ چائے کا چمچ
دہی، پیاز (تلی ہوئی) : ایک، ایک پیالی
ناریل کا دودھ، ہر ادھیا : دو کھانے کے چمچے
جاوتری، جانتھیل، چھوٹی : پون پون چائے کا چمچ
الاچھی (پسی ہوئی)

زردے کا رنگ : ایک چمکی
ہری مرچیں (بلدیک کی ہوئی) : چار عدد
نمک : ایک چائے کا چمچ
تیل : آدھی پیالی

ترکیب : چوپر میں قیمہ، چکی اور تلی ہوئی پیاز، لہسن اور ک، گرم مصالحہ، زیرہ، خشخاش، پنے، لال مرچ اور نمک ملا کر کچان کر لیں۔ سلس آئیزے کے چھوٹے چھوٹے کباب بنالیں۔ دپچی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز، لہسن اور ک اور تھوڑا سا پانی ملا کر بھونیں۔ سس چمچ چلاتے ہوئے لال مرچ، دہی، جانتھیل، جاوتری، الاچھی، پیاز، دھنیا، ناریل کا دودھ اور نمک ملائیں۔ ابال آتے لگے کباب تہہ کی طرح سے رکھ دیں۔ ایک دپچی میں پون پیالی پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا مصالحہ، ہر ادھیا، ہری مرچیں، پانی چاول، زردے کا رنگ اور کیوڑے کی تہہ لگائیں اور دم پر رکھ دیں۔ اسے احتیاط سے ڈش میں نکالیں اور گرم گرم پیش کریں۔

پانی، پون پیالی تیل، آدھا کلو چاول، کباب کا

انڈے : دو عدد (نمک مرچ ملا کر پھینٹ لیں)
میدہ : ایک کپ
نمک : حسب ذائقہ
پیپر کا : ایک چائے کا چمچ
خشک ساج : آدھا چائے کا چمچ
سرخ مرچ کٹی ہوئی : آدھا چائے کا چمچ
لہسن، اور ک پیسٹ : ایک چائے کا چمچ
آئل : فرائی کے لیے
سرکہ : دو کھانے کے چمچ
ہلدی پاؤڈر : ایک چائے کا چمچ

ترکیب : چکن کو دھو کر ایک پیالے میں ڈالیں اس میں نمک، سرخ مرچ، لہسن، اور ک پیسٹ، سرکہ، ہلدی پاؤڈر ڈال کر خوب اچھی طرح کس کر کے دس ہندوہ منٹ تک ایک طرف رکھ دیں۔ اس کے بعد گوشت کو چاول چھانے والی چھنی میں ڈال کر مین پچیس منٹ کے لیے رکھ دیں تاکہ گوشت کا سارا پانی نکل جائے۔ ایک پلاسٹک بیگ میں سیاہ مرچ پاؤڈر، پیپر کا، خشک ساج ڈال کر کس کریں۔ گوشت کے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے پہلے سے گرم آئل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کریں اور گولڈ براؤن ہونے پر نکال کر کچن پیپر پر رکھ کر اضافی تیل جذب کر لیں اسی طرح ایک ایک کر کے گوشت کے تمام ٹکڑوں کو کوٹ کرتے ہوئے ڈیپ فرائی کر لیں۔

کباب بریانی

اجزاء :
گائے کا قیمہ : آدھا کلو
پسا ہوا گرم مصالحہ سفید : ایک، ایک چائے کا چمچ
زیرہ :
پسا ہوا لہسن اور ک : ایک کھانے کا چمچ
پیاز (پسی ہوئی) : ایک عدد
اجزاء :
آدھا کلو

نہ کرنا، زائد الیعاد کا سٹیکس کا استعمال اور مناسب حفاظت نہ کرنا شامل ہے۔ آنکھوں کی حفاظت کے لیے وٹامن اے، بی اور سی کا استعمال بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ دودھ، مکھن، مچھلی، انڈے کی زردی، ماجر، نمٹا، آم اور پیتا بھی آنکھوں کے لیے بے حد مفید ہے۔ خواتین اپنی آنکھوں کی دیکھ بھال کس طرح کرتی ہیں اس کا اندازہ ارد گرد کی جلد آنکھوں کی چمک و خوب صورتی اور عمومی صحت سے ہو جاتا ہے اگر آپ اپنی آنکھوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں یعنی انہیں نہ صرف دھوئیں بلکہ گرد و غبار سے بھی بچا کر رکھیں تاکہ آنکھوں کی چمک اور خوب صورتی برقرار رہے۔ آنکھوں کے ارد گرد کی جلد پورے چہرے کی جلد سے زیادہ پتلی اور نازک ہوتی ہے اور اس میں آئل گلینڈ پھیلے ہوتے ہیں ان کی صحت کے لیے اچھی کریم استعمال کی جاسکتی ہے جس کے استعمال سے اس حصے کی جھریاں خاصی حد تک ختم ہو جاتی ہیں۔

جھانپناں ختم کرنے کا گھریلو نسخہ
سیپوں کا سفوف ایک چائے کا چمچ، عرق گلاب ایک چائے کا چمچ، لیموں کا رس آدھا چائے کا چمچ، ہلدی پاؤڈر آدھا چائے کا چمچ۔ سیپوں کو گرم پانی سے دھو کر صاف کر لیں۔ پھر انہیں گرائنڈر میں ڈال کر اچھی طرح پیس کر سفوف بنالیں۔

طریقہ استعمال: تمام اشیاء کو اچھی طرح ملا کر آمیزہ تیار کر لیں۔ رات کو سوتے وقت اسے اپنے چہرے پر لگائیں اور صبح اٹھ کر اچھی طرح دھو لیں اگر دن میں استعمال کرنا چاہیں تو کر لیں۔ ہر دفعہ دس منٹ کے لیے لگائیں۔ یہ نسخہ نہ صرف جھانپناؤں کے لیے ہے بلکہ اس سے داغ دھبے بھی دور ہو جائیں گے۔ ☆

ہے، کوشش کریں کہ نیم گرم پانی سے نہ ہائیں، زیادہ گرم پانی بالوں کے لیے مناسب نہیں۔ سردیوں میں کم پانی کا استعمال اور پسینہ نہ آتا بھی بالوں میں خشکی کی بڑی وجہ ہے۔ اس مسئلے پر بھی قابو پانا چاہیے اس کے علاوہ ہفتے میں دو بار کسی اچھے آئل کے ساتھ سر کا مساج ضرور کریں۔ شیمپو ہفتے میں صرف دو بار استعمال کریں اور شیمپو کرنے کے بعد کٹھن ضرور لگائیں۔ سرسوں کا تیل، وہی اور انڈے بالوں کے لیے مفید ہے۔ ایک برتن میں دو چمچ سرسوں کا تیل، تین چمچ وہی اور ایک انڈے کی زردی اچھی طرح کس کر لیں اور اس آمیزے کو بالوں کی جڑوں میں لگائیں، گھنٹے بعد سر دھو لیں۔ ہر ہفتے میں ایک بار ایسا کریں تو ایک ماہ کے بعد خشکی سے مکمل نجات مل جائے گی۔ اس کے علاوہ بالوں میں کسی کریم بھی انہیں خشکی سے محفوظ رکھتا ہے۔ بالوں میں کسی کرنے سے جلد میں دوران خون بڑھ جاتا ہے جس سے چکنائی پیدا کرنے والے گلینڈز بھی حرکت میں آ جاتے ہیں اور یوں بالوں تک مناسب مقدار میں چکنائی پہنچتی رہتی ہے۔ کسی کریم کے لیے موٹے دندانون والی کسی استعمال کرنی چاہیے اور اسے سر میں کچھ دیر کے لیے تیز تیز رگڑنے کی بجائے پندرہ منٹ تک ہلکے ہاتھ سے کرنا چاہیے، روزانہ ایسا کرنے سے بال جلد ہی صحت مند لگنے لگیں گے۔

آنکھوں کی صحت اور دلکشی

آنکھوں کی صحت اور دلکشی حسن کو نکھار دیتی ہے۔ آنکھوں کی خوب صورتی کے بارے میں شعراء نے بہت کچھ کہا ہے تاہم تھوڑی سی توجہ سے آنکھوں میں نکھار پیدا کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کو آنکھوں سے متعلق کئی مسائل درپیش ہوتے ہیں جن کی بنیادی وجوہات میں درست طریقے سے میک اپ صاف